اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ

یعنی مجموعۂ مقالات

(۱) اسلامی ہند پر متقدمین و متاخرین علمائے اسلام کی تصنیفات

(۲) فاتحینِ ہند حضرات عثمان و حکم اور مغیرہ بنو ابی العاصی ثقفیؒ

(۳) فاتح ہند حضرت محمد بن قاسم ثقفیؒ (۴) امیرِ ہند عمرو بن محمد بن قاسم ثقفیؒ

(۵) امام ربیع بن صبیح بصری ہندیؒ (۶) امام ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری ہندیؒ (۷) عرب و ہند کے سیاسی و ثقافتی تعلقات (۸) راجہ رُہمی اور ہندوستان کے دوسرے چند راجے۔

از

مولانا قاضی اطہر مُبارکپوری

ایڈیٹر البلاغ، بمبئی

رفیق ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۶

سلسلۂ ندوۃ المصنفین دہلی

(۱۰۵)

اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ

یعنی مجموعۂ مقالات

(۱) اسلامی ہند پر متقدمین و متاخرین علمائے اسلام کی تصنیفات (۲) فاتحینِ ہند حضرات عثمان و حکم اور مغیرہ بنو ابی العاصی ثقفی رض (۳) فاتح ہند حضرت محمد بن قاسم ثقفی رح (۵) امام ربیع بن صبیح بصری ہندی (۶) امام ابو موسیٰ اسرائیل بن موسےٰ رح بصری ہندی (۷) عرب و ہند کے سیاسی و ثقافتی تعلقات (۸) راجہ رہمی اور ہندوستان کے دوسرے چند راجے

از

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

ایڈیٹر البلاغ بمبئی

ناشر

"ندوۃ المصنفین" اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

طبع اول

ایک ہزار

ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ مطابق فروری ۱۹۶۹ء

قیمت مجلد ۱۰/ . . . نو روپے

قیمت غیر مجلد . . . . . سات روپے

مطبوعہ

یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۶

(کتبہ نثار احمد شیر کوٹی واسد رام پوری)

۳۱ جنوری ۱۹۶۹ء

مصادر و مراجع

کتاب	مصنف	مطبع
احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم،	مقدسی بشاری	طبع لیڈن
اخبار الزمان،	مسعودی	؍؍ مصر
اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ،	ابن اثیر	
الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب،	ابن عبد البر	مصر
الاصابہ فی تمییز الصحابہ	ابن حجر	؍؍
الاخبار الطوال	ابوحنیفہ دینوری	؍؍
الاعلاق النفیسہ	ابن رستہ	لیڈن
کتاب الاغانی	ابوالفرج اصفہانی	بیروت
انساب الاشراف	بلاذری	یروشلم و مصر
کتاب الانساب	سمعانی	یورپ و حیدرآباد
کتاب الاموال	ابوعبید بن سلام	مصر
کتاب البلدان	ابن الفقیہ	لیڈن
البدایہ والنہایہ	ابن کثیر	مصر
التاریخ الکبیر	امام بخاری	حیدرآباد
تاریخ یعقوبی		لیڈن و بیروت
تاریخ طبری	ابن جریر طبری	مصر
تاریخ ابن خلدون	ابن خلدون	؍؍
تاریخ خلیفہ بن خیاط	خلیفہ بن خیاط	دمشق
تاریخ اسماء الثقات	ابن شاہین	قلمی
تاریخ الاحساء	محمد بن عبد اللہ الاحسائی	ریاض
تاریخ الاسلام وطبقات المشاہیر	ذہبی	مصر
تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی	مولانا عبد الرحمن مبارکپوری	دہلی
تذکرۃ الحفاظ	ذہبی	حیدرآباد
تدریب الراوی	سیوطی	مصر
تہذیب التہذیب	ابن حجر	حیدرآباد
تقریب التہذیب	؍؍	مصر و ہند
تہذیب الاسماء واللغات		مصر
تجرید اسماء الصحابہ	ذہبی	حیدرآباد
کتاب التنبیہ والاشراف	مسعودی	مصر
الجامع الصحیح بخاری	امام بخاری	مصر و ہند
کتاب الجرح والتعدیل	ابن ابی حاتم رازی	حیدرآباد
جمہرۃ انساب العرب	ابن حزم	مصر
کتاب الجمع بین رجال الصحیحین	مقدسی	حیدرآباد
چچ نامہ	علی بن حامد کوفی اوشی	دہلی
کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ	امام محمد	حیدرآباد
خلاصہ تذہیب الکمال	مزی	مصر

کتاب الذخائر والتحف	قاضی رشید بن زبیر	کویت
رجال السند والهند	قاضی اطہر مبارکپوری	بمبئی
رحلۃ سلیمان التاجر	سلیمان تاجر	قلمی
کتاب الزہد والرقائق	ابن مبارک	ہند
سیرت ابن ہشام	ابن ہشام	مصر
سنن الترمذی	امام ابوعیسیٰ ترمذی	ہند
سنن سعید بن منصور	سعید بن منصور خراسانی	ہند
صفۃ الصفوۃ	ابن جوزی	حیدرآباد
صورۃ الارض	ابن حوقل	لیڈن
ضحی الاسلام	احمد امین	مصر
طبقات کبریٰ ابن سعد	محمد بن سعد واقدی	بیروت
العبر فی خبر من غبر	ذہبی	کویت
عینی شرح البخاری	عینی	مصر
عیون الاخبار	ابن قتیبہ	مصر
کتاب العلل و معرفۃ الرجال	امام احمد بن حنبلؒ	انقرہ
فتوح البلدان	بلاذری	مصر
کتاب الفہرست	ابن ندیم	مصر
الکامل فی التاریخ	ابن اثیر	″
الکامل فی اللغۃ والادب	مبرد	″
کشف الظنون	چلپی	انقرہ
الکفایہ فی علم الروایہ	خطیب بغدادی	حیدرآباد
کتاب الکنیٰ والاسماء	ابوبشیر دولابی	″
قانون الموضوعات	محمد طاہر گجراتی	مصر
لسان المیزان	ابن حجر	حیدرآباد
موطا امام مالک	امام مالک	مصر
مروج الذہب	مسعودی	″
معجم البلدان	یاقوت حموی	″
کتاب المحبّر	محمد بن حبیب بغدادی	حیدرآباد
کتاب المنمّق	″	″
کتاب المعارف	ابن قتیبہ	مصر
مآثر الکرام	آزاد بلگرامی	ہند
المنتظم	ابن جوزی	حیدرآباد
مقدمۂ ابن صلاح		بمبئی
المسالک والممالک	ابن خرداذبہ	لیڈن
مناقب الامام احمد	ابن جوزی	مصر
میزان الاعتدال	ذہبی	″
المحاضرات الاسلامیہ	عبدالرحمٰن	مصر
ہند وعرب کے تعلقات	سید سلیمان	الہ آباد
وفیات الاعیان	ابن خلکان	ایران

فہرست مضامین اسلامی ہند کی عظمت رفتہ

پیشِ لفظ

از حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ، ندوۃ المصنفین دہلی

مولانا ابوالکلام آزاد نے رام گڑھ کے سالانہ کانگریس سیشن ۱۹۴۰ء میں جو تاریخی خطبۂ صدارت دیا تھا اس کا وہ ٹکڑا خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے جس میں موصوف نے اس ملک میں مسلمانوں کی آمد، اس آمد کی نوعیت اور اس کے زبردست اور غیر معمولی اثرات کو ایک خاص اثرانگیز انداز میں بیان فرمایا تھا:۔

"ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہوچکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے، ابھی تاریخ کی صبح نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی، اور پھر ایک کے بعد ایک یہ سلسلہ جاری رہا، اور اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لئے جگہ نکالی۔ انھیں قافلوں میں آخری قافلہ پیروانِ اسلام کا بھی تھا، یہ بھی پچھلے قافلوں کی نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لئے یہاں بس گیا، یہ دنیا کی دو مختلف تہذیبوں کا ملان تھا، یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے دُور رہتے رہے۔ لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم پر مل جانا پڑا، ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پُرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا، ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی، اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیئے۔ ہم نے اُسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی، ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیغام پہونچایا۔ ـــــــ تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گذر چکی ہیں، اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ کرسکتا

ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے، اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اسکے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں، ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک ملی جلی تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ...."

میری رائے میں زیرِ نظر مقالات کا یہ مجموعہ، اور فاضل مؤلف کی پچھلی دو کتابیں "عرب و ہند عہدِ رسالت میں" اور "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" مولانا آزاد کے اس اجمالی بیان کی دل پذیر تشریح و تفصیل کرتی ہیں جن کو پڑھ کر اس ملک میں مسلمانوں کے بابرکت وُرود کے تمام نقوش اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں اور اُن کے شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ بے رحم سیاست اور تعصّب و تنگ نظری کی ان اندھیریوں میں اس رنگ کی محققانہ تالیفات کا مطالعہ نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ ملک کے تمام صاف دل و دماغ رکھنے والے باشندوں کے لئے سرمۂ بصیرت کا کام دیگا، اور اس سے بہت سی غلط فہمیوں کے بادل صاف ہوجائینگے۔

مجھے خوشی ہے کہ قاضی صاحب محترم کی یہ تینوں اہم تاریخی دستاویزیں "ندوۃ المصنفین" سے شائع ہوئیں، امید رکھنی چاہیے کہ موصوف کی تازہ ترین عربی تالیف "العقد الثمین فی فتوح الهند ومن ورد فیها من الصحابة والتابعین" کا اردو ترجمہ بھی اس ادارے سے شائع ہوگا۔

اس طرح تاریخ کے ان گنجہائے گراں مایہ سے ہر طبقے کے لوگ استفادہ کرسکیں گے اور اس کا افادہ عام ہوجائے گا۔

بڑھاپے میں قدرتی طور پر رخشِ عمر کی تیز گامی کا احساس بڑھ جاتا ہے اس لئے خاص طور پر میری خواہش ہے کہ یہ علمی کام پہلی فرصت میں مکمل ہوجائے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی۔ ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۹ جنوری ۱۹۶۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ہ

ہمارا وسیع و عریض اور مشترک ملک ہندوستان جو پہلے سندو ہند کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، عہدِ فاروقی سے باقاعدہ اسلام اور مسلمانوں کا گہوارہ رہا ہے، اور اس زمانہ سے لے کر آج تک مسلمانوں کے اعاظمِ رجال اور اسلامی روایات کا مرکز ہے، مگر افسوس کہ ہندی مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں نے ان کو باقاعدہ مدوّن و مرتب نہیں کیا. خاص طور سے یہاں کی ابتدائی اسلامی تاریخ پردہ ہونیکے برابر کام ہوا۔ دوسری بات یہ کہ گذشتہ صدی میں مغربی استعمار نے یہاں سے اسلامی روایات و آثار کو علمی اور فکری راہ سے ختم کرنے کی پوری کوشش کی تھی کہ ۱۹۴۷ء میں یہ ملک آزاد ہوا اور رہنے اور لکھنے کے لئے جمہوری ملک بنا اس کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کے فتنے ابھر آئے، اور یہاں کے ایک ایک اسلامی اثر و نشان کو ختم کرنے یا مسخ کرنے کا طوفان چل پڑا، اور پوری کوشش جاری ہے کہ مسلمان اپنی قدیم اسلامی روایت و ثقافت سے محروم کر دیئے جائیں، اور ان کے شاندار ماضی سے ان کا کوئی رشتہ باقی نہ رہے۔

ان ناگفتہ بہ حالات میں ضروری ہوا کہ اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے جو نقوش تاریخ کے صفحات پر بکھرے ہوئے پائے جاتے ہیں ان کو ابھارا جائے اور بتایا جائے کہ یہ ملک اسلامی آثار و تواریخ کا گہوارہ ہے، اس سے بے خبری ملی موت ہے، اور یہ کام موجودہ حالات میں اسلام اور مسلمانوں کی اہم خدمت ہے، اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے اسلامی اور دینی خدمت کے اس خاص شعبہ کی خدمت کی توفیق ہمیں دی، چنانچہ دس سال کی مدت میں

اس موضوع پر راقم کی یہ پانچویں کتاب شائع ہو رہی ہے۔ رجال السند والہند اور العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین عربی زبان میں، اور عرب وہند عہدِ رسالت میں، اور ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں "اردو زبان" میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں ان دونوں کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کی طرف سے ہو رہا ہے "العرب والہند فی عہد الرسالت چھپ رہی، اور "دول العرب فی الہند" کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ اور اب یہ پانچویں کتاب "اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ" پیش کرنے کی توفیق مل رہی ہے۔ یہ کتاب اُن آٹھ مقالات کا مجموعہ ہے جن میں سے چھ گذشتہ دس سالوں میں دیگر مضامین کے ساتھ مجلہ "معارف" اعظم گڈھ اور مجلہ "البلاغ" بمبئی وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور دو فاتحِ ہند محمد بن قاسم ثقفی اور عمرو بن محمد بن قاسم ثقفی بالکل نئے ہیں یہ مطبوعہ مضامین بھی نظرِ ثانی اور ترتیب اور ترمیم و اضافہ کے بعد گویا نئے ہو گئے ہیں، اس طرح یہ مجموعۂ مضامین اسلامی ہند پر ایک مستقل کتاب ہو گئی ہے۔

راقم کی یہ کتاب اور دوسری کتابیں پورے اسلامی ہند سے متعلق ہیں جن کی موجودہ حالات میں بڑی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اسی کے ساتھ ہی ملک میں مسلمانوں کی جو بستیاں علم و فضل اور دینی امانت کا صدیوں تک گہوارہ رہ چکی ہیں، ان کی بھی اسلامی تاریخ مرتب کر دینی چاہئے تاکہ سند رہے اور وقت پر اپنی نسل کے کام آئے، ورنہ فرقہ واریت اور تعصب کا منصوبہ یہاں سے ایک ایک اسلامی نشان کو مٹا دینا چاہتا ہے، اور مسلمانوں کو ان کا شاندار ماضی اور ثقافت سے محروم کر کے مسکین و یتیم بنانے کی کوشش میں ہے۔ اس کے دفاع کی ایک کامیاب شکل یہ بھی ہے:

قاضی اطہر مبارک پوری، بمبئی

۲۷ رجب المرجب ۱۳۸۸ھ

۲۰ اکتوبر ۱۹۶۸ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱)

اسلامی ہند پر متقدّمین و متاخرین علمائے اسلام کی تصنیفات

ہندوستان اُن خوش نصیب ملکوں میں سے ہے جس کے گلستانِ قلب و روح پر عہدِ رسالت ہی میں حجازی ہوائیں چلنے لگی تھیں اور خلافتِ راشدہ میں باقاعدہ اسلام اور مسلمانوں کی برکات سے یہ ملک مالامال ہونے لگا تھا حتیٰ کہ اُموی دورِ خلافت میں عالمِ اسلام کا ایک قابلِ قدر اور قانونی حصہ بن گیا، اور دوسری صدی میں جب علمائے اسلام نے اسلامی بلاد و امصار اور مسلم ممالک کی فتوحات و امارات اور رجال کی تاریخ مرتّب کرنی شروع کی تو ہندوستان اور سندھ کو بھی اپنا موضوع بنایا اور یہاں کی اسلامی، اور علمی تاریخ لکھی۔

غزوات و فتوحات پر متقدمین کی عام کتابوں میں ہندوستان کی اسلامی فتوحات کا ذکر

اس سلسلہ میں عام فتوحات و غزوات پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن میں یہاں کے تذکرے بھی آئے اور کچھ خاص خاص بلاد و امصار پر کتابیں تصنیف کی گئیں اور ان کا موضوع کوئی ایک ملک تھا، پہلی قسم کی کتابوں میں بھی ہندوستان کے اسلامی تذکرے بھی آئے مثلاً ابو معشر نجیح بن عبد الرحمٰن سندھی مدنی کی کتاب المغازی، محمد بن عمر واقدی متوفی ۲۰۷ھ کی کتاب فتوح العراق اور کتاب التاریخ ہشام بن محمد بن سائب کلبی کی کتاب البلدان الکبیر، کتاب البلدان الصغیر، اور کتاب الاقالیم، سیف بن عمر اسدی کی کتاب الفتوح الکبیر، ابو مخنف لوط بن یحییٰ ازدی کی کتاب فتوح العراق، خلیفہ بن خیاط کی کتاب التاریخ اور کتاب الطبقات، ابو الحسن احمد بن یحییٰ بلاذری کی کتاب البلدان الکبیر اور کتاب البلدان الصغیر، امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری کی کتاب التاریخ، احمد بن یعقوب بن

جعفر یعقوبی کی تاریخ الیعقوبی وغیرہ ان کتابوں میں عام اسلامی بلاد وامصار کی فتوحات وامارات کے ضمن میں ہندوستان کی فتوحات کا ذکر تھا۔

ہندوستان کی اسلامی فتوحات پر مستقل کتابیں

مخصوص بلاد وامصار کی اسلامی تاریخ کے سلسلے میں بھی اس دور میں اسلامی ہند پر کتابیں لکھی گئیں، مگر آج وہ ناپید ہیں، ہم صرف ان کے نام کتابوں میں پڑھتے ہیں، ان میں سے بعض کتابیں یہ ہیں۔

(۱) محمد بن عمر واقدی ۲۰۷ھ کی کتاب اخبار فتوح بلد السند، ہمارے علم وتحقیق میں خاص ہندوستان کی فتوحات پر یہ پہلی کتاب ہے، اس کا تذکرہ قاضی رشید بن زبیر نے کتاب الذخائر و التحف میں ایک مقام پر کیا ہے اور اس سے عبد اللہ بن سوار عبدی والی سندھ کے حضرت معاویہ رض کی خدمت میں ہندوستانی ہدیہ بھیجنے کا واقعہ نقل کیا ہے[1]۔ ابن ندیم وغیرہ نے واقدی کی اس کتاب کا تذکرہ نہیں کیا ہے، قاضی رشید بن زبیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب پانچویں صدی تک پائی جاتی تھی۔

(۲) ابو الحسن علی بن مدائنی متوفی ۲۲۵ھ نے ہندوستان کی فتوحات وغزوات اور امارات پر مستقل تین کتابیں لکھیں، یہ زبردست مؤرخ اور ماہر انساب عالم تھے، ابن ندیم نے الفہرست میں تقریباً پانچ صفحات میں الگ الگ عنوان کے تحت ان کی تصانیف کی فہرست دی ہے، علی بن مدائنی اپنے دور کے عام مؤرخوں میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے خصوصی عالم وماہر تسلیم کئے جاتے تھے اور اس بارے میں اپنے معاصرین میں ممتاز درجہ کے مالک تھے، ابن ندیم نے تصریح کی ہے:-

قالت العلماء: ابو مخنف بأمر العراق واخبارها وفتوحها يزيد على غيره، والمدائنى بأمر خراسان والهند و	علماء نے کہا ہے کہ ابو مخنف لوط بن یحییٰ عراق کی فتوحات ومعاملات کے علم میں دوسروں سے زیادہ فائق ہے۔ اور مدائنی خراسان، ہندوستان اور فارس کی فتوحات ومعاملات کے علم میں آگے

[1] کتاب الذخائر والتحف ص ۱۶ طبع کویت۔

فارس، والواقدی بالحجاز والسیرة، وقد اشترکوا فی فتوح الشام[1]

ہے اور واقدی حجاز کے غزوات وفتوحات، سیر و مغازی میں زیادہ علم رکھتا ہے، اور شام کی فتوحات کے بارے میں ان سب کا علم برابر ہے۔

ابن ندیم نے ہندوستان پر مدائنی کی ان تین کتابوں کا ذکر کیا ہے (۱) کتاب ثغر الہند (۲) کتاب عمال الہند (۳) اور کتاب فتح مکران[2]۔ ان کتابوں کے ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی کتاب میں ہندوستان کے اسلامی غزوات وفتوحات کا بیان رہا ہوگا۔ دوسری کتاب میں یہاں کے حکمرانوں اور والیوں کے حالات رہے ہونگے اور تیسری کتاب مستقل طور سے مکران کی فتوحات پر رہی ہوگی افسوس کہ اسلامی ہند کے ان قدیم ترین اور صحیح ترین تین دستاویزوں میں سے کوئی ایک بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں رہا بلکہ صرف ان کے نام کتابوں میں رہ گئے ہیں، البتہ بعد کے مورخوں نے اپنی کتابوں میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے سلسلے میں مدائنی کی روایات درج کی ہیں اور ان کے ذریعے سے ان کتابوں کی کچھ نہ کچھ مرویات اب بھی منتشر طور پر مل جاتی ہیں۔

(۳) اس کے بعد پھر تیسری صدی تک ہندوستان پر کسی مستقل تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، البتہ علامہ بلاذریؒ نے ۲۵۵ھ میں فتوح البلدان جیسی اہم کتاب لکھی، اور اس میں فتوح السند کا مستقل عنوان قائم کر کے تیسری صدی کے وسط تک کے حالات درج کئے، اس حصہ میں عہد فاروقی سے لے کر معتصم باللہ تک ہندوستان کے مختصر حالات موجود ہیں، جن میں حضرت محمد بن قاسم کی فتوحات نسبتاً مفصل ہے، ان بارہ تیرہ صفحات کو ہم اسلامی ہندوستان پر مستقل تصنیف سمجھتے ہیں جو فتوح البلدان کے ساتھ آج ہمارے پاس موجود ہے۔

(۴) فتوحات وغزوات کی عام کتابوں میں سے خلیفہ بن خیاط متوفی ۲۴۰ھ کی تاریخ خلیفہ بن خیاط ہماری خوش قسمتی سے گذشتہ سال ۱۳۸۶ھ (۱۹۶۷ء) دمشق میں چھپنی شروع ہوئی ہے اس کی پہلی جلد ہمارے سامنے ہے جو ۱۰۰ھ تک کے واقعات وحوادث پر مشتمل ہے، اس میں پہلی

[1] کتاب الفہرست ص۱۳۷ طبع مصر، [2] کتاب الفہرست ص۱۵۰۔

صدی کے خاتمہ تک عام اسلامی بلاد و امصار کے حالات کی طرح ہندوستان کے اسلامی حالات بھی درج ہیں، سن وار تاریخ پر یہ پہلی کتاب ہے جو نہایت معتبر و مستند ہو اور اس میں ہندوستان کے بارے میں نہایت نادر معلومات ملتی ہیں، اس لئے بلاذری کی فتوح البلدان کی طرح ہم خلیفہ بن خیاط کی تاریخ کو بھی ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ماخذ سمجھتے ہیں۔

(۵) الور (سندھ) کے قاضی و خطیب اسمٰعیل بن علی ثقفی سندھی (موجود ۶۱۳ھ) کے آباء و اجداد میں سے کسی عالم نے ایک کتاب بنام تاریخ السند وغزوات المسلمین علیہما و فتوحاتہم" عربی زبان میں لکھی تھی، شاید کشف الظنون میں تاریخ السند سے مراد یہی کتاب ہو، غالباً یہ کتاب تیسری صدی میں لکھی گئی تھی مگر اس کا بھی صرف نام ہی نام باقی ہے اس کا دوسرا نام منہاج الدین بھی تھا۔

(۶) علی بن حامد بن ابو بکر کوفی اوچی سندھی نے ۶۱۳ھ میں قاضی الور کے جد امجد کی اسی تاریخ السند کے کچھ اجزاء حاصل کر کے ان کا فارسی میں ترجمہ کیا اور مزید اضافہ کر کے فارسی زبان میں ایک کتاب چچ نامہ مرتب کی جو مہاراجگانِ سندھ کے دور سے شروع ہو کر محمد بن قاسمؒ کی فتوحات تک کے واقعات پر مشتمل ہے، چونکہ اس کتاب میں سندھ کے راجہ چچ (صصہ) سے محمد بن قاسمؒ کے محاربات کا تذکرہ غالب ہے اس لئے اس کا نام ہی چچ نامہ ہوا۔ یہ کتاب تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع ہوئی، مگر افسوس کہ پوری کتاب تحریف و تصحیف سے پُر ہے، خاص طور سے مجاہدین و امراء کے ناموں میں بڑا الجھاؤ ہے، اس کے باوجود ہندوستان کی فتوحات و غزوات پر ایک ہندوستانی عالم کی یہ پہلی کتاب ہے، قاضی اسمٰعیل کے جد امجد اور علی بن حامد کوفی اوچی کے علاوہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر اس زمانہ تک کسی نے کتاب مستقل نہیں لکھی تھی اس لئے یہی دونوں مورخ و مصنف ہمارے لئے سب کچھ ہیں، غزنوی اور غوری دور میں یا اس کے بعد چند کتابیں لکھی گئی ہیں جن کا تعلق ہندوستان کے حالات و فتوحات سے بھی ہے مگر دراصل وہ ہندوستان کے موضوع پر نہیں ہیں اور نہ ان میں اسلامی فتوحات کا ذکر ہے مثلاً تاریخ یمینی عتبی، تاریخ سبکتگین زین الاخبار عوفی، جمع الجوامع عوفی، اور طبقاتِ ناصری منہاج سراج، وغیرہ وغیرہ،

ساتویں صدی تک ہندوستان کے ان دو بزرگوں کے علاوہ کسی نے یہاں کی عام اسلامی تاریخ پر کوئی کتاب نہیں لکھی بلکہ آٹھویں اور نویں صدی بھی اس سے خالی نظر آتی ہے البتہ دسویں صدی میں میر معصوم بھکریؒ نے فارسی میں تاریخ سندھ لکھی، اس کے بعد گیارہویں صدی میں محمد طاہر نسیانی نے فارسی میں تاریخ سندھ لکھی، اور ان سب کے آخر میں تحفۃ الکرام کے نام سے سندھ کی ایک اور مفصل تاریخ فارسی ہی میں لکھی گئی جس میں ۱۱۸۱ھ تک کے حالات درج ہیں، اسی زمانہ کے لگ بھگ ارغوان نامہ اور ترخان نامہ کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں یہاں کی فتوحات وغزوات کے کچھ حالات ہیں۔ نیز اس سلسلہ میں محمد قاسم فرشتہ کی تاریخ فرشتہ ایک مستند کتاب ہے جو اگرچہ بعد کے حالات پر مشتمل ہے، پھر بھی اس میں اسلامی ہند کی ابتدائی تاریخ کی بہت سی باتیں بھی درج ہیں۔

ہندوستان کے سیاسی، تمدنی، اخلاقی، معاشی، علمی، فنی حالات پر خاص اور عام کتابیں

ہندوستان کے عالم اسلام کے ایک قابل قدر جز ہونے کی وجہ سے ابتدائی ہی سے مسلم، مورخوں، سیاحوں اور مصنفوں نے یہاں کے حالات پر مستقل کتابیں لکھیں اور ایسی عام کتابوں میں ان کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا جو عام عالم اسلام کے حالات وواقعات سے تعلق رکھتی تھیں مثلاً:-

(۱) رحلۃ سلیمان التاجر موجود ۲۳۷ھ اور (۲) رحلۃ ابوزید سیرافی موجود ۲۶۴ھ یہ دونوں قدیم ترین تاجر وسیاح ہیں جنھوں نے اپنے ان مختصر سفرناموں میں ہندوستان اور چین کے بارے میں پہلی بار نہایت اہم اور نادر معلومات فراہم کی ہیں، خاص طور سے ہندوستان کے راجوں، مہاراجوں کے حالات، عام اخلاق وعادات، اور مذہبی باتیں بیان کی ہیں۔

(۳) مروج الذہب میں علامہ مسعودی نے سندھ، گجرات، چیمور وغیرہ کی سیر وسیاحت کے بعد یہاں کے چشم دید حالات درج کئے ہیں، وہ ۳۰۳ھ میں یہاں موجود تھے، اس کتاب میں یہاں کے راجوں مہاراجوں اور مسلم حکمرانوں کے حالات نسبتۃً تفصیل سے ہیں۔

(۴) اخبار الزمان، یہ بھی علامہ مسعودی کی ایک ضخیم کتاب ہے جس کا ایک ٹکڑا مصر میں چھپ چکا ہے

اس میں بحرِ ہند کے جزائر کے بارے میں خاص طور سے معلومات درج ہیں۔

(۵) عجائب الہند، بزرگ بن شہریار ناخدا رامہرمزی چوتھی صدی میں سیراف، ہندوستان اور چین کے درمیان سمندر کے تجارتی اسفار کیا کرتا تھا، اور جہازرانی میں بڑا ماہر تھا۔ اس نے عجائب الہند کے نام سے ایک نہایت قیمتی کتاب لکھی ہے جس میں ہندوستان کے ساحلی مقامات کی مذہبی، سیاسی تمدنی، اقتصادی، ثقافتی اور مذہبی باتیں درج کی ہیں، یہ کتاب لیڈن میں چھپی ہے، اور اب بغداد سے اسی کا عکسی فوٹو بھی شائع ہو گیا ہے۔

(۶) احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، علامہ مقدسی بشاری نے چوتھی صدی کے تمام عالم اسلام پر احسن التقاسیم کے نام سے ۳۷۵ھ میں ایک نہایت ٹھوس کتاب لکھی جس میں سیر و سیاحت کے بعد پورے عالمِ اسلام کے حالات درج کئے ہیں، اور اقلیم السند کے باب میں ہندوستان کے حالات درج کئے ہیں، یہ کتاب بھی لیڈن میں چھپ چکی ہے۔

(۷) رحلۃ ابی دلف مسعر بن مہلہل ینبوعی بغدادی موجود ۳۳۱ھ، یہ بھی بڑا سیاح گذرا ہے اس نے بغداد سے چین کا سفر کیا اور واپسی پر ہندوستان کے ساحلی مقامات کی سیر و سیاحت کی اور یہاں کے حالات تفصیل سے اپنے سفر نامہ میں درج کئے، اس کے سفر نامہ کا بڑا حصہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں چین کے ذکر میں نقل کیا ہے، اس میں ہندوستان کا تقریباً پورا حصہ آگیا ہے، علامہ ابن ندیم نے الفہرست میں جگہ جگہ چین اور ہندوستان کے حالات میں اس کا حوالہ دیا ہے، یہ مقدسی بشاری کا ہمعصر تھا۔

(۸) کتاب الفہرست، علامہ ابن ندیم نے اپنے زمانہ تک کے اسلامی علوم و فنون کا ایک دائرۃ المعارف کتاب الفہرست کے نام سے مرتب کیا ہے جس میں ہندوستان کے علوم و فنون اور حکماء، اطباء، فلاسفہ وغیرہ کے حالات درج ہیں، خاص طور سے یہاں کے مذاہب کے بارے میں بڑی تفصیلی معلومات اس کتاب میں ہیں۔

(۹) کتاب الہند، علامہ بیرونی متوفی ۴۴۰ھ نے ہندوستان کے عقلیاتی علوم و فنون اور ریاضی و فلکیات پر بڑی جامع اور پُر از معلومات کتاب لکھی جس میں ضمناً یہاں کی بہت سی باتیں آگئی ہیں، یہ کتاب

مدت ہوئی یورپ میں چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ علامہ بیرونی نے قانون مسعودی اور کتاب تحقیق ماللھند میں ہندوستان کے علوم وفنون کا تذکرہ کیا ہے، یہ دونوں کتابیں حیدر آباد میں حال چھپ گئی ہیں۔

(۱۰) علامہ چلپی نے کشف الظنون میں محمد بن یوسف ہروی کی کتاب تاریخ الہند کی نشاندہی کی ہے غالباً یہ چوتھی صدی کی تصنیف ہے، مگر اس کا کہیں پتہ نہیں ہے۔

جغرافیہ کی عام کتابوں میں ہندوستان کا ذکر | ہمارے علم میں اسلامی ہند کے جغرافیہ میں کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، البتہ مسلمان جغرافیہ نویسوں نے یہاں کا جغرافیہ اپنی معلومات کے مطابق بیان کیا ہے جس میں یہاں کے طبعی حالات، آبادیاں، میدان، دریا، پہاڑ، آب وہوا، پیداوار، امصار و بلاد اور قریہ جات کی درمیانی مسافت، غرض کہ سب کچھ بتایا ہے اور ضمنی طور سے عام باشندوں کے عادات و اطوار اور حالات بھی بیان کئے ہیں۔

چنانچہ (۱) کتاب البلدان میں ابن الفقیہ ہمدانی متوفی حدود ۲۹۰ھ نے (۲) کتاب المسالک والممالک میں ابن خرداذبہ متوفی حدود ۳۰۰ھ نے، مسالک الممالک میں اصطخری نے الاعلاق النفیسہ میں ابن رستہ نے، کتاب صورالارض میں ابن حوقل بغدادی نے، تحفۃ الالباب میں ابوحامد غرناطی متوفی ۵۶۵ھ نے، نزہۃ المشتاق میں شریف ادریسی نے، احسن التقاسیم میں مقدسی بشاری نے رحلۃ ابی دلف میں مسعر بن مہلہل ینبوعی موجود ۳۳۱ھ نے یہاں کے جغرافیائی حالات بیان کئے ہیں، نیز معجم البلدان میں علامہ یاقوت حموی بغدادی متوفی ۶۲۶ھ نے اور کتاب الانساب میں علامہ سمعانی متوفی ۵۶۲ھ نے یہاں کے بہت سے بلاد و امصار اور مقامات کا جغرافیہ بیان کر کے وہاں کے علماء و فضلاء اور رجال کے حالات قلمبند کئے ہیں۔

ہندوستان کے علماء و فضلاء کے تذکرے بیرونی علماء کی کتابوں میں | افسوس کہ جس طرح ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں یہاں کے ارباب علم وفضل سے کوتاہی ہوئی اسی طرح یہاں کے علماء، فضلاء، محدثین، فقہاء اور اربابِ علم وفضل کے حالات سے بے رخی برتی گئی اور ایک کتاب

بھی اس موضوع پر نہیں لکھی گئی بلکہ یہ کام بھی عالمِ اسلام کے علماء و مصنفین نے انجام دیا اور اپنی کتابوں میں یہاں کے رجال کے حالات درج کئے، حالانکہ یہ ملک اسلامی تاریخ کی ابتدا ہی سے عالمِ اسلام کا قابل قدر حصہ رہا ہے اور یہاں بڑے بڑے علما، محدثین، فقہا، قضاۃ، ادباء، شعراء، لغویین، اور اہلِ علم وفن رہا کئے ہیں جن کے عالمِ اسلام سے دینی و علمی تعلقات خوش گوار و استوار تھے، یہی وجہ ہے کہ رجال وتذکرہ کی عام کتابوں میں یہاں کے ائمۂ علم وفن کے حالات ملتے ہیں، اگر ان مصنفین کا کرم نہ ہوتا تو آج ہم ہزاروں سال کی اپنی علمی و دینی تاریخ کے بہت سے شاہکاروں سے محروم رہ جاتے اور اپنے یہاں کے علماء و فضلاء کے حالات تو درکنار ان کے نام سے بھی واقف نہیں رہتے۔

ذیل میں ہم ان چند مشہور و معروف کتابوں کے نام درج کرتے ہیں جن میں خصوصیت سے ہندوستان کے علماء و رجال کے حالات پائے جاتے ہیں، اور ان کتابوں کی مدد سے ہم اپنے ملک کی اصلی دینی و علمی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔

(۱) تاریخ بغداد خطیب بغدادی، کتاب الانساب علامہ سمعانی، معجم البلدان علامہ یاقوت حموی، تاریخ دمشق ابن عساکر، تاریخ جرجان سہمی، تاریخ اصفہان ابونعیم اصفہانی، الفہرست ابن ندیم، اخبار الحکماء قفطی، طبقات الامم، ابن صاعد اندلسی، اللباب فی تہذیب الانساب، ابن اثیر جزری، شذرات الذہب، ابن العماد حنبلی) دول الاسلام ذہبیؒ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ سبکی، طبقات الفقہاء الشافعیہ، ابواسحٰق شیرازی، الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیہ قرشیؒ۔

ان کتابوں کے علاوہ جو کتابیں ساتویں صدی تک رجال و تذکرہ میں لکھی گئیں ان میں ہندوستان کے ارباب کمال کے حالات ملتے ہیں، نیز بعد میں اس موضوع پر عالمِ اسلام میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں بھی ہندوستان کے علماء کا ذکر موجود ہے مثلاً، الدرر الکامنۃ ابن حجرؒ، الضوء اللامع سخاویؒ، البدر الطالع شوکانی، خلاصۃ الاثر، فضل المحبی، الکواکب السائرۃ، صاحب المشرع الروی علویؒ

یہ سب کتابیں چھپ چکی ہیں، ان کے علاوہ عقد الجواہر و الدُرَر فی اخبار القرن الحادی عشر، محمد بن ابو بکر علومی صاحب المشرع الروی، الاثمار الجنیۃ فی اسمار الحنفیۃ، ملا علی قاری۔ لطف السمر و قطف الثمر من تراجم اعیان الطبقۃ الاولیٰ من القرن الحادی عشر نجم غزی، معجم المشائخ محمد مرتضیٰ زبیدی بلگرامی، التحفۃ البہیۃ فی طبقات الحنفیہ، عبد اللہ بن حجازی شرقاوی، ان تمام کتابوں کے قلمی نسخے کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ میں محفوظ ہیں اور راقم نے ان سب سے استفادہ کیا ہے، ان میں آخری دَور کے علمائے اسلام اور مشائخ عظام میں سے بہت سے ہندوستانی ارباب علم و فضل کے حالات موجود ہیں، اور بہت سے تذکرے اتنے پُر از معلومات اور مکمل ہیں کہ خود ہندوستانی کے مصنفوں کو ان کی خبر نہیں، جنھوں نے یہاں کے علماء و مشائخ کے حالات میں کتابیں لکھی ہیں، کیونکہ یہاں کے عام ذوق کے مطابق تحقیق و تلاش سے زیادہ اہمیت عام معلومات کو دی گئی۔

متاخرین علمائے ہند کا ذوقِ تذکرہ نویسی اور اس دور کی ایک تلخ حقیقت

اوّلاً تو متقدمین علمائے ہند نے یہاں کے رجال پر کوئی کتاب نہیں لکھی، دوسرے جب متاخرین نے اس کی طرف توجہ کی تو یہاں کے ائمۂ علم و فن سے صرفِ نظر کر کے اپنے دور کے مشائخ اور بزرگوں کی مدح خوانی میں سارا زور خرچ کیا، یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ساتویں صدی تک جو اسلام کا زریں عہد ہے، ایک کتاب بھی ہندوستان کے رجال پر نہیں لکھی گئی جب کہ علماء نے اس دَور میں عالمِ اسلام کے ایک ایک شہر کی تاریخ مرتب کی اور وہاں کے اہلِ علم و فن کے تذکرے لکھے، اور ہر ہر جگہ کے علماء، محدثین، فقہا اور اہلِ فضل و کمال کے حالات قلم بند کئے، مگر محروم القسمت ہندوستان اپنی اسلامی تاریخ اور علمی و دینی رجال کے بارے میں ایسا کوئی سرمایہ جمع نہ کر سکا جس سے معلوم ہو کہ اس وسیع و عریض ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی چلتی پھرتی برکتیں کس تعداد میں تھیں، ممکن ہے، قاضی الور کے جدِ امجد کی تاریخ السند، یا شیخ محمد بن یوسف ہروی کی تاریخ الہند اس کمی کو پورا کرتی رہی ہوں، مگر ہمارے پاس ان کے ناموں کے سوا کچھ نہیں ہے، البتہ چچ نامہ میں محمد بن قاسم

کے ساتھ آنے والے مجاہدوں کے بہت سے نام محرّف و مصحّف ہی سہی ملتے ہیں، ہمیں غیر ہندی مؤرخوں اور مصنّفوں کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں ہندوستانی رجال کے حالات جہاں تک مل سکے، درج کئے، اگر ان کا یہ کرم نہ ہوتا تو ہندوستان کے دینی و علمی رجال کا بڑا سرمایہ مسلمان قوم سے چھن گیا ہوتا، چنانچہ تاریخ و رجال کی تمام اسلامی کتابوں میں ہندوستان کے بہت سے رجال کے تذکرے آج بھی موجود ہیں جن کو ہم جمع کر کے کسی نہ کسی حد تک تلافی مافات کر سکتے ہیں، پھر ہندوستانی مؤرخوں اور مصنّفوں کی غفلت کا یہ سلسلہ ساتویں صدی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ آٹھویں اور نویں صدی بھی اس سے خالی نظر آتی ہے اور یہاں کے رجال کا کوئی جامع تذکرہ کسی نے مرتب نہیں کیا، البتہ دسویں صدی میں اس انداز پر چند کتابیں لکھ کر تلافی مافات کی کوشش کی گئی، پھر بعد میں بھی اس قسم کی کتابیں لکھی گئیں، اس دور کی رجال و تذکرہ کی کتابوں میں حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی کی اخبار الاخیار، شیخ عبد القادر عیدروس گجراتی کی النور السافر، علامہ زین الدین معبری ملیباری کی تحفۃ المجاہدین، محمد قاسم فرشتہ کی تاریخ فرشتہ اور تاریخ خافی خاں وغیرہ مفید اور کارآمد کتابیں ہیں جو ملتی بھی ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ اگرچہ اس دور میں سوانح و تذکرہ پر بہت زیادہ لکھا گیا۔ مگر اس دور کی خصوصیت یہ تھی کہ تاریخ و تذکرہ نویسی کے بجائے منقبت نویسی اور قصیدہ خوانی کا رنگ اس قدر غالب اور عام ہو گیا تھا کہ رجال و تذکرہ کی کتابیں افسانوی رنگ میں ڈوب گئیں، اور جب یہاں کے قدیم رجال سے ہٹ کر بعد کے رجال پر لکھنے کی باری آئی تو ان کو عام طور سے مافوق الفطرت رنگ میں پیش کرنے کا ذوق عام ہو گیا، اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے ائمۂ دین اور ماہر علم و فن کے نام و نشان مٹ گئے۔ اور حضرات مشائخ رحمہم اللہ کے تذکروں سے کتابیں بھر گئیں، جن میں زیادہ تر کشف و کرامت کی باتیں ہوا کرتی تھیں، علامہ غلام علی آزاد بلگرامی متوفی ۱۲۰۰ھ نے مآثر الکرام میں حضرت ملا نظام الدین کے ذکر میں اس المناک حقیقت کا ماتم ان الفاظ میں کیا ہے:-

واصل این است کہ مردم ہند در حفظِ احوالِ مشائخ طریقت قدس اللہ اسرارہم

اہتمامی داشتہ اند، و بہ ضبطِ احوالِ دانش منداں کم پرداختہ، و کتابے مستقل دریں باب از سلف تا خلف استماع نیفتاد، کتاب عین العلم ناطق است کہ مصنفِ او از جلۂ علماء و اتقیائے روزگار بود، بقول اصح ہندی الاصل است، ملا علی قاری رح در شرح عین العلم گوید" ہو من فضلاء الہند و صلحائہم علیٰ ما صرح بہ الشیخ ابن حجر العسقلانی فی شرح مقدمۃ" کسے از مؤرخانِ ہند احوال او را ضبط نہ کرد، باوجود ایں چنیں تصنیف عالی گویا نامش از صفحۂ روزگار محو گردیدہ" لہ

علامہ آزاد بلگرامی ایک عین العلم کے مصنّف کو رو رہے ہیں، اور یہاں حال یہ ہے کہ پورے عالم اسلام کی مسلمہ ہندوستانی شخصیتوں کو یہاں کے اربابِ علم و قلم بھلائے بیٹھے ہیں، اسی اندوہناک صورتِ حال کے باعث امام حسن صغانی لاہوری صاحب مشارق الانوار و العباب الزاخر امام علی متقی جونپوری کی صاحب کنز العمال، امام قطب الدین نہروالی پٹنی مکی، صاحب الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام، امام محمد طاہر پٹنی گجراتی صاحب مجمع بحار الانوار، امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی صاحب حجۃ اللہ البالغہ، امام محمد مرتضیٰ بلگرامی زبیدی صاحب تاج العروس جیسے صدہا ائمۂ علم و فضل اور دینی ہستیوں کے تذکرے اگر ہندوستانی مصنفوں کی کتابوں میں ملتے ہیں تو چند سطروں یا چند صفحات و اوراق سے زیادہ نہیں ہیں۔ جب کہ ان کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے کم تر مرتبہ کے حضرات کے تذکروں سے موٹی موٹی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

اس المیہ کا تدارک اسی المیہ کے پیش نظر مؤرخ ہند علامہ غلام علی آزاد بلگرامی متوفی ۱۲۰۰ھ نے متاخرین کے ذوقِ سوانح نگاری اور طرز تذکرہ نویسی سے ہٹ کر قدماء کا رنگ اختیار کیا، اور عربی میں سبحۃ المرجان فی آثار الہندستان، اور فارسی میں مآثر الکرام جیسی قابل قدر کتابیں تصنیف کیں۔ ان کے بعد بعض دوسرے حضرات نے اس رنگ کو اختیار کیا، اور علماء ہند پر مستقل کتابیں لکھیں چنانچہ مولوی رحمان علی صاحب کی کتاب" تذکرۂ علمائے ہند" مختصر ہونے کے باوجود

لہ مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۳۳،

اس سلسلہ کی قابلِ قدر کتاب ہے، اور مولانا سید عبدالحی صاحب متوفی ۱۳۴۱ھ نے نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں پہلی صدی سے لے کر اپنے دور تک کے ہندوستانی علماء کے حالات درج کئے۔ اس موضوع پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں یہ کتاب سب سے زیادہ جامع اور مفید تصنیف ہے، مگر ظاہر ہے کہ تحقیق وتلاش کا میدان بہت وسیع ہوتا ہے جس میں ہر عالم ومحقق اپنے مقدور بھر جد وجہد کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ابھی بہت کام باقی ہے، یہ کتاب اپنے موضوع میں سب سے زیادہ جامع ہوتے کے باوجود مکمل جامع نہیں ہے خصوصاً اس میں ساتویں صدی تک کے رجال بہت کم آسکے ہیں اور جو آئے ہیں ان میں ہندی الاصل یا ہندی المولد بہت کم ہیں۔ راقم نے اس سلسلہ میں دو کتابیں لکھی ہیں۔ ایک رجال السند والہند ۱۳۷۸ھ میں چھپ چکی ہے۔ اس میں ہندی الاصل اور ہندی المولد علماء کا تذکرہ ہے، دوسری کتاب "العقد الثمین فی فتوح الهند ومن ورد فیھا من الصحابۃ والتابعین" ہے جو ۱۳۸۷ھ میں چھپ کر شائع ہوئی، اس کتاب میں خلافتِ راشدہ سے لیکر خلافتِ امویہ تک کی ہندوستان کی اسلامی فتوحات کا تذکرہ ہے۔ ساتھ ہی یہاں آنیوالے مجاہدینِ اسلام، ولاۃ وحکام، صحابۂ تابعین، تبع تابعین، محدثین وفقہا، عُبّاد وزُہّاد اور رجالِ علم وفن کے حالات وتراجم ہیں۔ یہ اسلامی ہند پر اپنی نوعیت کے اعتبار سے سب سے پہلی کتاب ہے۔ "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں"، میں بھی میں نے یہاں کی عربی حکومت کے بیان میں اس دور کے علماء وفضلاء کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔ علامہ سید سلیمانؒ ندوی کی کتاب "عرب وہند کے تعلقات" اپنے عام محتویات کے اعتبار سے عرب وہند کے تعلقات پر جامع اور مفید کتاب ہے، ضمناً بہت سے علماء کے حالات بھی آگئے ہیں۔

(۲)

فاتحینِ ہند حضرات عثمان و حکم اور مغیرہ بنو ابی العاصی ثقفی

رضی اللہ عنہم

یوں تو عہدِ رسالت ہی میں اسلام ہندوستان میں اپنا تعارف کسی نہ کسی درجہ میں کرا چکا تھا، اور یہاں کے لوگ فی الجملہ اس سے واقف ہو چکے تھے، مگر اس کا باقاعدہ تعارف عہدِ فاروقی میں ہوا، جب کہ پہلی بار قبیلہ بنو ثقیف کی ایک شاخ بنو مالک کے خانوادۂ آلِ ابی العاصی کے قدم اس ملک میں آئے، اور انھوں نے اپنے دینی جذبہ اور اسلامی حوصلہ کی بنا پر یہاں کے کم از کم تین ساحلی مقامات پر نعرۂ توحید بلند کیا، اور اس سرزمین کو اپنے سجدوں سے مشرف کیا اسکے بعد خلافتِ راشدہ اور خلافتِ امویہ میں یہاں اسلامی فتوحات ہوتی رہیں اور اسلام کا عمل دخل جاری رہا یہاں تک کہ پہلی صدی کے خاتمہ پر اسی قبیلہ کی دوسری شاخ احلاف کے خانوادۂ آلِ ابی عقیل نے باقاعدہ سندھ اور ہندوستان میں اسلام کا جھنڈا نصب کیا، اور یہ ملک عالمِ اسلام کا ایک قابلِ قدر حصہ بن گیا، اس طرح ثقیف کی دونوں شاخوں نے مل کر پہلی صدی میں ہندوستان کو ایمان و یقین کی قدروں سے مالا مال کر دیا۔

جس طرح قبیلۂ قریش میں بنو ہاشم کعبہ کے متولی اور مذہبی امور کے ذمہ دار ہونے کی وجہ سے مذہبی ذہن و مزاج رکھتے تھے، اور بنو امیہ ملکی اور قومی معاملات میں حصہ لینے کی وجہ سے سیاسی بصیرت کے مالک تھے، اسی طرح ثقیف کے آلِ ابی العاصی صنمِ لات کے سادن اور متولی تھے اور مذہبی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے جس سے ان کا مزاج مذہبی تھا، اور آلِ ابی عقیل قومی و قبائلی امور میں حصہ لیتے تھے جسکی وجہ سے ان میں اقتدار اور اثر و رسوخ کا مزاج

کرتا تھا، اسی لئے آلِ ابی العاصی نے عہدِ فاروقی میں خالص دینی اور مذہبی جذبات کی بناپر رضاکارانہ اور فدائیانہ طور سے ہندوستان میں اسلامی جہاد کا دروازہ کھولا اور آلِ ابی عقیل اموی دور میں امارت وحکومت کی شان سے اس ملک میں داخل ہوئے۔

آلِ ابی العاصی میں ایک ایسی بزرگ خاتون تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے وقت موجود تھیں اور بعد میں انھوں نے اس موقعہ پر ظاہر ہونے والے عجائب وغرائب بیان کئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ ہجرت کے وقت اسی خاندان میں تھیں اور بعد میں مکہ آئیں، جب قبیلۂ بنو ثقیف اسلام لایا تو اس خاندان کے ایک نوجوان نے اپنی سلامتیِ طبع اور مذہبی شوق کی وجہ سے چند دنوں میں ہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی زبانی قرآن کی کئی سورتیں یاد کرلیں، اور سب لوگوں سے پہلے اسلام قبول کیا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آلِ ابی العاصی کے اس نوجوان کو قبیلۂ ثقیف کا امیر مقرر فرمایا اور اسلام کے بعد بھی یہ خانوادہ مذہبی اور دینی امور ومعاملات اور تعلیم وتربیت کا گہوارہ رہا، اور آگے چل کر اسی خانوادہ کے فرزندانِ توحید حضرت عثمانؓ بن ابو العاصی، حضرت حکم بن ابو العاصی اور حضرت مغیرہ بن ابو العاصی رضی اللہ عنہم نے سب سے پہلے ہندوستان میں اسلام کا نام بلند کیا، اور یہاں اسلامی فتوحات کا دروازہ کھولا۔ ضرورت ہے کہ ان تینوں بھائیوں سے ہندوستان کے مسلمان واقف ہوں اور اپنے ان اوّلین دینی محسنوں اور بزرگوں کی سیرتوں سے سبق حاصل کریں۔

قبیلۂ بنو ثقیف اور اس کا وطن طائف

ہندوستان کے ثقفی مجاہدوں اور فاتحوں کے ذکر سے پہلے ہم ان کے وطن طائف اور ان کے قبیلۂ ثقیف کے حالات کو ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں جس سے ان کی قبائلی روایات اور وطنی ذہن و مزاج پر روشنی پڑے گی، اور ان کی فطری اولوالعزمی، روایاتی نخوت اور جاہلی عزت و شرافت کا پتہ چلے گا، اور یہ کہ جب ان پر اسلام کا رنگ چھایا تو ان میں کیسا خوش گوار انقلاب آیا۔

مکہ مکرمہ کے مشرق میں بارہ فرسخ پر حجاز کا مشہور شہر طائف، جو جبل غزوان پر ایک وادی کے کنارے آباد ہے یہ قدیم جاہلی آبادی ہے، اسے قدیم زمانہ میں و ج کے نام سے یاد کرتے تھے بلکہ بعد کے بعض شعراء نے بھی اسے وج ہی کے نام سے یاد کیا ہے، جب اس کے گرد حصار اور فصیل بنادی گئی تو اسے طائف کہنے لگے، یہی بلاد ثقیف کہلاتا ہے، جہاں قبیلۂ بنو ثقیف کے علاوہ حمیر اور قریش کے دیگر قبائل بھی آباد تھے، ابتداءً یہ بہت معمولی سی آبادی تھی، اس کے دو ظاہری محلے یا منطقے تھے، ایک کو طائف ثقیف کہتے تھے کیونکہ اس میں بنو ثقیف آباد تھے، اور دوسرے کو وہط کے نام سے یاد کرتے تھے جس میں مختلف قبائل آباد تھے، طائف وسط حجاز کا بہت ہی زرخیز، پرفضا، اور محفوظ مقام تھا جو مضر، قضاعہ، اور یمنی قبائل سے گھرا ہوا تھا۔

بنو ثقیف سے پہلے یہاں قبیلۂ عدوان کی آبادی تھی، اس میں ایک سردار عامر بن ظرب عدوانی گذرا ہے، اس کے زمانہ میں یہاں بنو ثقیف کی آبادی شروع ہوئی، صورت یہ ہوئی کہ قسی بن منبہ

بن بکر بن ہوازن نامی ایک شخص کس مپرسی کی حالت میں یہاں وارد ہوا (یہی قسی آگے چل کر ثقیف کے لقب سے مشہور ہوا) تو عامر بن ظرب عدوانی نے عربی روایت کے مطابق اسے پناہ دی اور اپنی بیٹی زینب سے اس کی شادی کردی جس کے بطن سے قسی کے دو لڑکے عوف اور جشم پیدا ہوئے۔ زینب کے مرنے پر قسی نے اپنے خسر عامر بن ظرب کی بہن سے شادی کرلی جس کے بطن سے دو لڑکے سلامہ اور دارس پیدا ہوئے، یہ عورت قسی سے پہلے صعصعہ بن معاویہ بن بکر ہوازن سے منسوب تھی، جس سے عامر بن صعصعہ پیدا ہوا۔

قسی اپنی پہلی بیوی کے دونوں لڑکوں عوف اور جشم کو لے کر وادی وجّ میں کھیتی باڑی اور باغبانی کرنے لگا، اور تھوڑے ہی دن میں ترقی کرکے بنو عدوان کو حیرت میں ڈال دیا حتی کہ عدوانیوں نے ایک موقعہ پر کہا کہ :-

قاتله الله كيف ثَقَّفَ عامرًا	قسیؔ کس طرح عامر کو ٹھیک کرکے اس مقام و مرتبہ کو پہنچ
حتّٰى بلغ ما بلغ وكيف ثقّف	گیا، اور کس طرح اس نے ان درختوں اور کھیتوں کو ٹھیک
هٰذه العيد ان حتى جاء	کرلیا کہ یہ پیداوار ہونے لگی، اسی دن سے اس کا نام ثقیف
منها ماجاء فسُمّي ثقيفا	(یعنی درست اور سیدھا کرنے والا) پڑ گیا۔
من يومئذٍ [1]	

ثقیف اپنی اولاد کے ساتھ کھیتی باڑی اور شان و شوکت میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہا، اور اس کے مقابلہ میں قبیلہ عدوان کمزور ہونے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ بنو ثقیف اور بنو عدوان میں جنگ ہوگئی جس میں بنو ثقیف کو کامیابی حاصل ہوئی اور انھوں نے بنو عدوان کو نکالکر طائف کو بلا شرکتِ غیرے اپنی ملکیت میں لے لیا۔

اس واقعہ کے بعد بنو ثقیف شہر طائف اور اطراف و جوانب کی زمینوں کے مالک بن گئے اور ان کو عزت و ناموری اور امن و امان کی زندگی مل گئی، کھیتی باڑی، باغبانی اور تعمیرات میں

---

[1] معجم البلدان ج ۲ صـ ۱۳ -

ترقی کا موقعہ ہاتھ آیا، انگور اور دوسرے عمدہ عمدہ میووں کے باغات لگائے، اور کنویں کھودے مگر اب بھی بنو عامر بن صعصعہ بنو ثقیف کے لئے ایک خطرہ بن کر طائف میں موجود تھے، اور وہ بھی اپنے طور پر زندگی کی راہوں میں آگے بڑھ رہے تھے۔ بنو ثقیف چاہتے تھے کہ بنو عدوان کی شکست کے بعد بنو عامر کو بھی یہاں سے کسی طرح نکال دیا جائے، چنانچہ انھوں نے بنو عامر سے کہا کہ تم لوگ طائف چھوڑ کر صحرا کی آزاد اور کھلی زندگی اختیار کر لو، ہم طائف کے غلے اور پھل کی پیداوار کا نصف حصہ تم لوگوں کو سال بہ سال ادا کرتے رہیں گے، وہ اس پر راضی ہو کر صحرائی زندگی بسر کرنے لگے اور ہر سال طائف آکر یہاں کی نصف پیداوار لیجاتے تھے۔

اس درمیان میں بنو ثقیف نہایت اطمینان وسکون کے ساتھ اپنے دور کی بہترین تمدنی اور شہری زندگی گذارتے رہے حتی کہ ان کی کثرت وشوکت اور پرامن زندگی پر اطراف وجوانب کے قبائل حسد کرنے لگے، جس سے ان کی خوشحالی اور فارغ البالی خطرہ میں پڑ گئی، جب ان بدوی قبائل نے بنو ثقیف پر حملے شروع کئے تو انھوں نے بنو عامر کو مدد کے لئے پکارا جو بدوی زندگی بسر کرنے لگے تھے اور بدوی حملہ آوروں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکتے تھے، مگر بنو عامر نے کسی قسم کی مدد نہیں کی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو عامر بھی بنو ثقیف سے بدگمان ہو کر بدوی قبائل کے درپردہ ہمنوا تھے، اب بنو ثقیف نے مجبور ہو کر اپنی حفاظت کے لئے وُجّ کے چاروں طرف شہر پناہ بنائی اور مردوں عورتوں نے مل کر اسے قلعہ بند کر لیا، اسی کے بعد سے اس بستی کو طائف کہنے لگے، اس کے بعد جب بنو عامر پیداوار کا نصف حصہ وصول کرنے کے لئے طائف آئے تو بنو ثقیف نے ادائیگی سے انکار کر دیا، اور دونوں قبائل میں جنگ وجدال کی نوبت آئی جس میں بنو ثقیف کو فتح ہوئی اس طرح طائف اور اس کے اطراف وجوانب کا پورا علاقہ بنو ثقیف کی ملکیت میں آگیا اور وہ یہاں کے سیاہ و سپید کے مالک بن گئے، ان کی خوش حالی اور فارغ البالی عرب میں مشہور تھی، متعدد قبائل نے مختلف اوقات میں ان پر حملہ کیا اور طائف پر قبضہ کرنا چاہا، مگر ناکام واپس ہوئے۔ عہدِ اسلام تک طائف کے بنو ثقیف اپنی یہ شاندار اور روایاتی زندگی کے مالک بنے رہے [1]

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو معجم البلدان ج ۶ ص ۱۳۱۲

ثقیف اور قریش کے باہمی تعلقات | مکہ کے قریش اور طائف کے ثقیف اپنی آن بان، عزت و ناموری، دولت و ثروت اور تمدنی و مذہبی برتری میں ایک دوسرے کے ہم پلہ مانے جاتے تھے، اور دونوں قبائل آپس میں حلیف و رفیق تھے، ان میں قدیم زمانہ سے گوناگوں تعلقات تھے، شادی بیاہ، لین دین کھیتی باڑی، باغبانی، زمینداری، تجارتی کاروبار کے ذریعہ قریش اور ثقیف ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے تھے، مشاہیر قریش کی املاک طائف میں تھیں۔ اور قریش کے تجارتی قافلوں کے ساتھ ثقیف کے تجارتی قافلے بھی عراق اور شام آتے جاتے تھے، محمد بن حبیب بغدادی نے کتاب المنمق میں لکھا ہے کہ قریش و ثقیف کے درمیان حلف واتحاد کی ابتدا یوں ہوئی کہ اہل قریش طائف کی سرسبزی و شادابی اور پیداوار میں دلچسپی لینا چاہتے تھے، اور ان کو وادی وج سے بڑی رغبت تھی، انھوں نے اہلِ ثقیف سے کہا کہ ہم تمہیں حرم مکی میں شریک کرتے ہیں۔ تم ہمیں وادی وج میں شریک کر لو، ثقیف نے جواب دیا کہ ہم تم لوگوں کو اس وادی میں کیسے حصہ دار اور شریک بنا سکتے ہیں جہاں ہمارے آباؤ اجداد اترے، انھوں نے اپنے ہاتھوں سے پتھر توڑے، اور اسے کھود کر صاف کیا، اور بغیر کسی دوسرے کی مدد کے اس وادی کو قابلِ کاشت بنایا۔ اور جہاں تک حرم مکی کا تعلق ہے اسے تم اہلِ قریش نے نہیں بنایا ہے بلکہ اس کے معمار اور بانی ابراہیمؑ ہیں۔

یہ جواب سن کر قریش نے انتہائی خفگی کا اظہار کیا اور کہا کہ اچھا نہ تم ہمارے حرم میں داخل ہونا، نہ ہم تمہارے وج میں داخل ہوں گے، اس دھمکی سے ثقیف سہم گئے، اور قریش کے ساتھ وادیِ وج میں حصہ داری اور اشتراک قبول کر لیا۔ [۱]

اس کے بعد قریش اور ثقیف کے تعلقات نہایت خوشگوار و استوار ہو گئے، ہر وقت آمد و رفت ہر بات میں میل جول رہا کرتا تھا، عام طور سے قریش کے کھیت اور باغات طائف میں تھے جن کی دیکھ بھال کے لئے وہ مکہ سے یہاں آیا کرتے تھے، حضرت عباسؓ کا بھی ایک علاقہ طائف میں تھا، جن میں انگور کے باغات تھے، اس کی کشمش ایام حج میں مکہ مکرمہ جاتی تھی اور سقایتِ حاج

[۱] کتاب المنمق صفحہ ۲۸۰۔

میں کام آتی تھی، جب ۸ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوا اور اہلِ قریش حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، تو طائف کے بنو ثقیف جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے۔ اہلِ مکہ کی زمینوں اور باغوں پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھنے لگے تھے، مگر فتح مکہ کے بعد طائف بھی فتح ہو گیا اور ثقیف بھی اسلام لائے اس لئے اہلِ مکہ کی تمام املاک ان کے قبضہ میں رہیں۔ [۱]

اسلام کے بعد قریش بلکہ اہلِ مکہ اور اہلِ طائف کے تعلقات کا سلسلہ اور وسیع ہوتا گیا، اور طائف اہلِ مکہ کے لئے موسم گرما کا تفریحی مقام ہو گیا، مالدار قریشیوں نے طائف میں کھیتی باڑی اور باغات کے علاوہ قصور و محلات تعمیر کئے اور وہیں بود و باش اختیار کر لی، یہ لوگ بنو ثقیف میں یوں گھل مل گئے کہ ان ہی میں شمار ہونے لگے، چنانچہ آج تک قریش کے بہت سے افخاذ و بطون طائف میں آباد ہیں، اور اب تو تقریباً مکہ مکرمہ کے ہر سرمایہ دار کا محل طائف میں ہے جہاں وہ گرمی کے ایام گذارتا ہے۔

لات کی سدانت اور مذہبی سیادت بنو ثقیف عزت و شہرت اور مال و دولت میں قریش کے ہم پلہ تھے ہی، مذہبی اور دینی اعتبار سے بھی وہ جاہلی عقیدہ کے مطابق قریش کے ہم پلہ تھے۔ امام ابن حزمؒ اور محمد بن حبیب کا بیان ہے کہ طائف میں ثقیف کا بُت تھا جس کا نام لات تھا، جو ایک پہاڑی کے اوپر نصب کیا گیا تھا، اس کے لئے جو مکان بنایا گیا تھا اس کو کعبہ کی طرح غلاف چڑھایا جاتا تھا اور حرم کعبہ کی طرح اہلِ ثقیف وادی لات کو اس کا حرم مانتے تھے اور اس کے بعد کو حل قرار دیتے تھے، اور جس طرح کعبہ کے لئے حجبہ، کسوہ اور سدانہ کے عہدے مقرر تھے، اسی طرح لات کے لئے اہلِ ثقیف نے بھی عہدے مقرر کئے تھے۔ [۲]

قریش میں کعبہ کی سدانت اور مجاوری بنو ہاشم کے ذمہ تھی، اور ثقیف میں لات کی سدانت اور مجاوری آلِ ابی العاصی کے ذمے تھی۔ الغرض ثقیف نے کعبہ کے مقابلے میں لات کو اپنی مذہبی برتری اور دینی سیادت کا ذریعہ بنایا۔ قریش کے بنو ہاشم اور ثقیف کے

---

[۱] فتوح البلدان صہ ۶۸۔ [۲] کتاب المحبر صہ ۳۱۵ و جمھرۃ انساب العرب صہ ۲۹۱

آل ابوالعاصی میں اسی جاہلی تقدس اور مذہبی برتری کی وجہ سے باہمی اعزاز و اعتماد تھا، اور دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے، چنانچہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت فرمائی تو اس وقت آپ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ طائف میں ابوالعاصی ثقفی ہی کے یہاں مقیم تھیں، بعد میں حضرت عباسؓ ان کو لے کر اپنے ساتھ مکہ لے آئے۔ [1]

بنو ثقیف اسلام کے مقابلہ میں

الغرض بنو ثقیف قدیم زمانہ سے طائف میں نہایت شاندار اور خوشحال زندگی بسر کرتے تھے، اور ان کے جاہلی تمدن نے ان کو نہایت مغرور، متکبر اور نخوت پرست بنا دیا تھا، وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی عداوت و دشمنی میں قریش سے بھی چار قدم آگے ہی رہا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر طائف کا واقعہ اور آپؐ کے ساتھ طائف والوں کی بدسلوکی اور سفیہانہ حرکتیں اور باتیں مشہور ہیں۔ فتح مکہ کے بعد جب ان کے حلیف و ہم پلہ قریش اور پورے اہل مکہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تب بھی طائف کے بنو ثقیف اسلامی طاقت سے ٹکر لیتے رہے، چنانچہ فتح مکہ کے بعد غزوہ حنین میں بنو ثقیف نے پورے طور سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف قبیلۂ ہوازن کا ساتھ دیا، اور مسلمانوں کی فتح کے بعد بنو ثقیف کا ہزیمت خوردہ گروہ طائف میں قلعہ بند ہو کر مسلمانوں سے جنگ کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہو گیا، یہ شوال ۸ھ کا واقعہ ہے، اسلامی فوج نے طائف کا محاصرہ کیا، اور بیس دن سے اوپر بلکہ بعض روایات کی رو سے ستائیس دن تک طائف کا محاصرہ جاری رہا مگر بنو ثقیف رام نہ ہو سکے، اس درمیان میں اسلامی لشکر کا کچھ نقصان بھی ہوا، البتہ طائف کے کچھ غلام حصار سے نکل کر اسلامی فوج میں آ ملے اور مسلمان ہو گئے، بالآخر اسلامی فوج نے طائف کا محاصرہ ختم کر دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوازن کے قیدیوں اور مال غنیمت کے ساتھ مکہ مکرمہ کے قریب مقام جعرانہ میں فروکش ہوئے، طائف سے چلتے وقت آپؐ نے یہ دعا فرمائی تھی۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِ ثَقِیْفًا وَّاْتِ بِھِمْ — اے اللہ! بنو ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو ہمارے پاس پہنچا دے۔

---

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۲۲ ۔

چنانچہ جعرانہ میں ہوازن کے سردار اور امیرِ لشکر مالک بن عوف نصری خدمتِ نبوی میں حاضر ہوکر مسلمان ہوگئے، ان کے جھنڈے کے نیچے اور ان ہی کی کمان میں بنو ثقیف کے سپاہی غزوہ حنین میں مسلمانوں سے جنگ کر رہے تھے، یہ حنین میں شکست کھانے کے بعد بنو ثقیف کے ساتھ مل کر طائف میں اسلامی فوج سے لڑ رہے تھے، مگر اسلام لانے کے بعد ثمالہ، اسلمہ اور فہم وغیرہ قبائل کو ساتھ لے کر ثقیف سے برسرِ پیکار ہوگئے اور انکی روزمرہ کی زندگی تنگ کردی۔

اِن حالات نے بنو ثقیف کو متانت اور سنجیدگی کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے پر مجبور کیا۔ انھوں نے اندازہ کرلیا کہ اہلِ مکّہ اور قریش کے اسلام لانے کے بعد مسلمانوں سے مقابلہ کی طاقت کسی میں نہیں رہ گئی۔ ثقیف کے لوگ بھی تھک کر چور ہو چکے ہیں۔ اگر مسلمانوں نے ذرا دم لے کر طائف پر دوسرا حملہ کیا تو پھر ہماری خیر نہ ہوگی اور ساری قدیم شان و شوکت خاک میں مل جائیگی بہتر ہے کہ خود بڑھ کر صلح و مصالحت کی پیش کش کی جائے، چنانچہ ثقیف کا ایک وفد جعرانہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملا، اور ان امور پر صلح ہوئی:-

(۱) اہلِ ثقیف اسلام قبول کریں گے۔

(۲) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے اموال و املاک کو ان ہی کے قبضہ میں باقی رکھینگے

(۳) اہلِ ثقیف آپس میں بھی نہ ربا اور سود کا کاروبار کریں گے اور نہ ہی شراب استعمال کرینگے۔

بنو ثقیف خدمتِ نبوی میں

شوال ۸ھ میں ثقیف سے صلح ہوئی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں ثقیف کے محبوب ترین سردار حضرت عروہ بن مسعود ثقفی نے آپ کے دست اقدس پر اسلام قبول کیا اور طائف واپس جاکر وہاں تبلیغِ اسلام کی اجازت چاہی، اگرچہ بنو ثقیف سے صلح و مصالحت ہو چکی تھی مگر ان کی قدیم نخوت و عداوت کی طرف سے ابھی مسلمانوں کو کلی طور سے اطمینان نہیں ہوا تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فی الحال اسے مناسب نہیں تصور فرمایا مگر حضرت عروہ رض نے یقین دلایا کہ میں ثقیف میں بہت ہی معزز و محترم مانا جاتا ہوں، وہ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں دیں گے اور آپ نے ان کو اجازت دیدی، آخر وہی ہوا جس کا

اندیشہ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرمایا تھا۔ اور بنو ثقیف نے اپنے محبوب ترین سردار حضرت عروہ کو دعوتِ اسلام دینے پر قتل کر ڈالا، اس کے بعد بنو ثقیف کئی ماہ تک سوچتے رہے کہ اب کیا صورت کی جائے، سارا عرب اسلام لا چکا ہے، ہم نے حنین میں شکست کھائی اور خود جعرانہ میں پہنچ کر صلح کی پیش کش کی، اور اسلام پر صلح مکمل ہو جانے کے بعد جب عروہ نے ہم کو دعوت اسلام دی تو ہم نے ان کو قتل کر ڈالا، ثقیف کے اربابِ عقل و دانش بڑی بے چینی کے ساتھ ان باتوں پر کئی ماہ تک سوچتے رہے، یہاں تک کہ تقریباً ایک سال کی مدت گذر گئی اور رمضان ۹ھ آگیا جس میں قبیلہ بنو ثقیف کا ایک نمایندہ وفد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ روانہ کیا گیا، اس وفد کی آمد سے پہلے ہی ثقیف کے دو معزز افراد ابو ملیح بن عروہؓ اور قارب بن اسود خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر مشرف با اسلام ہو چکے تھے، اور ان کی وجہ سے ثقیف کی جمعیت میں مزید انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ اس وفد میں ثقیف کی دونوں شاخوں احلاف اور بنو مالک کے یہ افراد شامل تھے،

احلاف سے (۱) حکم بن عمرو بن وہب (۲) شرحبیل بن غیلان بن سلمہ، اور بنو مالک سے (۳) عثمان بن ابی العاص بن بشر (۴) اوس بن مالک (۵) نمیر بن خرشہ بن ربیعہ لئے گئے، اور عبد یالیل بن عمر کی سربراہی اور قیادت میں یہ وفد رمضان ۹ھ میں مدینہ منورہ میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے واپسی پر حضرت عثمان بن ابو العاص کو طائف کا امیر و حاکم اور معلم و امام مقرر فرمایا، اس واقعہ کے ڈیڑھ سال بعد ربیع الاول ۱۱ھ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وصال فرمایا، [۱]

بنو ثقیف بہت دیر کے بعد بزمِ رسالت کے حلقہ نشینوں میں شامل ہوئے اور ان کو صحبتِ نبوی کا بہت کم موقع ملا، ورنہ مکہ کے قریش اور مدینہ کے انصار کی طرح طائف کے ثقیف بھی غزوات و سرایا میں پیش پیش نظر آتے اور عہدِ رسالت میں ان کے دینی اور اسلامی کارنامے

[۱] تفصیل کے لئے سیرت ابن ہشام اور فتوح البلدان وغیرہ ملاحظہ ہو۔

انصار و مہاجرین کی خدمات کی طرح روشن ہوتے، مگر انھوں نے عہدِ رسالت کی تاخیر و تقصیر کا تدارک عہدِ خلافت میں یوں کر دیا کہ ثقیف کی دونوں بڑی شاخوں احلاف اور بنو مالک میں بہت سے مجاہد، فاتح حکمران، اربابِ سیاست اور باصلاحیت افراد پیدا ہوئے جنھوں نے رزم اور بزم میں یکساں ناموری حاصل کی اور جہاد کے میدانوں سے لیکر حکومت کے ایوانوں تک اپنی ثقفیت کو نمایاں کیا، ان ثقفی اعاظمِ رجال میں عثمان بن ابی العاصی، حکم بن ابی العاصی، مغیرہ بن ابی العاصی، حفص بن ابی العاصی، ابو عبید بن مسعود، ابو محجن بن حبیب، حارث بن کلدہ طبیب العرب، معتب بن مالک رحجاج بن محمد بن یوسف، محمد بن قاسم، عمر بن محمد بن قاسم وغیرہ وہ ناموران اسلام گذرے ہیں جن کے نام اور کام خلافتِ راشدہ اور خلافتِ امویہ میں جلی عنوان رکھتے ہیں، افسوس کہ ثقیف کے ایک کذاب مختار بن ابو عبید ثقفی نے اموی دور کی ابتدائی سیاست میں پڑکر نہایت مکروہ پارٹ ادا کیا اور کذاب و مدعی نبوت ہونے کی لعنت مول لی، اور دوسرے مبیر حجاج بن یوسف ثقفی نے اپنے ظالمانہ و سفاکانہ کارناموں سے بنو امیہ کی سیاست و حکومت کو چار چاند لگائے، اور ان دونوں کے سیاہ کارناموں کی وجہ سے پورے بنو ثقیف کی تابناک تاریخ پر ایسا داغ لگ گیا کہ ان کے مجاہدین و فاتحین اسلام کے جلی نام اور روشن کارنامے اچھی طرح لوحِ زمانہ پر نہ ابھر سکے۔ اگر ان دونوں کذاب و مبیر کو ثقیف کی تاریخ جدا کرکے دیکھا جائے تو عہدِ رسالت میں مکہ مکرمہ کے مہاجرین اور مدینہ منورہ کے انصار کی طرح عہدِ خلافت میں طائف کے ثقفی مجاہدین و فاتحین بھی گلشنِ اسلام کے گل سر سبد بن کر نظر آئیں گے۔

بنو ثقیف اسلامی غزوات و سیاسیات میں

بنو ثقیف اپنی تمام روایاتی شان و شوکت اور خاندانی شہرت و ناموری کے ساتھ اسلامی غزوات و معاملات میں اجتماعی طور پر عہدِ فاروقی کی ابتداء میں سامنے آئے، سنہ ۱۳ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے زمامِ خلافت سنبھالتے ہی حضرت ابو عبید بن مسعود ثقفی رض کو پانچ ہزار مجاہدینِ اسلام کا امیر بنا کر ایرانیوں کے مقابلہ کے لئے عراق روانہ فرمایا، اس مہم میں کئی نامی گرامی ثقفی مجاہد شریک تھے، اور رمضان سنہ ۱۳ھ میں ایرانیوں کے مقابلہ میں

بنو ثقیف کو اپنی شجاعت و بہادری کے جوہر دکھانے کا موقع ملا جس نے انکی قومی حمیت وغیرت کو بحق اسلام کھل کر سامنے آنے کا موقع دیا، اس واقعہ کے بعد سے بنو ثقیف خاص طور سے اسلامی لشکر میں رکھے جانے لگے، حتیٰ کہ دو سال کے بعد ۱۵ھ میں جب حضرت عمرؓ کو بحرین و عمان کے لئے ایک ذی ہوش، تجربہ کار اور جری امیر و حاکم کی ضرورت پڑی تو صحابہ کرام رضؓ نے متفقہ طور پر اسی ثقفی نوجوان کا نام پیش کیا جسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف کا امیر و حاکم مقرر فرمایا تھا اور حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے اس کے معاملہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔

چنانچہ حضرت عمر رضؓ نے حضرت عثمانؓ بن ابو العاصی ثقفی کو بحرین و عمان کا حاکم بنایا، انھوں نے اپنے بھائی حکمؓ بن ابو العاصی کو بلا کر اپنے علاقہ میں نائب مقرر کیا، پھر دونوں بھائیوں نے اپنے اور دو بھائیوں حفص بن ابو العاصی اور مغیرہ بن ابو العاصی کو بلا لیا، اور بحرین و عمان کے مرکز سے بلادِ ایران اور بلادِ ہندوستان میں مجاہدانہ مہمات روانہ کیں، اور خود بھی ایران کے مقامِ توج کو اسلام کی فوجی چھاونی بنا کر وہیں سے ایران دخراسان کے شہر، ابرکادان، اردشیر خرہ سابور، اصطخر، ارجان، شیرانہ، راشہر، شہرک، شبیر شینیز، گازرون، نوبندجان جرہ، دارابجرد، حصن جنابا، جہرم، فسا، اور اصفہان وغیرہ اور ہندوستان کے ساحلی علاقہ وشہر مکران، تھانہ، بھروچ اور دیبل وغیرہ پر فوج کشی کر کے ان کو فتح کیا۔

پورے بنو ثقیف کے ایمان و یقین کی مضبوطی اور اسلامی غیرت و حمیت کی عدیم المثالی کے لئے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے وہ الفاظ سند ہیں جو انھوں نے بنو ثقیف کے اجتماعی کردار پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ علامہ ابن سعدؒ نے لکھا ہے:

وقال المغیرۃ بن شعبۃ فیھم: قد خلوا فی الاسلام فلا اعلم قوماً من العرب بنی أب ولا قبیلۃ کانوا أصح اسلاما	حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ قبیلہ ثقیف کے لوگ اس پختگی کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے کہ میرے علم میں عرب کی کوئی قوم اور قبیلہ مجموعی طور سے ان سے زیادہ صحیح الاسلام نہیں ہوا، اور نہ ان سے زیادہ اللہ اور اس کی کتاب کے بارے میں

وَلاَ أَبعد أن يوجد فيهم غش   مخلص و خیر خواہ ہوا۔

لله ولكتابه منهم ۔ [۱]

آل ابوالعاصی ۔ اور آل ابوعقیل	ثقیف یعنی قسی کا سلسلۂ نسب یوں ہے: قسی بن منبہ بن بکر بن ہوازن

بن منصور بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس عیلان۔[۲] قسی کے لڑکوں میں جشم اور عوف کی اولاد طائف میں خوب پھولی پھلی اور مختلف افخاذ و بطون میں تقسیم ہوئی، حطیط بن جشم بن قسی کے دو لڑکے تھے۔ غاضرہ اور مالک، ان دونوں کی اولاد میں چشمک رہا کرتی تھی۔ بنو غاضرہ نے بنو مالک کے مقابلہ میں بنو عوف بن قسی سے حلف و دوستی کا معاملہ کر لیا۔ اور بنو عوف ہی کی طرح بنو غاضرہ بھی احلاف کہلائے اور بنو مالک کے حریف بنے، بنو مالک بن حطیط بن جشم بن قسی کو آگے چل کر بڑی ترقی ہوئی۔ اور یہ لوگ شاخ در شاخ ہو کر مختلف قبائل بن گئے، ان ہی میں بنو یسار بن مالک بن حطیط ہیں۔ جن کی ایک شاخ آل ابی العاصی ہے۔ یہ لوگ بہت معزز و محترم مانے جاتے تھے اور ثقیف کے بت لات کے سادن اور مجاور تھے، یعنی ثقیف میں آل ابی العاصی کی وہی حیثیت تھی جو قریش میں بنی ہاشم کی تھی جو کعبہ کے سادن و متولی تھے اسی خانوادہ میں حضرت عثمانؓ بن ابی العاصی ثقفی اور ان کے بھائی حکم اور مغیرہ وغیرہ ہیں جنھوں نے عہدِ فاروقی میں اسلامی فتوحات کی ابتدا کی۔

بنو عوف بن قسی نے بنو مالک بن حطیط بن جشم بن قسی سے مقابلہ کے لئے جشم بن قسی ہی کی ایک شاخ بنو غاضرہ سے حلف و معاہدہ کر لیا اور یہ لوگ احلاف کہلائے، آگے چل کر ان میں بھی بہت سے بطون ہوئے۔ ان ہی میں بنو معتب بن مالک بن کعب بن عمرو بن سعد بن عوف بن قسی ہیں، جن کی ایک شاخ آل ابی عقیل بن مسعود بن عامر بن معتب ہے، اسی سے حجاج بن یوسف بن حکم بن ابو عقیل، اور محمد بن قاسم بن محمد بن حکم بن ابو عقیل ہیں، جنھوں نے اپنے پیش رو ثقفی برادران عثمان و حکم اور مغیرہ کے ادھورے خاکے میں رنگ

[۱] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۱۳ ۔ [۲] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۶ ۔

بھا اور فاتح ہند کا لقب پایا، اس طرح ثقیف کے دونوں بڑے قبائل بنو مالک اور احلاف کے افراد و رجال نے ہندوستان کو اسلام کی دولت سے نوازنے اور اس ملک کو دین و ایمان کی اعلیٰ قدروں سے سرفراز کرنے میں پورا پورا حصہ لیا، حتیٰ کہ اول میں بھی وہی حضرات سرفہرست ہیں، اور آخر میں بھی ان کے روشن نام ملتے ہیں، ہندوستان کبھی طائف کے اس احسانِ عظیم کو فراموش نہیں کرسکتا اور یہاں کے مسلمان بنو ثقیف کے بارِ منت سے سر نہیں اٹھا سکتے۔ بنو مالک کے آل ابی العاصی ثقفی، اور احلاف کے آل ابی عقیل ثقفی ہندوستان میں اسلام کے قصرِ معلیٰ کے اولین معمار ہیں اور اس قلعہ کا ہر سپاہی ان کی عظمت کے سامنے سرنگوں ہے۔

حضرت عثمان بن ابو العاصی ثقفی رضی اللہ عنہٗ

نام عثمان، کنیت ابو عبد اللہ اور سلسلۂ نسب یہ ہے، عثمان بن ابو العاصی بن بشر بن عبد دہمان بن عبد اللہ بن ہمام بن ابان بن یسار بن مالک بن حطیط بن جشم بن قسی (ثقیف) بعض کتابوں میں عبد دہمان کے بجائے عبد بن وہمان ہے، ثقیف کی شاخ بنو مالک کے خاندان بنی یسار میں ایک خانوادہ آل ابو العاصی ہے، آپ اسی خانوادہ سے ہیں۔[1]

قبیلۂ ثقیف میں آپ کا گھرانا آلِ ابی العاصی جاہلی نقطۂ نظر سے بہت معزز و محترم مانا جاتا تھا، اور ثقیف کے بُت لات کا متولی تھا، علامہ ابن حزم نے لکھا ہے۔

وسدانته آل ابی العاصی من بنی مالك بن ثقیف، | اس بُت کے متولی بنو مالک میں سے آلِ ابی العاصی تھے۔

علامہ محمد بن حبیبؒ نے بھی تقریباً یہی لکھا ہے۔[2]

مکہ مکرمہ میں قریش کے بنو ہاشم کعبہ کے متولی تھے اور طائف میں لات کے متولی آل ابی العاصی تھے، اوران دونوں گھرانوں میں تعلقات بہت وسیع اور خصوصی تھے، اور قرابت داری کی طرح آمد و رفت جاری تھی، چنانچہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی، آپؐ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ابو العاصی کے یہاں تھیں اوران کو حضرت عباس رضؓ اپنے ساتھ مکہ مکرمہ لائے، مورخ یعقوبی نے لکھا ہے۔

---

[1] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۶ (مصر) وطبقات ابن سعد ج ۵ ص ۵۰۸ (بیروت) و اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۷۲ (طہران) وسیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۴۹ (مصر)

[2] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۹۱ وکتاب المحبر ص ۳۱۵ (حیدرآباد)

وقدم العباس بن عبد المطلب بزینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وکانت بالطائف حین ھاجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند ابی العاص بن بشر بن عبد دھمان الثقفی۔ [۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب کو حضرت عباسؓ مکہ لائے، جس وقت آپؐ نے ہجرت فرمائی وہ طائف میں، ابو العاصی ثقفی کے گھر پر تھیں۔

کہنا چاہیے کہ بنو ثقیف میں آل ابو العاصی وہ خوش نصیب گھرانا ہے جس نے سب سے پہلے ایک طرح سے نبوت کی برکت پائی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی نے ان کے یہاں قیام کر کے ان کو طائف میں اسلام کے احکام و تعلیمات کا مرکز بنا دیا چنانچہ بعد میں اسی گھر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے امارت پسند فرمائی، اس زمانہ میں حضرت عثمانؓ کم عمر رہے ہوں گے مگر آپ کی صاحبزادی کے واسطہ سے آپ سے بھی ان کو ایک گونہ تعلق ہو گیا ہوگا، شاید یہی وجہ ہے کہ جب وہ وفد ثقیف کے ساتھ مدینہ منورہ گئے تو سب سے نظریں بچا کر خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قرآن کی تعلیم حاصل کرتے یہاں تک کہ تمام ارکانِ وفد سے پہلے مسلمان ہو گئے، ان کے اسلام اور پیغمبر اسلام سے اس شغف میں حضرت زینب کی ان کے گھر موجودگی کو بڑا دخل رہا ہوگا۔

حضرت عثمانؓ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت عبد اللہ بن ربیعہ ہے، یہ بھی قبیلہ ثقیف سے تھیں، فاطمہ عرب کی ان خوش نصیب عورتوں میں تھیں جن کو منجبات کہتے تھے، یہ ماؤں کا لقب تھا جن کے بطن سے کم از کم تین نجیب و شریف اولاد پیدا ہوئی ہو، اور فاطمہؓ کے بطن سے ابو العاصیؓ کے چار لڑکے پیدا ہوئے، عثمانؓ، حکمؓ، ابو امیہ، ابو عمرؓ، اور ان چاروں نے اپنے زمانہ میں نجابت و شرافت اور عزت و شہرت کی زندگی پائی۔ [۲]

[۱] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۴۲ (بیروت) [۲] المحبر صفحہ ۴۶۰

فاطمہؓ بنت عبداللہ بن ربیعہ نے بڑی عمر پائی تھی، ان کو یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے موقع پر موجود تھیں، ان کا بیان ہے کہ یہ رات کا وقت تھا اس کے باوجود میں گھر کے اندر جس چیز کی طرف دیکھتی تھی، نورانی معلوم ہوتی تھی، اور ستاروں کو میں نے اس قدر قریب دیکھا کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ کہیں میرے اوپر گر نہ جائیں [۱]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آل ابو العاصی پر پہلے ہی سے سعادت کا سایہ پڑ رہا تھا، اور حضرت عثمان ثقفی اور ان کے بھائی اسی فضا میں پروان چڑھے تھے، ان کی ماں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت کے وقت کے برکات و انوار کو دیکھ چکی تھیں اور گھر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ کی صاجزادی رہ چکی تھیں، ان باتوں نے آل ابو العاصی کو دوسرے اہلِ ثقیف کے مقابلہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام سے ایک گونہ مانوس رکھا ہوگا اور وہ نفرت و عداوت کی بجائے محبت کا جذبہ رکھتے رہے ہونگے،

امام ابن حزم نے عثمانؓ کی والدہ کا نام صفیہ بنت امیہ بن عبد شمس لکھا ہے۔ [۲]

ابو العاصی کے کل چھ لڑکے تھے عثمان چار بھائی ایک ماں سے، اور دو حفص اور مغیرہ ابن حزم نے بنو ابی العاصی میں ان کے ناموں کو یوں درج کیا ہے، عثمان، حکم، مغیرہ، حفص، ابو عثمان، امیہ۔ ان میں حفص اور ابو عثمان کو دو افراد شمار کیا ہے حالانکہ ابو عثمان حفص کی کنیت ہے، اور ابو امیہ کے بجائے صرف امیہ لکھا ہے، اور ابو عمرو کا نام درج ہی نہیں کیا ہے، ابو العاصی کی ایک لڑکی بابہ بنت ابو العاصی تھیں۔

اسلام رمضان ۸ھ میں مکہ اور حنین کی فتح کے بعد اہلِ طائف نے اسلام کی عداوت کے بارے میں اپنا رویہ بدل دیا، اور پورے انشراحِ صدر کے ساتھ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہوگئے، اس سلسلہ میں باہمی مشورہ کے بعد طے ہوا کہ اپنے معزز سردار عبدیالیل بن عمرو بن عمیر کو خدمتِ نبوی میں مدینہ منورہ بھیجا جائے، مگر عبدیالیل نے تنہا جانے اور ذمہ دارانہ طور پر بات چیت

[۱] اسد الغابہ ج ۵ ص ۵۲۶ و تہذیب التہذیب ج ، ص ۴۹۰ ، [۲] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۱

کرنے سے انکار کردیا۔ ان کے سامنے حضرت عروہ بن مسعود ثقفی رضؓ کا تازہ بتازہ واقعہ تھا، جنھوں نے چند دن پہلے مدینہ منورہ جاکر اسلام قبول کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر اہلِ طائف کو دعوتِ اسلام دی جس کے نتیجہ میں ثقیف نے اپنے اس معزز و محترم سردار کو قتل کر ڈالا، انھوں نے سوچا کہ میری قوم کہیں میرے ساتھ بھی عروہ جیسا معاملہ نہ کرے، اس لئے اصرار کیا کہ میرے ساتھ اور آدمی بھی رہیں۔

چونکہ بنو ثقیف اب ہر قیمت پر اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے، اس لئے طے ہوا کہ ثقیف کی دو شاخ احلاف اور بنو مالک سے ذمہ دار اشخاص کا ایک وفد عبد یالیل کی سرکردگی میں خدمت نبوی میں حاضر ہو چنانچہ احلاف سے دو اور بنو مالک سے تین کل پانچ افراد کا انتخاب ہوا جن کی سیادت و قیادت عبد یالیل کے سپرد کی گئی تاکہ واپسی پر ہر شخص اپنے اپنے خاندان کو دعوتِ اسلام دے، رئیس الوفد عبد یالیل عمر اور مرتبہ میں حضرت عروہؓ بن مسعود کے ہم پلہ تھے، اور بنو مالک سے عثمان بن ابی العاصی تھے جو ارکانِ وفد میں سب سے کم عمر اور نو خیز تھے۔

طبقات ابنِ سعد کی روایت کے مطابق احلاف اور بنو مالک سے ملاکر کل ستّر آدمیوں کا وفد مدینہ منورہ آیا تھا، احلاف کے ارکان وفد حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے یہاں فروکش ہوئے، اور بنو مالک والوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حجرۂ مبارکہ اور مسجد کے درمیان ایک خیمہ میں ٹھہرایا، غالباً ان ستّر آدمیوں میں چھ حضرات بحیثیت ارکانِ وفد کے ذمہ دارانہ طور پر آئے تھے، باقی لوگ اپنے طور پر ذوق و شوق سے آگئے تھے۔

حضرت عثمان بن ابو العاصی سب سے کم سن اور نو عمر تھے اس لئے لوگ ان کو خیمہ میں سامان وغیرہ کی حفاظت کے خیال سے چھوڑ کر دن میں خدمت نبوی میں حاضر ہوتے اور رات کو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عشا کے بعد ان کے خیمہ میں تشریف لاتے اور دیر تک ان سے گفتگو فرماتے جس میں قریش کے مظالم کا تذکرہ بھی ہوا کرتا تھا۔ اس درمیان میں حضرت عثمان بن ابو العاصی نے یہ ترکیب نکالی کہ جب ارکانِ وفد خدمتِ نبوی

سے واپس آکر دوپہر میں اپنے خیمے میں سو جاتے تو آپ چپکے سے اٹھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے اور اسلام کے بارے میں آپ سے براہ راست معلومات حاصل کرتے، اور قرآن پڑھتے، اس طرح انھوں نے کئی سورتیں زبانِ رسالت سے سن کر یاد کرلیں، اگر آپؐ آرام فرماتے ہوتے تو حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کے پاس جاکر دین کی تعلیم حاصل کرتے، اور قرآن پڑھتے، کبھی کبھی حضرت ابیؓ بن کعب سے بھی دینی سوالوں کا جواب کرتے اور قرآن سیکھتے، اس طرح وہ ثقیف کے وفد سے پہلے ہی اسلام قبول کرکے دین اور قرآن کی تعلیم سے بہرہ ور ہوگئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نو عمری میں ان کی اس دینی حرص، جودتِ طبع اور دینداری کو دیکھ کر خوشی اور تعجب کا اظہار فرماتے۔

کچھ دنوں کے بعد جب ارکانِ وفد مسلمان ہوکر طائف واپس ہونے لگے تو انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ہم میں سے کسی کو ہمارا امیر مقرر فرمادیجئے، چونکہ آپؐ نے عثمان بن ابی العاصی کی دینی تڑپ اور اسلام سے رغبت دیکھی تھی، نیز انھوں نے اسی مدت میں قرآن کا ایک معتد بہ حصہ پڑھ لیا تھا، اس لئے آپؐ نے ارکانِ وفد کو مخاطب فرمایا۔

إنه كيّس، وقد أخذ من القرآن صدرًا۔	عثمان بہت سمجھدار شخص ہیں، انھوں نے قرآن کا ایک حصہ بھی حاصل کرلیا ہے۔

نیز حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے عثمان کی امارت کی سفارش کرتے ہوئے شہادت دی کہ:۔

يا رسول الله! اني قد رأيتُ هذا الغلام منهم من احرصهم على التفقّهِ في الاسلام وتعليم القرآن۔	یا رسول اللہ! میں نے ثقیف والوں میں اس لڑکے کو سب سے زیادہ اسلامی مسائل کے سمجھنے اور قرآن حاصل کرنے میں حریص پایا ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبد یالیل اور دوسرے عمر رسیدہ اور

اعیان کے ہوتے ہوئے اس نوعمر، نوخیز اور نوجوان کو بنو ثقیف اور طائف کا امیر و حاکم مقرر فرمایا۔

عثمانؓ کا بیان ہے کہ جب ہم طائف واپس ہونے کے لئے تیار ہوئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے یہ آخری عہد و پیمان لیا۔

یا عثمان تجاوز فی الصلوٰۃ، و	اے عثمانؓ! نماز مختصر پڑھانا۔ اور لوگوں کا اندازہ
اقدر الناس باضعفھم،	سب سے ضعیف و کمزور آدمی سے کرنا، کیوں کہ
فإن فیھم الکبیر والصغیر،	نمازیوں میں بڑے، چھوٹے، ضعیف، اور حاجت مند
والضعیف وذا الحاجۃ۔	سب ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

طبقات ابن سعد اور اسد الغابۃ وغیرہ میں یہ حدیث کئی طرق سے الفاظ میں معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے، وفد کے طائف پہنچ جانے پر حضرت عثمانؓ ان کے امام اور امیر ہو کر نماز کی امامت اور قرآن کی معلمی کرتے رہے، ابن سعد کا بیان ہے:۔

فقدم معھم الطائف، فکان	عثمان وفد کے ساتھ طائف آئے اور لوگوں کو نماز
یصلی بھم، ویقرئھم	پڑھاتے اور قرآن کی تعلیم دیتے رہے۔
القرآن،	

یہ واقعہ رمضان ۹ھ کا ہے، اس کے بعد تمام بنو ثقیف پورے انشراح اور اخلاص سے اسلام پر جم گئے۔ [1]

طائف کی امارت یوں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں متعدد صحابہؓ کو مختلف مقامات کا امیر و حاکم مقرر فرمایا تھا، مگر حضرت عثمانؓ ثقفی کی امارت ان سب میں اس اعتبار سے مثالی رہی کہ آپ کے وصال کے بعد بھی وہ پورے دور صدیقی اور ابتداءِ دورِ فاروقی تک طائف میں اپنے عہدے پر قائم رہے، اور انھوں نے اپنی قابلیت وصلاحیت سے ثقیف اور

---

[1] تفصیلات کے لئے سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۳۲ و ۵۳۹ و ص ۵۴۰ و ص ۵۴۱ و طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۵۰۸ ص ۵۱۱ و ج ۷ ص ۲۶ و اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۷۳ ملاحظہ ہو۔

اہلِ طائف کی ہر معاملہ میں رہنمائی کی، طائف میں آپ کی امارت کی مدت تقریباً چھ سال رہی، جس میں سے ڈیڑھ سال عہدِ نبوت میں، ڈھائی سال عہدِ صدیقی میں، اور دو سال عہدِ فاروقی میں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو ۱۵ھ میں عمان اور بحرین کا امیر بنایا، اسی دورِ امارت میں آپ اور آپ کے بھائیوں نے ایران اور ہندوستان میں جہاد کیا۔

عہدِ صدیقی میں ایامِ ردت میں شاندار خدمات ثقیف کے مسلمان ہونے کے ڈیڑھ سال بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ربیع الاول ۱۱ھ میں وصال فرمایا، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، اس وقت پورے عرب میں ارتداد کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا، طائف کے بنو ثقیف کی قدیم نخوت اور جدید اسلام دوستی کے پیش نظر ان کے ارتداد کا سخت خطرہ ہو سکتا تھا، مگر انھوں نے تمام جاہلی قدروں کو دل و دماغ سے نکال کر اسلام قبول کیا تھا، اس لئے یہ طوفان وہاں نہ پہونچ سکا، اور ان کے امیر حضرت عثمان ثقفی کی ایک غیرت مندانہ للکار نے ان کو دین اسلام پر ثابت قدم رکھا، اور کسی مسلمان کے پائے استقلال میں تزلزل نہیں آنے پایا، علامہ ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ جس وقت عرب مرتد ہو کر اسلام سے برگشتہ ہو رہے تھے ثقیف کے بعض لوگوں نے بھی اسلام سے برگشتگی کا ارادہ کیا، مگر عثمانؓ ثقفی تنہا شخص تھے جو ان کے ارتداد سے باز رہنے کا سبب بنے، انھوں نے اس موقع پر ان سے صرف یہ کہا کہ:۔

یا معشر ثقیف کنتم اٰخر الناس	اے گروہِ ثقیف! تم سب سے آخر میں اسلام میں آئے
اسلامًا فلا تکونوا اول الناس	ہو، اب تم سب سے پہلے اس سے نکلنے والے نہ بن جاؤ

ردۃً۔ [۱]

اس جملہ نے ثقیف کی غیرت و حمیت کو اس طرح جگا دیا کہ وہ ارتداد کی مسموم ہوا سے ہر طرح محفوظ رہے، حافظ ابن حجرؒ اور علامہ ابن اثیرؒ نے بھی لکھا ہے کہ عثمانؓ ہی نے وصالِ نبویؐ کے بعد اہلِ طائف کو ارتداد سے بچایا۔ [۲]

---

[۱] الاستیعاب بذیل الاصابہ ج ۳ ص ۹۲۔ [۲] الاصابہ ج ۴ ص ۲۲۱ و اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۷۳۔

ایامِ ردت میں حضرت عثمان ثقفی کا یہ اتنا عظیم الشان کارنامہ ہے جو ان کی طائف کی امارت کا جوہر ہے اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے دیگر علاقوں میں ارتداد کے روکنے میں پوری مستعدی سے کام کیا اور حضرت ابو بکرؓ کی پوری پوری مدد کی، مکہ مکرمہ بھی ردت کی وبا سے پوری طرح محفوظ تھا۔ جہاں حضرت عتاب بن اسیدؓ کی امارت تھی، حضرت عثمانؓ اور حضرت عتابؓ نے اپنے اپنے حلقۂ امارت کو ارتداد سے بچانے کے بعد قتالِ مرتدین کے لئے آدمی دیئے، ان دونوں حضرات نے حضرت ابو بکرؓ کو لکھا کہ مرتدوں کے خلاف اسلامی فوج کے ذریعہ تادیبی کارروائی کرنی چاہیئے۔ اس کے بعد حضرت عتابؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو یمامہ کے مرتدوں سے جنگ کرنے کے لئے روانہ کیا، اور حضرت عثمان ثقفیؓ نے حضرت عثمان بن ربیعہ کی قیادت میں اہلِ طائف کی ایک جمعیۃ کو ازدشنوءہ کی طرف بھیجا، جہاں قبائل ازد، بجیلہ، اور خثعم کے مرتدین حمیضہ بن نعمان کی قیادت میں آمادۂ قتال تھے، آخر اسلامی فوج اور مرتدوں میں جنگ ہوئی، مرتدین شکست کھاکر منتشر ہو گئے، اور ان کا سردار حمیضہ صحرا کی طرف بھاگا۔

ان ہی ایام میں حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت عتابؓ کو لکھا کہ تم لوگ اپنے ہر علاقہ (مخلاف) میں ارتداد کی روک تھام کے لئے ایسے لوگوں کو روانہ کرو، جن کے امیر تمہارے معتبر اور ثقہ آدمی ہوں چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اپنے بھائی (حکم) کی قیادت میں ایک رضاکارانہ جماعت تیار کرائی اور اس سے طائف کے ہر حصہ میں بیس بیس آدمی روانہ کئے، اسی طرح حضرت عتابؓ نے مکۂ مکرمہ کے اطراف میں اپنے بھائی خالد بن اسیدؓ کی قیادت میں پانچ سو آدمیوں کو روانہ کیا، اس حسنِ انتظام کے نتیجہ میں مکہ اور طائف کے کسی علاقہ میں ارتداد کی وبا نہیں پھوٹنے پائی اور ہر طرف امن و امان رہا۔[1]

حضرت عثمان ثقفیؓ کی امارت عہدِ فاروقی میں بحرین و عمان کی امارت حضرت عثمان ثقفیؓ عہدِ فاروقی کے ابتدائی دو سالوں تک

[1] تاریخ طبری جلد ۴ صفحہ ۳۱۹ و صفحہ ۳۲۲۔

طائف کے امیر رہے، مگر ۱۵ھ میں ان کو حضرت عمرؓ نے بحرین اور عمان کی امارت دی۔ یہ دونوں صوبے مرکزِ خلافت سے بہت دور مشرقی عرب میں واقع ہیں، یہاں بحرین سے مراد موجودہ مملکتِ عربیہ سعودیہ کا وہ مشرقی علاقہ ہے جسے منطقہ شرقیہ کہتے ہیں، یہ دونوں صوبے قدیم زمانہ سے ایرانی سلطنت کے ماتحت تھے اور اس کی نیابت میں عرب حکمراں ان پر حکومت کرتے تھے۔ اور عجمی اثر و نفوذ کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے حق میں سخت ناسازگار تھے، ان علاقوں میں بنو عبد القیس، بنو تمیم، بنو ازد، بنو ناجیہ اور بنو بکر بن وائل وغیرہ آباد تھے، جو آخر عہدِ رسالت میں اسلام لائے۔ وہاں میں ارتداد کی وبا پورے زور شور سے پھوٹی تھی۔ بدویت و بداوت یہاں کی زندگی میں عام تھی، پھر یہ علاقے مرکزِ اسلام سے کافی دوری پر واقع تھے۔ اور راستہ بھی اس زمانہ میں دشوار گذار تھا اس وجہ سے ان دونوں صوبوں کے لئے کسی ایسے جوان سال، باہمت، اور دور اندیش امیر کی ضرورت تھی، جو یہاں کے داخلی اور خارجی فتنوں کا سد باب کر سکے، حضرت عمرؓ نے ابتداء میں یہاں کے نظام میں تبدیلی کی حضرت علاء حضرمی رضؓ کو یہاں کی امارت سے ہٹا کر ان کو بصرہ کا امیر بنایا، عمان پر حضرت حذیفہ بن محصن کو مقرر کیا اور بحرین کا انتظام یوں کیا کہ مالیات پر حضرت قدامہ بن مظعون جمحی کو اور احداث وصلوٰۃ پر حضرت ابو ہریرہ رضؓ کو متعین کیا، پھر ۱۵ھ میں عمان و بحرین دونوں صوبے کی امارت عثمانؓ ثقفی کے حوالے کی۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ آپؓ نے معاملہ کی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں کی امارت کے لئے حضرات صحابہؓ سے مشورہ کیا، سب لوگوں نے عثمان بن ابو العاصی ثقفی رضؓ کا نام پیش کیا کیونکہ ان کی جلیل القدر جرأت مندانہ خدمات سب کے سامنے تھیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ان کو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے طائف کی امارت کے لئے نامزد فرمایا ہے اس لئے میں ان کو وہاں سے ہٹا نہیں سکتا، اس پر صحابہؓ نے یہ ترکیب بتائی کہ آپ ان کو وہاں سے علیحدہ نہ کریں بلکہ ان سے کہیں کہ وہ اپنے کسی پسندیدہ اور معتمد شخص کو نائب بنا کر مدینہ آجائیں، حضرت عمرؓ نے

اِس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے حضرت عثمان کو لکھا کہ:۔

أن خلّف علی عملك من احببت واقدم علیّ — تم اپنے کسی پسندیدہ آدمی کو اپنا نائب مقرر کر کے میرے پاس آجاؤ۔

عثمانؓ نے یہ خط پاکر اپنے بھائی حکم بن ابو العاصی کو طائف میں اپنا نائب مقرر کیا، اور جب مدینہ منوّرہ آئے تو حضرت عمرؓ نے ان کو بحرین اور عمان کا امیر بنادیا۔

اصابہ میں حکم بن ابو العاصی کے ذکر میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کو صراحت کے ساتھ لکھا کہ تم اپنے بھائی حکم کو اپنا نائب مقرر کر کے میرے پاس آجاؤ۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ عثمانؓ ابتدا میں صرف بحرین کے امیر تھے۔[۱]

تعجب ہے کہ علامہ ابن سعدؒ نے طبقات میں ایک جگہ عثمانؓ کی بحرین وعمان کی امارت کو واضح طور سے بیان کرکے اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھا ہے کہ جب عہدِ فاروقی میں ۱۴ھ میں بصرہ آباد کیا گیا اور حضرت عمرؓ نے وہاں کسی عقلمند، طاقتور اور جری شخص کو امیر بنانا چاہا تو لوگوں نے عثمان بن ابی العاصی کا نام لیا، آپ نے یہ کہہ کر اس رائے سے اتفاق نہیں کیا کہ انکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر بنایا ہے میں ان کو طائف سے علیحدہ نہیں کرسکتا اور جب وہ اپنا نائب مقرر کر کے مدینہ آئے تو ان کو بصرہ کا امیر بنادیا۔[۲] حافظ ابنِ حجرؒ نے بھی تہذیب التہذیب میں یہی روایت ابن سعد کے حوالہ سے درج کی ہے، حالانکہ یہ بات بظاہر بالکل خلافِ واقعہ معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح محمد بن حبیب بغدادی نے کتاب المحبّر میں اس سلسلہ میں دو باتیں عام روایات کے خلاف لکھی ہیں، ایک یہ کہ حضرت عثمان ثقفیؓ نے خود حضرت عمرؓ کے پاس خط لکھ کر جہاد کی اجازت طلب کی تھی، دوسری بات یہ کہ حضرت عثمان نے یعلی بن عبداللہ بن ربیعہ

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۵۰۸ و فتوح البلدان ص ۴۲۲، الاصابہ ج ۲ ص ۳۰، والاستیعاب بذیل اصابہ ج ۲ ص ۹۲

[۲] طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۳۰

کو طائف میں اپنا نائب مقرر کیا تھا[۱]۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے بحرین پہونچ کر اپنے بھائی حضرت حکم کو طائف کی نیابت سے ہٹایا، اور بحرین کی نیابت دی تو وقتی طور سے ہو سکتا ہے کہ حکم نے یعلیٰ بن عبد اللہ کو طائف کی نیابت دیدی ہو، ورنہ عثمان اور حکم کے بعد عہدِ فاروقی میں طائف کے مستقل امیر و حاکم سفیان بن عبد اللہ ثقفیؓ تھے جو ابن سعد کی تصریح کے مطابق وفدِ ثقیف کے ساتھ خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تھے[۲] اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں طائف کے امیر قاسم بن ربیعہ ثقفیؓ تھے۔[۳]

حضرت عثمان ثقفی رضؓ نے ۱۵ھ میں بحرین اور عمان دونوں صوبوں کی زمامِ امارت یوں سنبھالی کہ خود تو عمان چلے گئے، اور بحرین پر اپنے بھائی حکم بن ابو العاصی کو اپنا نائب مقرر کر کے ان کو طائف سے بلا لیا، اور یہاں آتے ہی اپنی انتظامی صلاحیت سے عوام کو رام کر لیا اور دونوں صوبوں کا پورا علاقہ مطیع و فرماں بردار بن گیا۔ جب اِدھر سے اطمینان ہو گیا تو ایران میں فتوحات کا سلسلہ جاری کیا اسی سلسلہ میں ہندوستان میں بھی جہاد کیا، جیسا کہ اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مدینہ منورہ میں قیام اور مکان حضرت عثمان ثقفی اپنے وطن طائف میں ذاتی اور آبائی مکانات و املاک رکھتے تھے، ۹ھ میں مدینہ منورہ آئے پھر طائف واپس جا کر وہیں امیر رہے، غالب گمان ہے کہ طائف کی امارت کے زمانہ میں ان کا مدینہ منورہ آنا جانا رہا ہوگا، متعدد احادیث رسول کے روایت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ایک سے زائد بار یہاں آئے تھے، اسی طرح عہدِ صدیقی میں بھی اسلامی اور ملکی امور و معاملات کے سلسلے میں آنا جانا ہوا ہوگا، اور جب ۱۵ھ میں حضرت عمرؓ نے ان کو مدینہ منورہ طلب کیا تو ایک مستقل مکان جو مسجدِ نبوی سے متصل تھا خرید کر ان کو

[۱] کتاب المحبر ص ۱۲۶ [۲] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۱۳۹ [۳] کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۷۰

دیا، جس میں وہ بحرین وعمان کی امارت کے ایام میں وقتاً فوقتاً آکر قیام کرتے تھے، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں مسجدِ نبوی میں توسیع و ترمیم کی، تو عثمان ثقفی رض کا یہ مکان اسی میں لے لیا اور اس کے بدلے بصرہ میں ان کو مزید زمین دیدی۔[۱]

الغرض ۱۵ھ سے ۲۹ھ تک حضرت عثمان ثقفی رض کا مستقل وطن مدینہ منورہ رہا اور عمان و بحرین کی امارت کے دوران آپ حسبِ ضرورت یہیں قیام فرماتے تھے، ویسے آپ کا یہ زمانہ اکثر و بیشتر جہاد و غزوات میں گذرا اور آپ عمان و بحرین اور توج کے معرکوں میں زیادہ رہے۔

بصرہ میں جاگیر و زمین بحرین و عمان کی امارت ہی کے زمانے میں حضرت عثمان ثقفی رض اور اُن کے لڑکوں نے بصرہ میں اُبلّہ کے قریب ایک قطعۂ زمین حاصل کر کے اُسے کاشتکاری اور آبادی کے قابل بنایا تھا، ۲۹ھ کے بعد جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے عثمان ثقفی رض کو بصرہ میں مستقل جاگیر عطا کی تو اُسی کے ساتھ ان کے اس مقبوضہ قطعۂ زمین کو بھی جاگیر میں شامل کر دیا اور تمسک نامہ میں اس کی تصریح کردی۔[۲]

عہدِ عثمانی میں ۲۹ھ میں معزولی، اور بصرہ میں مستقل قیام حضرت عثمان ثقفی عہدِ فاروقی میں تو دس سال تک اپنے عہدے پر رہ کر متعلقہ خدمات بحسن و خوبی انجام دیتے رہے، اور ۲ سال تک عہدِ عثمانی میں بھی اپنے منصب پر رہے یہاں تک کہ ۲۹ھ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کر کے ان کی جگہ عبداللہ بن عامر بن کریز کو مقرر کیا، اس کے بعد حضرت عثمان ثقفی نے بصرہ میں مستقل طور سے قیام فرمایا اور وہیں وفات پائی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ پہلے ہی سے اپنے لڑکوں اور بھائیوں سمیت بصرہ کی نئی آبادی میں سکونت پذیر ہونے کا ارادہ رکھتے تھے، شاید اسی وجہ سے انھوں نے مدینہ منورہ کا مکان مسجد نبوی کی توسیع کے وقت حضرت عثمان رض کو دے دیا اور بصرہ میں ایک علاقہ کو گھیر لیا اور امارت سے سبکدوشی کا وقت آیا تو

---

[۱] فتوح البلدان ص ۳۵۶ و معجم البلدان ج ۵ ص ۳۶۶ ۔ [۲] معجم البلدان ج ۵ ص ۳۶۶

حضرت عثمان غنیؓ کی عطا کردہ جاگیر، اور مدینہ منورہ کے مکان کے بدلے والی زمین اور اپنی پہلے کی مقبوضہ زمین سب کو یکجا کر کے بارہ ہزار بیگھہ زمین کا ایک چک بصرہ میں لے لیا جو شطِ عثمان کے نام سے مشہور تھا، اسی میں سے آپ نے اپنے سب بھائیوں کو بھی جاگیر دی۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان ثقفی نے بصرہ میں مستقل سکونت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت (۳۵ھ) سے کچھ ہی پہلے اختیار کی تھی، چنانچہ بلاذری نے انساب الاشراف میں لکھا ہے کہ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بلوائیوں نے گھیرا تو عثمان بن ابو العاصی نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میں آپ کا ساتھ دیتا ہوں، بلوائیوں سے جنگ کرنی چاہیے، مگر حضرت عثمان غنیؓ نے اس سے انکار کر دیا، اس پر حضرت عثمان ثقفی نے بصرہ چلے جانے کی اجازت چاہی، اور اجازت پر بصرہ چلے گئے۔[۱] جہاں آپنے اپنے لڑکوں اور بھائیوں کو لے کر اپنے علاقہ شطِ عثمان میں زندگی کے باقی ایام نہایت عزت و احترام اور وسعت و فراخی میں بسر کئے۔ شطِ عثمان کی تفصیل بعد میں آئیگی۔

مختلف واقعات اور اوصاف و کمالات

حضرت عثمان بن ابو العاصی رضی اللہ عنہ سلامتی طبع، معاملہ فہمی، دُور اندیشی، دینداری، علم و حکمت اور تقویٰ و طہارت میں جامع الاوصاف والکمالات تھے۔ زبانِ رسالت سے ان کو اِنَّہٗ کَیِّسٌ (وہ بہت عقلمند ہیں) کا تمغہ ملا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو احرصھم علی التفقہ فی الاسلام و تعلیم القرآن (اسلام فہمی اور تعلیم قرآن کے سب سے زیادہ شیدائی) کی سند دی، ان کے تلمیذ خاص حضرت امام حسن بصریؒ نے لکھا ہے:

ما رأینا افضل منہ (ہم نے عثمانؓ سے بہتر آدمی نہیں دیکھا)[۲] اور علامہ ابن حزمؒ نے لکھا ہے:

وعثمان منھم من خیار الصحابۃ[۳] — عثمان اپنے بھائیوں میں بہترین صحابہؓ میں سے تھے۔

دینی تڑپ اور قرآن سے شغف نے ان کو اصغر القوم اور حدیث السن ہونے کے باوجود

---

[۱] انساب الاشراف ج ۵ ص ۷۰ [۲] کتاب العلل و معرفۃ الرجال از امام احمد بن حنبل ص ۲۴۳۔ طبع انقرہ۔

[۳] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۶

بنو ثقیف کے نامی گرامی اور عمر رسیدہ افراد کی موجودگی میں طائف کا امیر و حاکم بنایا اور قوم نے ان کی امارت کو یوں قبول کیا کہ ان کے ایک جملہ نے ارتداد کے طوفان کے سامنے آہنی دیوار کھڑی کردی، عہدِ صدیقی میں انھوں نے اسلام کی شاندار خدمت کی، اور جب حضرت عمرؓ کو ایک قابل امیر کی ضرورت پڑی تو محض صحابہؓ میں متفقہ طور سے ان کا نام لیا گیا، اور آپ نے اپنی زندگی کے تقریباً پندرہ سال بحرین و عمان کی امارت میں بسر کیے کہ نہ صرف ان دونوں صوبوں کے بگڑے ہوئے حالات کو درست کیا بلکہ ایران اور ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا دروازہ کھولا، اور دونوں ملکوں کے مختلف بلاد و امصار فتح کئے۔

الغرض حضرت عثمان ثقفی میں صحابیت کی پوری شان پائی جاتی تھی، وہ صرف ایک کامیاب امیر و حاکم اور فاتح مجاہد ہی نہیں تھے بلکہ محدث و فقیہ، عابد و زاہد اور متقی و باخدا ہونے کے ساتھ حکیم و دانا بھی تھے، ان کے بعض مقولے ہم یہاں درج کرتے ہیں، امام طبریؒ نے لکھا ہے کہ غزوۂ اصطخر میں ایک موقع پر حضرت عثمان بن ابو العاصیؓ نے اسلامی لشکر کو مخاطب کرکے فرمایا کہ:-

ان اللہ اذا اراد بقوم خیراً کفھم ووفر امانتھم فاحفظوھا، فان اول ماتفقدون من دینکم الامانۃ فاذا فقدتموھا جُدِّد لکم فی کل یوم فقدان شیٔ من امورکم[1]	جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ خیر کا معاملہ کرنا چاہتا ہے تو اُسے برائی سے روکتا ہے، اور اس میں امانتداری کی کثرت کردیتا ہے، تم لوگ امانت کا بہت زیادہ خیال کرو، کیونکہ تمہاری دینی خرابی کی ابتدا تمہارا امانت کو ضائع کرنا ہوگا، اور جب تم امانت میں خیانت کرو گے تو روزانہ تمہارے معاملات میں نیا نیا نقصان و فقدان ہوگا۔

ان چند جملوں میں آپ نے مسلمان قوم کے عروج و زوال کا جو سبب بتایا ہے وہ ہر زمانہ

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۳۲۲۔

کے مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے اور اس سے ایمان و امانت کے باہمی تعلق کا پتہ چلتا ہے۔

علامہ ابن عبد البر نے ان کا یہ ایک قول نقل کیا ہے۔

الناکح مغترس فلینظر این یضع غرسہ فان سوء العرق لا بد ان ینزع ولو بعد حین [1]

شادی کرنے والا گویا پودا لگانے والا باغبان ہے اس لئے اسے چاہئے کہ اچھی طرح دیکھ بھال کرلے کہ وہ پودا کہاں لگا رہا ہے، کیونکہ مدت کے بعد سہی اس کا اثر تو ظاہر ہو کر رہے گا۔

اس جملہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ انسانی زندگی کی نزاکتوں پر کس قدر گہری نظر رکھتے تھے، اور کیسی جامعیت کے ساتھ شادی بیاہ میں احتیاط اور تحقیق و تلاش کی ضرورت بیان فرمائی ہے اور یہ کہ ذرا سی غفلت سے اولاد کا انجام کیا سے کیا ہو سکتا ہے؟

علامہ ابو عبید بن سلامؒ نے حسن بصری سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ عثمان بن ابو العاصی نے ایک آدمی کو کچھ رقم دی تاکہ وہ تجارت و معیشت کا انتظام کرے، اس آدمی نے اس رقم سے شراب کی خرید و فروخت کی، اور بہت زیادہ نفع کمایا، ایک مدت کے بعد اس نے آکر حضرت عثمانؓ کو بتایا کہ اس نے اس مال سے تجارتی کاروبار کیا اور بہت سا نفع کمایا تو حضرت عثمانؓ نے پوچھا کہ تم نے کون سا کام کیا؟ اس نے کہا کہ شراب کا کاروبار کیا ہے، یہ سنتے ہی حضرت عثمانؓ اپنے گھر سے نکلے اور سیدھے دجلہ کے کنارے گئے جہاں اس شخص نے اپنا کاروبار پھیلا رکھا تھا اور جاتے ہی حکم دیا کہ تمام شراب دریائے دجلہ میں گرا دی جائے، بعض لوگوں نے کہا کہ اس شراب کا سرکہ بنجائے تو کیا مضائقہ ہے، مگر آپ نے ساری شراب دریا میں پھنکوا دی[2]۔ اس واقعہ میں رقم دینے کے ساتھ شرکت اور مضاربت کی تصریح نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ رقم اس آدمی کو بطور قرض کے یا بطور مدد کے دی تھی، اس کے باوجود جب آپ کو پتہ چلا کہ میری رقم سے ایک حرام چیز کا کاروبار ہو رہا

---

[1] الاستیعاب بذیل اصابہ ج ۳ صہ ۹۲۔ [2] کتاب الاموال صہ ۱۰۳۔

ہے تو اسے ذرا بھی گوارا نہ فرمایا اور فوراً نہی عن المنکر کی سب سے پہلی صورت اختیار فرمائی۔

ابو عبید ہی نے امام حسن بصری سے یہ روایت بھی کی ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے عثمان بن ابو العاصی رضؓ سے کہا کہ ابو عبد اللہ! آپ حضرات تو ہم لوگوں سے بہت آگے ہو گئے ہیں، حضرت عثمان رضؓ نے کہا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ اس شخص نے کہا کہ آپ مالدار حضرات صدقات وخیرات دیتے ہیں، نیکی کے کام کرتے ہیں، اور غربا و مساکین کو نوازتے ہیں، آپ نے کہا کہ اچھا تم لوگ ہماری دولت کی اس کثرت پر رشک کرتے ہو، اس شخص نے کہا کہ ہاں واللہ یہی بات ہے، آپ نے فرمایا:۔

والذی نفسی بیدہ لدرھمٌ ینفقہ أحدکم یخرج من جھدہ یضعہ فی حقہ افضلُ فی نفسی من عشرۃ آلاف یُنفقھا أحدنا غیضاً من فیض۔ [1]

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے ایک درہم جسے تم میں سے کوئی شخص یوں خرچ کرتا ہے کہ اپنی محنت و مشقت کی کمائی سے نکال کر اپنی جائز ضرورت میں صرف کرتا ہے، وہ ایک درہم میرے نزدیک ان دس ہزار درہموں سے بہتر ہے جن کو ہم مالداروں میں سے کوئی شخص خرچ کرتا ہے۔

حضرت امام عبد اللہ بن مبارک نے اسی واقعہ کو یوں بیان فرمایا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عثمان بن ابو العاصی سے کہا کہ اے گروہ اغنیاء! آپ لوگ خوب ثواب کما رہے ہیں۔ صدقہ کرتے ہیں، غلام آزاد کرتے ہیں اور حج کرتے ہیں، عثمان رضؓ نے کہا کہ تم لوگ ہم پر رشک کرتے ہو؟ اس نے کہا ہاں! ہم لوگ آپ لوگوں پر رشک کرتے ہیں، یہ سن کر حضرت عثمان رضؓ نے کہا، خدا کی قسم وہ ایک درہم جسے تم میں سے ایک آدمی محنت مشقت سے حاصل کر کے اپنی جائز جگہ میں خرچ کرتا ہے، بہتر ہے اس دس ہزار درہم سے جسے ہم میں سے کوئی اپنے زیادہ مال سے تھوڑا سا نکالتا ہے۔ [2]

---

[1] کتاب الاموال ص ۲۵۳۔ [2] کتاب الزہد والرقائق ص ۳۶۶

ابو بشر دولابی نے امام حسن بصری سے روایت کی ہے کہ جس زمانہ میں زیاد بن ابو سفیان نے کلاب بن امیہ لیثی کو ابلہ کا امیر بنایا تھا ایک مرتبہ عثمان بن ابو العاص اُدھر سے گذرے اور کلاب بن امیہ کو دیکھا تو پوچھا کہ ابو ہارون! یہاں پر تم کو کس کام نے بٹھا رکھا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس شخص (زیاد) نے مجھے ٹیکس اور محصول کی وصولی پر مقرر کر رکھا ہے۔ حضرت عثمان رضؓ نے کہا کہ میں تم سے ایک حدیث بیان کر رہا ہوں جسے میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ کلاب نے کہا بیان فرمائیے۔ حضرت عثمان رضؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا معمول تھا کہ جب رات کا ایک حصہ گذر جاتا، یا جب تہائی رات باقی رہ جاتی تو اپنے گھر والوں سے کہتے کہ اٹھو کیونکہ یہ ایسی ساعت ہے جس میں ساحر (جادوگر) اور عاشر (عُشر اور ٹیکس وصول کرنے والا) کے علاوہ سب کی دعا قبول کی جاتی ہے۔ یہ سنتے ہی کلاب نے کشتی طلب کی اور دریائے دجلہ پار کر کے زیاد کے یہاں پہنچے اور کہہ دیا کہ تم جانو، تمہارا کام جانے میں اس عہدے سے علیحدہ ہوتا ہوں۔[۱]

ابن اثیر نے بھی یہ واقعہ اسد الغابہ میں نقل کیا ہے مگر اس میں ہے کہ حضرت عثمان رضؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہو کہ جب آدھی رات ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک منادی ندا دیتا ہے کہ کیا کوئی طالب مغفرت ہے کہ میں اس کی مغفرت کر دوں، کیا کوئی دعا کرنے والا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کر لوں۔ کیا کوئی سائل ہے کہ میں اس کا سوال پورا کر دوں، اس وقت کسی دعا کرنے والے کی دعا رد نہیں کی جاتی البتہ زانیہ عورت اور عُشر (ٹیکس) وصول کرنے والے کی دعا مقبول نہیں ہوتی ہے۔[۲]

امام مالک رحؒ نے موطا میں عثمان بن ابو العاص سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ مجھے اتنا شدید درد ہونے لگا کہ اس سے جان بری مشکل معلوم ہوتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] کتاب الکنی والاسماء ج ۲ ص ۲۵   [۲] اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۰۴

میری عیادت کو تشریف لائے اور میرا حال دیکھ کر فرمایا کہ تم درد کی جگہ پر اپنا داہنا ہاتھ سات مرتبہ پھیرو اور یہ دعا پڑھو۔ اَعُوْذُ بِعِزَّۃِ اللّٰہِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ آپ کے فرمانے کے مطابق میں نے یہ ترکیب کی اور درد جاتا رہا۔ اس کے بعد میں یہ دعا اپنے گھر والوں اور دوسرے حاجتمندوں کو بتایا کرتا تھا۔ [1]

حضرت عثمانؓ بصرہ کے معزز اور ذمہ دار لوگوں میں بڑے مقام و مرتبہ کے مالک تھے، تدبّر اور دُوراندیشی کے ساتھ قوتِ فیصلہ اور قوتِ اقدام بھی رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بصرہ کے امیر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اپنی چچازاد بہن یعنی حضرت عروہ بن مسعودؓ ثقفی کی ایک لڑکی کو شادی کا پیغام دیا اور عبید اللہ بن ابو عقیل ثقفی کے یہاں کہلا بھیجا کہ آپ اس لڑکی سے میرا نکاح کر دیں۔ مگر انھوں نے کہا کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا، آپ شہر کے امیر اور لڑکی کے خاندان والے ہیں۔ یہ جواب سن کر حضرت مغیرہ بن شعبہ نے یہی پیغام حضرت عثمانؓ بن ابو العاصی کے پاس بھیجا تو انھوں نے اُس لڑکی کی شادی ان سے کر دی۔ [2]

ان چند متفرق واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ ثقفی کی شخصیت جامع الحیثیات تھی، اور فضل و کمال میں بہت بلند مرتبہ کے مالک تھے۔

احادیثِ رسولؐ کی روایت حضرت عثمان ثقفیؓ امیر و مجاہد اور فاتح ہونے کے ساتھ محدث و فقیہ بھی تھے، گذشتہ واقعات سے ان کے اس پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے، درحقیقت وہ ان جامع شخصیتوں میں سے تھے، جو اسلامی رزم و بزم دونوں میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ آپ اپنے ساتھ علم اور عَلم دونوں رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ حاملینِ علومِ نبوّت میں سے بھی شمار کئے جاتے ہیں، اور ان سے متعدد احادیث مروی ہیں، خاص طور سے اہلِ مدینہ اور اہلِ بصرہ نے ان سے روایت کی ہے اور امام حسنؒ بصری ان کے خصوصی شاگرد ہیں جنھوں نے ان سے بہت زیادہ روایت کی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے کتاب العلل و معرفۃ الرجال میں لکھا ہے کہ امام حسنؒ بصری کہتے ہیں کہ میں نے عثمانؓ بن ابو العاصی سے افضل

---

[1] مؤطا امام مالک ص   [2] سنن سعید بن منصور ج ۳ قسم ۱ ص ۱۳۸

کسی کو نہیں دیکھا، ہم ان کے مکان پر جاکر ان سے حدیث کی روایت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حسن بصریؒ نے ایک حدیث بیان کی تو حضرت عبداللہ بن بریدہؓ نے کہا کہ ابو سعید! آپ سے یہ حدیث کس نے بیان کی ہے؟ انھوں نے کہا کہ عثمان بن ابو العاصی کی بیٹی نے، یہ سن کر حضرت عبداللہ بن بریدہ نے کہا، واللہ وہ ثقہ ہیں۔ ؎[1]

حافظ ابن عبدالبر نے لکھا ہے:-

وروی عنہ اھلھا، واھل المدینۃ ایضاً، والحسنؒ أروی الناس عنہ، وقیل: انہ لم یسمع منہ۔ ؎[2]	عثمان ثقفی سے اہل بصرہ اور اہل مدینہ نے روایت کی ہے اور حسن بصریؒ نے ان سے سب سے زیادہ روایت کی ہے اور ایک قول ہے کہ حسن بصریؒ نے ان سے حدیث کا سماع نہیں کیا ہے۔

حسن بصریؒ نے زندگی کا بیشتر حصہ بصرہ میں۔ گذارا اور وہیں ۱۱۰ھ میں فوت ہوئے حضرت عثمان ثقفی بھی ۲۹ھ سے مستقل بصرہ میں سکونت پذیر تھے، اور ان کے انتقال کے وقت حسنؒ بصری کی عمر تیس سال سے زائد تھی، اس زمانہ میں تابعین صحابہؓ سے ملنے اور ان سے براہِ راست حدیث کی روایت وسماع کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے، اور حضرت امام احمدؒ نے حسنؒ بصری کے عثمانؓ سے سماع وروایت کی تصریح خود حسنؒ بصری کی زبانی کی ہے ان حقائق کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ حسن بصری نے عثمان ثقفی رض سے حدیث کا سماع نہیں کیا ہے بعید بات ہے۔

امام نوویؒ نے تہذیب الاسماء واللغات میں تصریح کی ہے کہ عثمانؓ بن ابو العاصی نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نو۹ احادیث کی روایت کی ہے جن میں سے تین حدیثیں صحیح مسلم میں ہیں، باقی سنن کی کتابوں میں ہیں۔ ؎[3]

؎[1] کتاب العلل ومعرفۃ الرجال ص۲۳۴ و ص۲۵۵۔ ؎[2] الاستیعاب بذیل اصابہ ج ۳ ص ۹۲۔

؎[3] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص۳۲۱۔

عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ سے جن حضرات نے روایت کی ہے اُن میں اُن کے بھائی حکم بن ابوالعاصی
بھتیجے یزید بن حکم بن ابوالعاصی اور غلام ابوالحکم ہیں، ان کے علاوہ علمائے رجال نے ان حضرات
کے نام بتائے ہیں۔ امام سعید بن مسیب، موسیٰ بن طلحہ بن عبداللہ، نافع بن جبیر بن مطعم
ابوالعلاء بن عبیداللہ بن شخیر، مطرف بن عبیداللہ بن شخیر، محمد بن عیاض، محمد بن سیرین۔
عبدالرحمن بن جوشن غطفانی حسن بصریؒ، ان تمام حضرات میں امام حسن بصری اپنے شیخ کے
علوم و معارف کے سب سے زیادہ راوی و ناشر ہیں۔ [1]

وفات ۵۰ھ میں | حضرت عثمان رضؓ ۲۹ھ میں معزولی کے بعد اپنے لڑکوں اور بھائیوں سمیت
بصرہ میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے اپنی زندگی کے باقی ایام
وہیں نہایت امن و اطمینان اور عزت کے ساتھ گذارے۔ اس درمیان میں ان کی کسی
خارجی یا داخلی مہم یا سیاسی، ملکی اور فوجی سرگرمی کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ ان کے بصرہ میں
انتقال کی تصریح کتابوں میں موجود ہے۔

ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں، ابن قتیبہ نے المعارف میں، ابن حجر نے الاصابہ
اور تقریب التہذیب میں، اور نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں تصریح کی ہے کہ حضرت
عثمان ثقفی رضؓ نے حضرت معاویہ رضؓ کے زمانہ میں بصرہ میں وفات پائی، سن وفات ابن حجرؒ
نے اصابہ میں ۵۰ھ یا ۵۱ھ لکھا ہے اور تہذیب التہذیب میں بھی ۵۰ھ لکھ کر لکھا ہے کہ
ابن برقی، خلیفہ بن خیاط، مصعب، ابن قانع اور عسکری نے ۵۱ھ بتایا ہے۔ [2]

اولادِ امجاد | اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان ثقفی رضؓ کو اولاد کے بارے میں بھی بڑا خوش نصیب بنایا تھا،
ان کے لڑکے ان کے سامنے پروان چڑھے، اسلامی جہاد میں شریک ہوئے، باپ کے ساتھ

---

[1] ملاحظہ ہو الاستیعاب بذیل اصابہ ج ۳ ص ۹۲ والاصابہ ج ۲ ص ۲۲۱، واسد الغابہ ج ۳ ص ۳۷۳ وتہذیب
التہذیب ج ۷، ص ۱۲۹۔ [2] الاستیعاب ج ۳ ص ۹۳، کتاب المعارف ص ۱۱۷، اصابہ ج ۲ ص ۲۳۱،
تقریب التہذیب ج ۲ ص ۱۰، تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۳۲۱۔

زندگی کے معاملات و مسائل میں تجربات حاصل کئے، بعد میں ان کی نسل میں اچھے اچھے علماء و محدثین اور مشاہیرِ دوراں گذرے ہیں، حضرت عثمان رضؓ کے دو بیویاں تھیں۔

(۱) ریحانہ بنت ابو العاصی بن امیہ، ان کے بطن سے محمد بن عثمان پیدا ہوئے جیسا کہ علامہ ابن حزم نے لکھا ہے۔ [۱]

(۲) خالدہ بنت ابو لہب، محمد بن حبیب بغدادی نے تصریح کی ہے کہ عثمان بن ابو العاصی ابو لہب کے داماد تھے، اور اس کی بیٹی خالدہ ان کی زوجیت میں تھیں۔ [۲]

۲۱ھ میں اصطخر کے ایرانی حاکم شہرک کی سرکوبی کے لئے عثمانؓ نے اپنے بھائی حکم کو فوج دیکر بھیجا تو ان کے ساتھ اپنے ایک لڑکے کو بھی بھیجا تھا۔ [۳]

بحرین و عمان کی امارت کے ایام میں عثمانؓ اور ان کے لڑکوں نے بصرہ میں ایک قطعہ زمین لے کر اسے آباد کیا تھا۔ ہمیں عثمانؓ کی تین اولاد کے نام اور حالات مل سکے ہیں دو لڑکے محمد اور عبد اللہ، اور ایک لڑکی ام عبد اللہ۔

(۱) محمد بن عثمان بن ابو العاصی ثقفی، ان کے بارے میں علامہ ابن حزم نے تصریح کی ہے کہ وہ ریحانہ بنت ابو العاصی بن امیہ کے بطن سے تھے، مشہور محدث عبد الوہاب بن عبد المجید ثقفی ان ہی کی اولاد میں ہیں، ان کی دو بیویاں تھیں۔ ایک کا نام بانہ بنت ابو العاصی تھا۔ اس کے بطن سے تین لڑکے عبد المجید بن محمد، زیاد بن محمد، اور ابو العاصی بن محمد پیدا ہوئے، دوسری بیوی کا نام معلوم نہیں، اس کے بطن سے ابو الصلت محمد بن محمد تھے۔

(۲) عبد اللہ بن عثمان بن ابو العاصی ثقفی، بصرہ میں مستقل قیام کے بعد انھوں نے وہاں سب سے پہلا حمام بنوایا تھا جس کا نام ہی حمام عبد اللہ بن عثمان ثقفی تھا۔ یہ حضرت معاویہؓ کے ایک باغ کے قریب غیر آباد جگہ پر تھا۔ اسی کے قریب قصر عیسیٰ بن جعفر تھا۔ [۴]

ان کی ایک لڑکی کا نام ام محمد بنت عبد اللہ تھا جو خراسان کے حاکم سلم بن زیاد کی زوجیت

---

[۱] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۶، [۲] المحبر ص ۶۵، [۳] کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۳ و تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۱۱۲۔
[۴] فتوح البلدان ص ۳۴۵۔

میں تھیں، یہ پہلی عرب خاتون تھیں جو اپنے شوہر کے ساتھ علاقہ خوارزم (خیوہ) میں گئی تھیں، اور وہیں مقامِ صغد میں ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام صغدی رکھا گیا۔[1]

(۳) ام عبداللہ بنت عثمان بن ابوالعاصی، یہ بصرہ کے حاکم زیاد بن ابوسفیان کی زوجیت میں تھیں۔

حضرت حکم بن ابوالعاصی ثقفی رضی اللہ عنہ

کنیت ابوعثمان یا ابوعبدالملک ہے اور نام و نسب یہ ہے حکم بن ابوالعاصی بن بشر بن عبد دہمان ثقفی، حضرت عثمان ثقفیؓ کے حقیقی بھائی اور ان کی تمام حاکمانہ، فاتحانہ اور امیرانہ سرگرمیوں میں برابر کے شریک اور "ثانی اثنین" ہیں۔ حضرت حکم بھی ۹ھ میں اسلام لائے۔ البتہ بنو ثقیف کے وفد کے ساتھ خدمتِ نبوی میں ان کی حاضری سے علامہ ابن سعد نے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے۔[2]

آپ کو صحابیِ رسولؐ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ابن سعد نے لکھا ہے:۔

واخوہ الحکم بن ابی العاصی بن بشر بن عبد دہمان وقد صحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم[3]	اور عثمان کے بھائی حکم بن ابوالعاصی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہے۔

ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

الحکم بن ابی العاص بن بشر...	حکم بن ابوالعاصی ثقفی کی کنیت ابوعثمان ہے اور ابوعبدالملک بھی

[1] فتوح البلدان ص۴۰۳۔ [2] طبقات ابن سعد ج۷ ص۱۰۱۔ [3] ایضاً ج۵ ص۵۰۹۔

الثقفی یکنی اباعثمان وقیل: ابو عبد الملک، وھو اخو عثمان بن ابی العاصی الثقفی، له صحبة،[1]	بتائی گئی ہے وہ عثمان بن ابو العاصی ثقفی کے بھائی ہیں، ان کی صحابیت ثابت ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے:

قال ابن سید: یقال: له صحبة،[2]	ابن سید نے کہا ہے کہ ان کا صحابی ہونا بیان کیا گیا ہے۔

ذہبی نے بھی تجرید اسماء الصحابہ میں لہ صحبۃ لکھ کر ان کے صحابی ہونے کی تصریح کی ہے۔[3]

عثمانؓ کی طائف کی امارت کے زمانہ میں حکمؓ کی دینی و اسلامی خدمات

حضرت حکمؓ بھی اپنے بھائی عثمانؓ کی طرح امارت وسیاست میں بہت دور اندیش اور انتظامی و اصلاحی امور میں پیش پیش رہتے تھے، اور عثمانؓ کی طائف کی امارت کے پورے زمانہ میں ہر کام میں ان کے دستِ راست بن کر کام کرتے رہے، حتی کہ جب ۱۵ھ میں عثمانؓ بحرین وعمان کی امارت پر آئے تو حکم کو یہاں بھی اپنے ساتھ رکھا۔ طبری کی روایت کے مطابق عہدِ صدیقی میں جب ردت کی وبا پھوٹی تو حضرت عثمانؓ نے طائف میں ایک رضاکارانہ فوج تیار کی جس کے بیس بیس سپاہی اطراف وجوانب کی بستیوں میں تعینات کئے گئے تھے تاکہ اُن میں ارتداد کا گذر نہ ہو، اس جماعت کے سربراہ حضرت حکمؓ تھے،[4] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایامِ ردت میں عثمانؓ کی طرح حکمؓ نے بھی نہایت مستعدی اور اخلاص سے کام کیا، اور ارتداد کے روکنے میں اپنے امیر بھائی کی پوری مدد کی۔

طائف کی امارت

حکمؓ کے بھائی عثمانؓ ۹ھ سے ۱۵ھ تک طائف کے امیر رہے، اس مدت میں حکمؓ نے ہر موقع پر اپنے بھائی کا ساتھ دیا، اور اپنی بہترین انتظامی صلاحیت سے ان کی امارت میں چار چاند لگائے، اس لئے جب حضرت عمرؓ نے ان کو بحرین وعمان کی امارت کے لئے طلب کیا اور کہا کہ اپنے کسی معتبر ومعتمد آدمی کو اپنا نائب بنا کر میرے پاس آجاؤ۔

[1] اسد الغابہ ج ۲ صفحہ ۳۵۔ [2] الاصابہ ج ۲ صفحہ ۲۸۔ [3] تجرید اسماء الصحابہ ج ۱ صفحہ ۱۳۵۔ [4] تاریخ الطبری ج ۳ صفحہ ۳۲۲

تو عثمانؓ نے طائف کی امارت اپنے بھائی حکم کے حوالے کی، بلکہ اصابہ میں حکم کے تذکرہ میں ہے کہ
کہ حضرت عمرؓ نے عثمان کو صراحت کے ساتھ لکھا کہ اپنے بھائی حکم کو اپنا نائب مقرر کر کے
میرے پاس آجاؤ، [1] اس تصریح کی رو سے یہ نیابت نہیں بلکہ مستقل امارت تھی جس کی
تقرری اور منظوری خلافت کی طرف سے ہوئی تھی، اور حضرت حکم نے اپنی قابلیت و صلاحیت
سے کچھ دنوں تک طائف کی امارت و حکومت کا عہدہ سنبھالا، اور کسی قسم کی ابتری پیدا
نہ ہونے دی۔

بحرین کی امارت اور فتوحات جب حضرت عمرؓ نے ۱۵ھ میں حضرت عثمانؓ ثقفی کو بحرین اور عمان
کی امارت و حکومت دی تو انھوں نے بہت جلد اپنے بھائی حکمؓ کو طائف کی امارت دیدی،
یہ دونوں صوبے مرکزِ خلافت سے بہت دور اور دشوار گذار علاقے میں تھے، ساتھ ہی بڑے
شورش پسند اور ہنگامہ خیز بھی تھے، عثمانؓ نے سوچا کہ مجھ سے تنہا ان دونوں صوبوں کا انتظام
بوجوہ احسن نہیں ہو سکتا اس لئے حکمؓ کو بحرین کی امارت و حکومت دیدی، یہ امارت و حکومت
بھی امیر المومنین ہی کی مرضی اور اجازت سے تھی، اس لئے علماء نے اسے مستقل امارت لکھا
ہے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

کان امیرًا علی البحرین [2] — حکمؓ بحرین کے امیر تھے

اور ذہبیؒ نے تصریح کی ہے:۔

له صحبة، وأمر علی البحرین [3] — حکمؓ صحابی ہیں اور بحرین کے امیر بنائے گئے۔

بلاذری نے لکھا ہے:۔

فوجه اخاه الحکم الی البحرین ومضی الی عمان۔ [4] — عثمانؓ نے اپنے بھائی حکمؓ کو بحرین روانہ کیا اور خود عمان گئے۔

یہاں دونوں بھائیوں نے مل کر ملکی استحکام و انتظام اور غزوات و فتوحات میں سرگرمی

[1] الاصابہ ج ۲ ص ۳۔ [2] اسد الغابہ ج ۲ ص ۳۵۔ [3] تجرید اسماء الصحابہ ج ۱ ص ۴۵۔ [4] فتوح البلدان ص ۴۳

دکھائی، اور عثمانؓ کے حکم و منشا، اور خلافت کے مشورہ کے بعد حضرت حکم رضی اللہ عنہ اپنے وظائف بجالاتے رہے حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:۔

وولاہ اخوہ عثمان البحرین، فافتتح فتوحاً کثیرۃ۔ [۱]

حکم کو ان کے بھائی عثمانؓ نے بحرین کی ولایت دی تو انھوں نے بہت سی فتوحات کیں،

ابن عبد البر نے لکھا ہے:۔

وافتتح عثمان والحکم فتوحاً کثیرۃ بالعراق فی سنۃ تسع عشرۃ وسنۃ عشرین، [۲]

عثمان اور حکم دونوں بھائیوں نے عراق کے محاذ سے سنہ ۱۹ھ اور سنہ ۲۰ھ میں بہت سی فتوحات حاصل کیں۔

الغرض حکم ثقفیؓ نے بھی عثمانؓ کے ساتھ ایران و ہندوستان کی فتوحات میں حصہ لیا کئی غزوات میں خود امیر تھے، اور اسلامی فتوحات کے ایرانی مرکز توج سے ایک طرف خراسان و سجستان کے بلاد و امصار فتح کرتے اور دوسری طرف ہندوستان میں جہاد فرماتے، آپ کی امارت میں ہندوستان میں تین بار جہاد ہوا جیسا کہ تفصیل آئے گی۔

اوصاف و کمالات اور چند اہم واقعات حضرت حکم صحابیٔ رسولؐ تھے اور ان میں بھی صحابیت کی پوری شان پائی جاتی تھی، معاملہ فہمی حسنِ انتظام اور تقویٰ و طہارت میں شہرت رکھتے تھے ساتھ ہی احادیثِ رسول کے راوی بھی تھے، ان کے بعض واقعات ملاحظہ ہوں۔

امام بخاریؒ نے تاریخِ کبیر میں حضرت عمرؓ اور حضرت حکمؓ کے مابین ایک معاملہ کا تذکرہ مختصر طور سے کیا ہے[۳] اور ابن اثیر نے اس کی تفصیل حضرت حکمؓ سے یوں بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے مجلس میں کہا کہ میرے پاس یتیموں کا کچھ مال رکھا ہوا ہے، جو زکوٰۃ ادا کرنے کی وجہ سے کم ہوتا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مال یوں ہی پڑا پڑا ختم ہو جائیگا کیا تم میں کوئی تاجر ہے، میں نے اپنے آپ کو اس کام کے لئے پیش کیا تو آپ نے مجھے دس ہزار

[۱] الاصابہ ج ۲ ص ۲ ، [۲] الاستیعاب بذیل اصابہ ج ۱ ص ۳۴۵ ، [۳] التاریخ الکبیر ج ۱ قسم دوم ص ۳۲۹

کی رقم دی، میں یہ رقم لے کر کچھ دنوں کے لئے باہر چلا گیا، جب واپس آیا تو آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ ہمارے مال کا کیا ہوا؟ میں نے کہا کہ یہ آپ کا مال موجود ہے، اور ایک لاکھ کی رقم سامنے رکھ دی، اور بتایا کہ دس ہزار کی رقم تجارت کی وجہ سے اس مقدار تک پہنچ گئی ہے۔[۱]

اسی قسم کا ایک واقعہ ابو عبید بن سلام نے لکھا ہے، شعبہؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے عثمان بن ابو العاصی سے دریافت کیا کہ تمہارے یہاں تجارت کا کیا حال ہے؟ ہمارے پاس ایک یتیم کا مال رکھا ہوا ہے جسے زکوٰۃ ختم کر دینا چاہتی ہے، پھر آپ نے وہ رقم عثمانؓ کے حوالہ کر دی اور کچھ دنوں کے بعد وہ اچھے خاصے منافع کے ساتھ حاضر ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ تم نے ہمارے مال سے تجارت کی، ہمارا راس المال اور اصل سرمایہ واپس کر دو۔ چنانچہ آپ نے اصل سرمایہ لے لیا اور منافع کی ساری رقم واپس کر دی[۲] بظاہر یہ واقعہ مذکورہ بالا واقعہ سے جدا معلوم ہوتا ہے مگر غالباً اسی کو ابو عبیدؒ نے حضرت حکمؓ کے بجائے حضرت عثمانؓ سے منسوب کیا ہے۔

بخاری میں حضرت ام حرام بنت سلمانؓ کے بحری سفر کا تذکرہ ہے اور وہ پہلی مسلمان خاتون ہیں جو حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ایک جہاد کے سلسلے میں بحیرۂ روم کے سفر پر گئیں اور اسی میں انتقال فرمایا۔ مگر ان سے بہت پہلے حضرت حکمؓ کی بیوی بکرہ بنت زبرقان نے بلادِ فارس کے جہاد کے سلسلے میں مقام توج کا بحری سفر کیا جہاں ان کے شوہر جہاد کی مہمات میں مصروف تھے۔ ابو الفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی میں لکھا ہے:۔

وکانت بکرۃ اول عربیۃ رکبت البحر فاخرج بھا الی الحکم وھو بتوّج۔[۳]	بکرہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے سمندر پر سواری کی اور ان کو ان کے شوہر حضرت حکمؓ کے پاس پہنچایا گیا جب کہ وہ توج میں تھے۔

---

[۱] اسد الغابہ ج ۲ ص ۳۴، [۲] کتاب الاموال ص ۴۵۴، [۳] کتاب الاغانی ج ۱۲ ص ۲۸۔

حضرت حکمؓ طائف اور بحرین کے امیر رہے، پھر معزولی کے بعد بصرہ میں مستقل قیام پذیر ہو گئے، اس زمانہ میں ایک بار ان کے لئے خراسان کے شہر مرو کی ولایت و امارت کا موقعہ نکلا تھا مگر وہاں نہ جا سکے، بات یہ ہوئی کہ حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ۴۵ھ میں زیاد بن ابوسفیانؓ بصرہ کے امیر ہوئے اور ان کو مرو کی ولایت و حکومت کے لئے کسی مناسب آدمی کی ضرورت پڑی، زیادؓ نے اپنے دربان فیل کو حکم دیا کہ حکمؓ کو بلا لاؤ اور اس سے مراد حکم بن ابوالعاصی ثقفی تھے۔ مگر دربان فیل جا کر حضرت حکم بن عمرو غفاری کو لوا لایا۔ اور زیاد نے ان کے تقدس کی بنا پر ان ہی کو خراسان کا والی و حاکم بنا دیا، زیاد سے حضرت حکمؓ کی بھتیجی ام عبداللہ بنت عثمان بن العاصی منسوب تھیں، اس لئے آپ کو بلوایا تھا[1]

احادیث کی روایت | حضرت حکمؓ ثقفی اپنے بھائی عثمان ہی کی طرح امیر و مجاہد اور فاتح ہونے کے ساتھ احادیثِ رسول اور دینی علوم سے بھی حصۂ وافر رکھتے تھے، اور بصرہ کے علماء و محدثین میں شمار کئے جاتے تھے۔ امام بخاریؒ لکھتے ہیں:۔

یُعَدُّ فی البصریین ۔[2] — حکم ثقفی کا شمار بصرہ کے محدثین میں ہوتا ہے۔

انھوں نے براہ راست رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مرفوع احادیث کی روایت کی، مگر بعض محدثین نے ان کی احادیث کو مرسل بتایا ہے۔ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:۔

یعد فی البصریین ، ومنہم من یجعل احادیثہ مرسلۃ[3] — حکم بصرہ کے محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں اور بعض ان کی احادیث کو مرسل قرار دیتے ہیں۔

حضرت حکمؓ نے حضرت عمرؓ اور اپنے بھائی عثمان سے احادیث کی روایت کی ہے اور ان سے معاویہ بن قرہ نے روایت کی ہے[4]

وفات ۵۰ھ کے بعد | حکم بھی اپنے بھائی عثمانؓ سے پہلے ۲۹ھ میں بحکم حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ معزول ہو کر بصرہ میں مقیم ہو گئے۔ عثمانؓ نے دوسرے بھائیوں کی طرح ان کو بھی اپنے علاقہ شط عثمان سے ایک قطعۂ زمین جاگیر دی جسے حکمان کہتے تھے، آپ نے اسی میں اپنا

---

[1] فتوح البلدان ص ۳۰۴ و کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۸۱ ۔ [2] التاریخ الکبیر ج ۱ قسم دوم ص ۳۲۹ ،

[3] الاستیعاب بذیل اصابہ ج ۱ ص ۳۰۲ [4] اسد الغابہ ج ۲ ص ۳۵ و اصابہ ج ۲ ص ۲۵ ۔

مکان بنایا اور بود و باش اختیار کی اور بصرہ ہی میں ۴۵ھ کے بعد انتقال کیا۔

اولاد حکمؓ کے چار لڑکوں کے نام ہمیں معلوم ہو سکے ہیں جن کے مختصر حالات یہ ہیں۔

(۱) یزید بن حکم ثقفیؒ۔ یہ شاعر تھے، اور حجاج بن یوسف نے ان کو اپنی امارت عراق کے زمانہ میں علاقہ فارس کا حاکم بنایا تھا، انھوں نے اپنے چچا عثمان بن ابو العاصی سے حدیث کی روایت کی ہے۔[1]

(۲) عبد الرحمن بن حکم ثقفیؒ۔ ان کے لڑکے حرب تھے، بصرہ میں حربان نامی علاقہ ان کی ملکیت میں تھا اور ان ہی کے نام سے مشہور تھا۔[2]

(۳) یحییٰ بن حکم ثقفیؒ۔ ان کے پوتے حکم بن ایوب بن یحییٰ ثقفی، حجاج بن یوسف کے نائب تھے، ان کی مدح میں جریر نے ایک قصیدہ کہا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:۔

حتی أنخناها الی باب الحکم   خلیفة الحجاج غیر المتهم[3]

(۴) یعلیٰ بن حکم ثقفی، یہ شاعر تھے، ایک شعر میں اپنے بھائی یزید بن حکم کو ان کے کوتاہ قد ہونے پر عار دلایا تھا۔[4]

حضرت عثمانؓ ثقفی کی اولاد کی طرح ان کے بھائی حکم کی اولاد بھی اعیان و اشراف میں شمار ہوتی تھی اور بصرہ میں ان کو بڑا جاہ و جلال حاصل تھا۔ ابن سعد نے لکھا ہے:۔

وأولاده اشراف ایضا، منهم یزید بن الحکم بن ابی العاصی الشاعر[5]	حکم کی اولاد بھی اشراف ہے، اس میں یزید بن حکم شاعر تھے۔

حکم کے ایک غلام زیاد نامی تھے جنھوں نے عثمان بن ابو العاصی سے حدیث کی روایت کی ہے اور حضرت حکم کے غزوات و فتوحات کے بعض واقعات بیان کئے ہیں۔

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۳۱، تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۲۹، وکتاب الاغانی ج ۱۲ ص ۲۸۹ (بیروت) [2] فتوح البلدان ص ۳۶۰
[3] الامالی، ابو علی القالی ج ۲ ص ۱۵، [4] الاغانی ج ۳ ص ۵۳، [5] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۵۰۸۔

حضرت مغیرہ بن ابو العاصی ثقفی رضی اللہ عنہ

مغیرہ بن ابو العاصی بن بشر بن عبد دہمان ثقفی، حضرت عثمانؓ اور حکم کے بھائی ہیں ملکی سیاسی معاملات اور مجاہدانہ وفاتحانہ سرگرمیوں میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہے مستقل تذکرہ نہیں مل سکا اور نہ ہی ان کے صحابی رسول ہونے کی تصریح ملی، مگر محدثین کرام نے صحابیت کی شناخت کے لئے جو اصول و قواعد مرتب کئے ہیں ان کی رو سے حضرت مغیرہ ثقفی کا صحابی ہونا لازمی ہے۔ حافظ ابن حجر نے الاصابہ کے مقدمہ میں لکھا ہے[1]

کانوا لا یؤمرون فی المغازی الا الصحابہ فمن تتبع الآثار الواردۃ فی الردۃ والفتوح وجد من ذالک شیئا کثیرا	غزوات میں صرف حضرات صحابہؓ کو امیر بنایا جاتا تھا، جو شخص زمانۂ ارتداد اور فتوحات کے واقعات کی چھان بین کریگا اسے ایسے صحابی بہت زیادہ ملیں گے۔

ایک دوسرے مقام پر ثابت بن طریف مرادی کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

والذین شھدوا الفتوح فی عھد عمر لھم ادراک لکن منھم من لہ صحبۃ ومنھم من لم یصحب	جو لوگ عہدِ فاروقی میں فتوحات میں شریک ہوئے وہ مدرک ہیں، ان میں سے بعض صحابی ہیں اور بعض صحابی نہیں ہیں۔

نیز اصابہ ہی میں ہے:۔

انہ لم یبق قبل حجۃ الوداع احد من قریش وثقیف	حجۃ الوداع سے پہلے قریش اور ثقیف میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں رہ گیا جو اسلام نہ لایا ہو اور سب نے

[1] الاصابہ ج ۱ ص ۶

الا اسلم و کلہم شہد حجۃ الوداع۔	حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکت کی،

ان تمام تصریحات کی روشنی میں حضرت مغیرہؓ کا صحابی ہونا بہت واضح ہو جاتا ہے، وہ عہدِ فاروقی کی عجمی فتوحات میں اپنے بھائیوں کے ساتھ شریک رہے، بلکہ ایک مرتبہ اپنے بھائی عثمانؓ کے نائب کی حیثیت سے بحرین اور عمان دونوں صوبوں کی ولایت (امارت سنبھالی)

بلاذریؒ نے بیان کیا ہے کہ جب عثمانؓ اور حکمؓ دونوں بھائی فارس کی فتوحات میں مصروف تھے تو اس زمانہ میں مغیرہؓ یہاں کے انتظامات سنبھالے ہوئے تھے۔

وکان خلیفتہ علی عمان والبحرین۔ وھو بفارس اخوہ المغیرۃ بن ابی العاصی، ویقال: حفص بن ابی العاصی۔ [۱]	جب عثمانؓ فارس میں تھے تو عمان اور بحرین میں ان کے نائب ان کے بھائی مغیرہؓ تھے۔۔۔ اور ایک قول ہے کہ حفص تھے۔

نیز جیسا کہ معلوم ہو گا عثمانؓ نے مغیرہؓ کو ایک فوج کا امیر بنا کر ہندوستان کے شہر دیبل کی مہم پر روانہ کیا تھا جہاں انھوں نے جہاد کر کے کامیابی حاصل کی، ان دونوں باتوں سے جہاں مغیرہؓ کی صحابیت پر روشنی پڑتی ہے، وہیں ان کی اسلامی خدمات اور دینی سرگرمیوں کا حال معلوم ہوتا ہے، مغیرہ کی وفات بصرہ یا کسی دوسری جگہ ہوئی، بعض اقوال کی بنا پر ان کی وفات فتح دیبل کے موقع پر سندھ میں ہوئی، مگر اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، عثمان نے دوسرے بھائیوں کی طرح مغیرہؓ کو بھی اپنے بصرہ کے علاقہ شطِ عثمانؓ میں ایک قطعۂ زمین جاگیر کے طور پر دی تھی جو مغیرتان کے نام سے مشہور تھی، [۲]

آلِ ابی العاصی میں سے تینوں بھائی عثمانؓ، حکمؓ اور مغیرہؓ ہندوستان میں اسلامی فتوحات

---

[۱] فتوح البلدان صفحہ ۹۳، [۲] " صفحہ ۳۵۶ "

کی طرح ڈالنے والے ہیں اور تینوں نے اس ملک کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمایا ہے، ان کے علاوہ تین بھائی اور ہیں جن کی ہندوستان میں آمد کی روایت نہیں ملتی ہے، ہم ان کے تذکرے بھی درج کرتے ہیں۔

حضرت حفص بن ابو العاصی ثقفی رضی اللہ عنہ ابن سعد نے ان کا ذکر کرکے ان کو شاعر بتایا ہے[۱]۔ ابن حجرؒ نے اصابہ میں ابن سعد کی طبقات صغریٰ کے حوالہ سے ان کو ان صحابہؓ میں شمار کیا ہے جو بصرہ میں آباد ہو گئے تھے، مگر ابن سعد ہی نے طبقات کبریٰ میں لکھا ہے کہ ہمیں حفصؓ کی صحابیت کا ثبوت نہیں ملا۔ پھر حافظ ابن حجرؒ نے اسی دلیل سے ان کو صحابی مانا ہے کہ حجۃ الوداع سے پہلے قریش اور ثقیف کا کوئی شخص ایسا نہیں رہ گیا جو اسلام نہ لایا ہو، اور یہ سب حجۃ الوداع میں حاضر تھے۔

وھذا القدر کافٍ فی ثبوت صحبۃ ھذا۔[۲]	اور اسی قدر حفصؓ کی صحابیت کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

ذہبی نے تجرید اسماء الصحابہ میں لکھا ہے:۔

روی عن عمرؓ وقیل: لہ صحبۃ۔[۳]	حفصؓ نے حضرت عمرؓ سے روایت کی ہے اور ان کا صحابی ہونا بیان کیا گیا ہے۔

حضرت عمرؓ اور حفصؓ میں تعلقات نہایت خوشگوار و استوار تھے، کہنا چاہیئے کہ دونوں حضرات ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے، اصابہ میں ہے کہ حضرت حفص بن ابو العاصیؓ حضرت عمرؓ کے ساتھ کھانے پر رہا کرتے تھے[۴] بڑے رعب و داب اور عزم و ارادہ کے مرد تھے ایک موقع پر بلاذریؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے وکان جزلاً یعنی بہت بہادر آدمی تھے۔ حضرت حفصؓ بھی ملکی اور سیاسی سرگرمی کے ساتھ علم دین سے حصۂ وافر رکھتے تھے، ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حفصؓ کا صحابی ہونا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرنا ہمارے نزدیک محقق نہ ہو سکا، البتہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ

[۱] طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۴۱، [۲] الاصابہ ج ۲ ص ۲۴۳، [۳] تجرید اسماء الصحابہ ج ۱ ص ۱۴۳ [۴] الاصابہ ج ۲ ص ۲۴

سے حدیث کی روایت کی ہے، ؎۱ اور حسب تصریح ذہبی انھوں نے حضرت عمرؓ سے بھی روایت کی ہے اور ان سے حسنؒ بصری نے روایت کی ہے، ان کے ایک صاجزادے عثمان بن حفص کا نام اور حال معلوم ہو سکا ہے، حضرت حفص بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ بصرہ میں مقیم ہو گئے تھے اور عثمانؓ نے ان کو بھی اپنے علاقے سے حفصان نامی قطعۂ زمین جاگیر میں دی تھی۔ ؎۲

حضرت ابو اُمیّہ بن ابو العاصی ثقفی	جمہرۃ انساب العرب میں آپ کا نام امیّہ ہے۔ ؎۳ مگر

فتوح البلدان اور کتاب المحبّر میں ابو امیہ ہے، ؎۴ ان کا تذکرہ نہ مل سکا، عثمانؓ نے ان کو بصرہ کی جاگیر سے ابیتان نامی قطعۂ زمین دیا تھا۔

حضرت ابو عمرو بن ابو العاصی ثقفی	کتاب المحبّر میں صرف ان کا نام مل سکا اور فتوح البلدان میں

ہے کہ بصرہ میں نہر الارحاد (پن چکیوں کی نہر) ان کے نام سے مشہور تھی،

بابہ بنت ابو العاصی ثقفیہ	چھ بھائیوں میں ایک بہن تھیں، یہ بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ بصرہ

میں رہتی تھیں، اور ان کے بھتیجے زیاد بن عثمانؓ ثقفی کے گھر سے جو خطہ متصل تھا اسی کے سامنے بابہ کا گھر تھا۔ (فتوح البلدان ص۳۴۷)

؎۱ طبقات ابن سعد ج ۷، ص۴۲ ؎۲ فتوح البلدان ص۳۵۶ ؎۳ ص۲۶۶ ؎۴ فتوح البلدان ص۳۵۶ و المحبّر ص۲۶۴

ہندوستان میں غزوات و فتوحات

حضرت عثمان بن ابو العاصی رض اور ان کے بھائی حضرت حکم بن ابو العاصی سے پہلے بحرین کے حاکم حضرت علاء بن حضرمی رض تھے جو عہدِ رسالت سے عہدِ صدیقی تک اپنے منصب پر رہے، اس زمانہ میں عمان کے امیر حضرت حذیفہ بن محصن رض تھے، حضرت عمر رض نے اپنی خلافت کے دوسرے سال ۱۵ھ میں ان دونوں حضرات کو ہٹا کر عمان اور بحرین دونوں صوبوں کی حکومت عثمان رض کو دیدی، انھوں نے حالات کے پیشِ نظر عمان کی حکومت سنبھالی، اور بحرین پر اپنے بھائی حکم کو مقرر کیا، حضرت علاء بن حضرمی رض نے اپنی امارت کے آخری ایام میں ۱۴ھ میں حضرت ہرثمہ بن عرفجہ بارقی ازدی رحمۃ اللہ کو بلادِ ایران کی مہم پر روانہ کیا اور انھوں نے ایک جزیرہ فتح کیا[1] مگر اسی دوران میں بحرین کے انتظام میں تبدیلی عمل میں آئی اور علاء بن حضرمی وہاں سے جدا ہو گئے، حضرت علاء کی زندگی بحرین میں قتالِ مرتدین اور ایرانیوں سے چھیڑ چھاڑ میں گذری تھی۔ اب ان کی تلوار عرب سے نکل کر عجم میں اپنے جوہر دکھانا چاہتی تھی نیز ۱۶ھ میں حضرت سعد بن ابی وقاص رض نے قادسیہ کی جنگ میں ایرانیوں کے مقابلہ میں فتحِ مبین پائی تھی اور مجاہدین اسلام اور عام مسلمانوں میں نیا جوش پیدا ہو گیا تھا اس لئے حضرت علاء رض نے بھی ۱۷ھ میں حضرت عمر رض کی مرضی و اطلاع کے بغیر ایک بھاری جمعیت لیکر بصرہ سے فارس پر حملہ کر دیا، دوسری طرف ۱۵ھ کے آخر یا ۱۶ھ کے شروع میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رض نے بھی ایران کا شہر سوق اہواز فتح کیا۔

ان ہی عجمی غزوات و فتوحات کے عین شباب میں حضرت عثمان ثقفی اور ان کے بھائی حضرت حکم ثقفی رض عمان اور بحرین کے حاکم و امیر بنا کر بھیجے گئے، انھوں نے بھی دونوں صوبوں کے

[1] فتوح البلدان ص ۴۳۷۔

حالات تیزی سے درست کر کے ایرانی مہمات میں حصہ لینا شروع کردیا اور مقام توّج کو فوجی مستقر بنا کر یہیں سے ایران اور ہندوستان کا رُخ کیا، چونکہ خلافت کے نقطۂ نظر سے ابھی ایران سے براہِ سمندر جنگ کا موقع نہیں آیا تھا اور حضرت عمرؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے طریقِ کار کے پیشِ نظر بحری مہمات پر ابتک راضی نہیں تھے، اس لئے حضرت عثمانؓ نے خلافت کی مرضی و اطلاع کے بغیر یہ مہم جاری کردی یہاں تک کہ ۱۹ھ میں حضرت عمرؓ بحری مہم کی روانگی پر راضی ہو گئے اور ۲۱ھ میں باقاعدہ منظم بحری مہماتِ فارس میں روانہ کی گئیں، مگر اس سے پہلے ہی حضرت عثمانؓ نے اپنی طرف سے بحری مہم شروع کردی تھی، جس میں انھوں نے ہندوستان میں بھی جہاد کیا اور فتوحات حاصل کیں، اور تینوں بھائی عثمان، حکم اور مغیرہ یہاں کے مجاہدینِ اسلام کے اُسوہ بنے، پھر ۲۱ھ کے بعد جب باقاعدہ بحری مہم کا آغاز ہوا تو خلافت کے اذن و مرضی سے یہاں دوبارہ مجاہد و فاتح بنکر آئے، ہم ہندوستان کی ابتدائی فتوحات کی روایات کو پیش کرتے ہیں۔

علامہ بلاذری کا بیان | علامہ ابوالحسن احمد بن یحییٰ بلاذری بغدادی متوفی ۲۷۹ھ اسلامی فتوحات کے زبردست عالم اور مستند مؤرخ ہیں، بعد کے علماء اور مورخین نے ان کی کتابوں اور روایتوں سے بکثرت استفادہ کیا ہے۔ وہ اپنی مشہور کتاب فتوح البلدان میں فتوح السند کے عنوان سے بنو ابی العاصی ثقفی کی ابتدائی فتوحات کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

وولی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ عثمان بن ابی العاصی الثقفی البحرین وعمان سنۃ خمس عشرۃ، فوجّہ اخاہ الحکم الی البحرین، ومضیٰ الی عمان،

حضرت عمرؓ نے جب ۱۵ھ میں عثمان بن ابو العاصی ثقفیؓ کو بحرین و عمان کا حاکم و امیر مقرر کیا تو عثمان نے اپنے بھائی حکم کو بحرین بھیجا، اور خود عمان پہونچکر ایک لشکر تھانہ روانہ کیا، جب یہ لشکر واپس آیا تو عثمانؓ نے خط لکھ کر حضرت عمرؓ کو اس کی خبر دی، حضرت عمرؓ نے لکھا کہ اے ثقفی تو نے کیڑے کو لکڑی پر سوار

فاقطع جیشا الی تانہ، فلما رجع الجیش کتب الی عمرؓ یعلمہ ذلک فکتب الیہ عمرؓ: یا اخا ثقیف! حملت دودًا علی عودٍ، وانی احلف باللہ ان لو اصیبوا لاخذتُ من قومک مثلھم[1] ووجہ اخاہ الحکم ایضاً الی بروص ووجہ اخاہ المغیرۃ بن ابی العاص الی خور الدیبل فلقی العدو فظفر	کر کے دریا کے حوالہ کر دیا، خدا کی قسم اگر مسلمانوں کا نقصان ہوا تو میں تمہاری قوم سے ایک ایک کا بدلہ لوں گا، نیز عثمانؓ نے حکمؓ کو بھڑوچ کی طرف روانہ کیا، اور اپنے دوسرے بھائی مغیرہؓ کو دیبل بھیجا، جہاں انھوں نے دشمن سے مقابلہ کر کے فتح حاصل کی۔

بلاذری کا یہ بیان بہت مجمل اور مختصر ہے مگر بعد کے بیانات کے مقابلہ میں مفصل ہے۔ اور اس سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں،

(۱) سب سے پہلے عثمانؓ کی امارت کے ابتدائی ایام میں ہندوستان کے تین ساحلی مقامات پر مجاہدینِ اسلام کی تشریف آوری ہوئی اور یہ تینوں مہمات عثمانؓ کے زیرِ انتظام عمل میں آئیں۔ (۲) عثمانؓ نے اپنے دونوں بھائیوں کو تھانہ (متصل بمبئی) بھروچ (گجرات) اور دیبل (متصل کراچی) فوجی مہم کے ساتھ روانہ کیا، مگر اُن کا کسی میں شریک ہونا اس روایت سے معلوم نہیں ہوتا، (۳) حضرت عثمانؓ کا یہ اقدام حضرت علاء بن حضرمی کی طرح تھا اور دربارِ خلافت کے مشورہ اور مرضی سے نہیں ہوا تھا بلکہ اپنی صوابدید سے رضاکارانہ طور پر تھا (۴) یہ تینوں فوجی مہمات ۱۵ھ اور ۲۱ھ کے درمیان میں روانہ کی گئی تھیں اور ابتک حضرت عمرؓ بحری مہم کے خلاف تھے پھر ۲۳ھ میں بلادِ فارس پر متعدد بحری مہمات روانہ کی گئیں، جن میں سے ایک مکران بھیجی گئی۔

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۳۲۔

یعقوبی کا بیان احمد بن یعقوب بن جعفر بن وہب بن واضح یعقوبی بھی بلاذری کی طرح عباسی دَور کا مشہور میر منشی ہے، اس نے اپنے زمانہ کی فتوحات وامارات کو سنوار اور ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے جمادی الاولیٰ ۱۳ھ میں (بعہدِ صدیقی) غزوۂ اجنادین کے ذکر کے بعد لکھا ہے۔

وبعث ابوبکر عثمان بن ابی العاصی، وندب معہ عبد القیس فسار فی جیش الی توّج فافتتحہا وسبیٰ اہلہا وافتتح مکران ومایلیہا۔[۱]

حضرت ابوبکرؓ نے عثمان بن ابو العاصی کو قبیلہ عبد القیس کی جمعیت کے ساتھ جہاد کے لئے روانہ کیا، انھوں نے توّج کو فتح کر کے وہاں کے باشندوں کو قیدی بنایا، اور مکران اور اس کے اطراف کو بھی فتح کیا۔

تعجب ہے کہ یعقوبی نے فتحِ مکران کے واقعہ کو کیسے عہدِ صدیقی میں بیان کیا ہے۔ جب کہ ایران تک میں اسلامی فتوحات کی ابتدا بھی نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایرانیوں سے صرف چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی اور بنی بکر بن وائل کے دو افراد ایرانی حدود میں جاکر ابتری پھیلاتے اور پھر صحراء میں چلے آتے تھے، ایک حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی جو حیرہ کی طرف سے ایران پر حملہ آور ہوتے، اور دوسرے حضرت سوید بن قطبہ عجلی جو اُبلہ کی طرف سے یلغار کرتے تھے[۲] اس کے بعد عہدِ فاروقی میں ایران سے باقاعدہ جنگ کا سلسلہ جاری ہوا، علامہ ابن اثیر نے حضرت صعب بن جثامہ لیثی کے ذکر میں لکھا ہے۔

واین فتح فارس من خلافۃ ابی بکر، فتحت فارس ایام عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ[۳]

فارس کی فتح خلافت صدیقی میں کہاں ہوئی، فارس تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فتح ہوا۔

نیز حضرت عثمان ثقفی پورے عہدِ صدیقی میں طائف کی امارت سے علیحدہ نہیں ہوئے، اور نہ ہی کسی غزوہ میں شریک ہوئے، اور عہدِ فاروقی میں ۱۵ھ کے بعد سے ان کی سرگرمیاں

---

[۱] تاریخ یعقوبی ج ۲ صہ ۱۵۱ (لیڈن) [۲] الاخبار الطوال صہ ۱۱۱، [۳] اسد الغابہ ج ۳ صہ ۲

شروع ہوئیں، لہٰذا اس عبارت میں "ابوبکرؓ" کی جگہ "عمرؓ" ہونا چاہئے، نیز اس کا تذکرہ عہدِ فاروقی میں ۲۳ھ میں یا اس کے بعد ہونا چاہئے۔ باقی رہا یعقوبی کا اس بیان میں "مکران وما یلیھا" کہنا تو اس کی توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ عثمانؓ اپنے دارالامارت عمان سے آگے بڑھ کر مکران آئے، جو سندھ اور دیبل سے متصل ہے، اور یہاں سے مکران اور اس کے اطراف یعنی سندھ وغیرہ میں جہاد کیا، ویسے مکران پر باقاعدہ سرکاری مہم ۲۳ھ میں حضرت حکمؓ بن عمرو تغلبی کی قیادت میں آئی تھی۔ یعقوبی کے اس بیان میں خود حضرت عثمانؓ ثقفی کے مکران وغیرہ میں آنے کی تصریح ہے، البتہ زمانہ کی تعیین صحیح نہیں ہے۔

امام ابن حزم رح کا بیان امامؒ ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم اندلسی متوفی ۴۵۶ھ اسلامی علوم وفنون کے بحرِ زخار ہیں، تاریخ وانساب میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے ہیں، وہ جمہرۃ انساب العرب میں لکھتے ہیں:۔

وعثمان منھم من خیار الصحابۃ ولاہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الطائف، وغزا فارس، وثلاثۃ من بلاد الھند، ولہ فتوح، لہ	بنو ابی العاص ثقفی میں عثمان بہترین صحابہؓ ہیں، ان کو رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم نے طائف کا امیر بنایا تھا، انھوں نے فارس میں اور ہندوستان کے تین شہروں میں جہاد کیا، اور ان کی بہت سی فتوحات ہیں۔

علامہ ابن حزم نے قبیلۂ ثقیف کے انساب کے بیان میں عثمانؓ ثقفی کے بارے میں یہ تصریح کی کہ انھوں نے ہندوستان کے تین شہروں میں جہاد کیا ہے۔ یہ وہی تینوں بلاد وامصار ہیں جن کے نام بلاذری رحمہ نے صراحت کے ساتھ درج کئے ہیں، یعنی تھانہ، بھروچ اور دیبل، ابنِ حزم کے اس بیان سے جو سب سے اہم اور خاص بات معلوم ہوتی ہے وہ عثمانؓ ثقفی کا ان تینوں غزوات میں موجود ہونا ہے، اس اعتبار سے یعقوبی کے الجھے ہوئے بیان کے مقابلے میں یہ مختصر بیان بڑے کام کا ہے۔

لہ جمہرۃ انساب العرب ص۲۶۶

علی بن حامد کوفی کا بیان | شیخ علی بن حامد بن ابو بکر اوچی کوفی نے ۶۱۳ھ میں الور کے قاضی کے آبا و اجداد کی تاریخ التسند کے اجزا سے اپنی کتاب چچ نامہ مرتب کی جس میں حضرت محمد بن قاسم کی فتوحات کا تفصیلی ذکر ہے، ابتدا میں انھوں نے حضرت عثمان ثقفی اور ان کے بھائیوں کی فتوحات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے :-

"اول غزو لشکر اسلام کہ ببلاد ہند و سند نامزد شد، در خلافت امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بود، بعد از ہجرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بپانزدہ سال، اوّل عثمانؓ بن ابی العاصی الثقفی را بہ بحرین فرستاد، واو بالشکر بسوئی عمان روان شد، وکشتیہا با حشم از راہِ دریا نصب فرمود، و مغیرہؓ بن ابو العاص برسر آں لشکر بہ بحرین فرستاد، تا از آں راہ بہ دیبل رَوَد، دوران عہد رائے سند چچ بن سیلائج بود، سی و پنج سال بر ملک او گذشتہ بود، و اہلِ دیبل مردمانِ تجار بودند، وبجہت چچ رائے ملکے بود، نامِ او سامہ بن دیوائج، چوں لشکر بہ دیبل رسید از حصار بیروں آمد، و جنگ پیوست، پس مردے بود از ثقفیانِ او حکایت کرد کہ چوں لشکرہا مقابل شدند، مغیرہ بن ابی العاصی تیغ برکشید و می گفت "بسم اللہ و فی سبیل اللہ" تا شہید شد" [1]

اس بیان میں صرف مغیرہؓ بن ابو العاصی کے دیبل روانہ کرنے کی تصریح ہے، حکمؓ بن ابو العاصی یا خود عثمانؓ بن ابو العاصی کے تھانہ، بھڑوچ اور دیبل آنے کا اشارہ بھی نہیں ہے، چونکہ چچ نامہ سندھ کی اسلامی فتوحات کی تاریخ ہے اس لئے اس میں صرف سندھ کے شہر دیبل کی فتح کا تذکرہ آیا، تھانہ اور بھڑوچ کا تعلق سندھ سے نہیں ہے، اس بیان میں حضرت مغیرہؓ کے غزوۂ دیبل میں شہید ہونے کی تصریح خلاف واقعہ ہے۔ بلاذریؒ کا بیان گذر چکا ہے جس میں ہے کہ مغیرہ نے دشمن سے مقابلہ کر کے فتح پائی تھی۔

---

[1] چچ نامہ ص۷۲ و ۷۳۔

یاقوت حموی کا بیان | علامہ ابوعبداللہ یاقوت بن عبداللہ حموی بغدادی متوفی ۶۲۶ھ مشہور جغرافیہ نویس ہیں، انھوں نے معجم البلدان میں پورے عالمِ اسلام کے بلاد و امصار کے حالات اور اکثر کے فتوحات درج کئے ہیں، خور دیبل کے بیان میں لکھا ہے:۔

خور الدیبل من ناحیۃ السند، والدیبل مدینۃ علی ساحل بحر الھند، ووجہ الیہا عثمان بن ابی العاصی اخاہ الحکم ففتحہ۔[1]	دیبل کی کھاڑی سندھ کی سمت واقع ہے، اور خور دیبل بحرِ ہند کے کنارے ایک شہر ہے، عثمانؓ بن ابوالعاصی نے اپنے بھائی حکمؓ کو یہاں جہاد کے لئے بھیجا اور انھوں نے اسے فتح کیا۔

یاقوت نے صرف دیبل میں ثقفی جہاد کا ذکر کیا ہے، مگر یہاں پر مغیرہؓ کے بجائے حکمؓ کا نام لیا ہے۔ ۲۳ھ کے بعد حکمؓ مکران کی جنگ میں آئے ہیں، مگر اس وقت عثمان ثقفیؓ نے ان کو نہیں بھیجا تھا، اور پھر وہ دیبل کی جنگ نہیں تھی، اس لئے معجم البلدان کی اس عبارت میں ہمارے نزدیک کتابت میں سہو واقع ہوگیا ہے اور مغیرہؓ کے بجائے حکمؓ غلطی سے لکھ گیا ہے۔

امام ذہبیؒ کا بیان | امام ابوعبداللہ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان ذہبی متوفی ۷۴۸ھ نے اپنی کتاب تاریخ الاسلام و طبقات المشاہیر والاعلام میں ۲۳ھ کے واقعات میں لکھا ہے،

وفیھا فتحت مکران، وامیرھا الحکم اخو عثمانؓ وھی بلاد جبل۔[2]	۲۳ھ میں مکران فتح ہوا، اس غزوہ میں امیر عثمانؓ کے بھائی حکمؓ تھے۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے۔

اس روایت سے یہ نئی حقیقت سامنے آئی کہ حکمؓ نے کم از کم ہندوستان میں تین مرتبہ جہاد کیا ہے اور تینوں مرتبہ وہ اسلامی لشکر کے امیر تھے، پہلی بار عثمانؓ نے ان کو تھانہ کی مہم پر روانہ کیا، پھر دوسری بار عثمانؓ ہی نے ان کو بھروچ پر جہاد کے لئے بھیجا، جیسا کہ بلاذریؒ نے بیان کیا ہے، اور حکمؓ کی یہ دونوں فتوحات ۱۵ھ اور ۲۳ھ کے درمیان

---

[1] معجم البلدان ج ۳ ص ۴۸۱

[2] تاریخ الاسلام ج ۲ ص ۳۴ (قاہرہ) اصل عبارت میں "حکم بن عثمان" غلط چھپ گیا ہے۔

میں تھیں، پھر تیسری بار ۲۳ھ میں وہ مکران میں جہاد کے لئے امیر بن کر آئے، جب کہ حضرت عمرؓ کی طرف سے باقاعدہ بحری مہمات کی اجازت دیدی گئی تھی، واضح ہو کہ ۲۳ھ میں سرکاری طور سے لوارِ مکران حضرت حکمؒ بن عمرو ثعلبی رضؓ کو عنایت ہوا تھا اور انھوں نے یہاں فتوحات حاصل کی تھیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی سال حکم بن ابو العاصی نے بھی مکران میں جہاد کیا جس کا تعلق حضرت حکم بن عمرؓو ثعلبی کے جہاد سے نہیں تھا۔

امام ابنِ کثیرؒ کا بیان | امام ابو الفدا، عماد الدین اسمٰعیل بن کثیر دمشقی متوفی ۷۷۴ھ نے البدایہ و النہایۃ میں لکھا ہے :-

وقال شیخنا ابو عبد اللہ الذہبی فی تاریخہ فی سنۃ ثلاث وعشرین: وفیھا فتحت مکران وامیرھا الحکم بن ابی العاص، اخو عثمان، [1]	ہمارے استاذ امام ذہبیؒ نے تاریخ الاسلام میں ۲۳ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ اس سال مکران فتح ہوا، اور اس میں امیر لشکر عثمانؓ کے بھائی حکمؒ بن ابو العاصی تھے۔

استاذ اور شاگرد دونوں کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۳ھ میں مکران کی دوسری جنگ تھی، جس میں لوارِ مکران حکمؒ بن عمرو ثعلبی کے بجائے حکم بن ابو العاصی کے ہاتھ میں تھا، اور وہی اس جہاد میں امیر لشکر تھے۔

ایک معاصر مؤرخ کا بیان | عہدِ فاروقی میں ہندوستان میں بنو ابی العاصی ثقفی کی فتوحات کا تذکرہ ہمارے زمانہ کے بعض عرب مؤرخوں نے بھی کیا ہے، جن میں ایک عالم علاقہ بحرین یعنی احسا کے باشندے الاستاذ محمد بن عبد اللہ آل عبد القادر الانصاری الاحسائی ہیں انھوں نے بلاذری کے حوالہ سے تاریخ الاحساء (تحفۃ المستفید بتاریخ الاحساء فی القدیم والجدید) میں لکھا ہے کہ عثمان بن

[1] البدایہ والنہایۃ ج ۷، ص ۱۴۱ (مصر)

ابوالعاصی نے بنو عبد القیس کی ایک فوج بمبئی کے قریب نانہ (بالتنوین) بھیجی۔ واپسی پر حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی تو آپ بہت خفا ہوئے، کیونکہ آپ اپنی فوجوں کو ایسی مہمات پر بھیج کر تکلیف دینا نہیں چاہتے تھے، جن میں اسلامی فوج کی خبر اُن کو نہ پہنچ سکے، بنو عبد القیس نے پے در پے بحرِ ہند کے سواحل پر حملے کئے اور جزیرۂ سیلان کو فتح کیا جسے بلاد یاقوت بھی کہتے ہیں۔[1]

اس بیان میں نانہ صحیح نہیں ہے بلکہ یہ لفظ تانہ ہے جو تھانہ کا معرب ہے، عام کتابوں میں یہ لفظ اسی طرح ہے، معلوم نہیں کیسے اس معاصر احسائی مورخ نے نانہ لکھدیا ہے۔ اس بیان میں تصریح ہے کہ اس مہم میں بنو عبد القیس کے افراد تھے۔ اس سلسلہ میں سیلون کی فتح ہمارے لئے نئی معلومات ہے، کاش وہ اس کا حوالہ بھی دیتے،

ان فتوحات کے زمانہ کی تعیین جیسا کہ گذر چکا ہے تھانہ، بھڑوچ اور دیبل کی یہ مہمات ۱۵ھ اور ۲۳ھ کے درمیان میں روانہ کی گئیں، عثمانؓ اور حکمؓ کی مجاہدانہ سرگرمی کی ابتداء ۱۹ھ سے شروع ہوتی ہے، بلاذری[2] کے بیان کے مطابق اسی سال عثمان نے بلادِ فارس پر فوج کشی کر کے مقام توج پر قبضہ کیا اور وہاں عبد القیس وغیرہ کو آباد کر کے مسجدیں تعمیر کیں اور اسی فوجی مرکز سے اطراف و جوانب میں فوج کشی شروع کی۔[2] خلیفہ بن خیاط کے بیان کے مطابق ذوالحجہ ۱۹ھ میں حضرت حکم بن ابوالعاصی کی امارت و قیادت میں فارس کے مقام صہاب پر مہم کشی ہوئی، اور اسی سال عثمانؓ اور حکمؓ دونوں بھائیوں نے ریشہر کو فتح کیا اور توج کو اسلامی فوج نے آباد کر کے اسے فوجی چھاؤنی بنایا۔[3] ہو سکتا ہے کہ اسی زمانہ میں ہندوستان میں فتوحات ہوئی ہوں، مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۱ھ میں یہ واقعہ پیش آیا، خلیفہ بن خیاط نے لکھا ہے کہ اس سال (یعنی ۲۱ھ) میں، عثمان بن ابی العاصی نے توج کے فوجی مرکز سے ساحلی علاقوں پر مہمات روانہ کیں،

(و اغار عثمان علی سیف البحر والسواحل) عثمان نے سواحل سمندر پر یلغار کی

۱؎ تاریخ الاحساء قسم اول ص۱۷ (ریاض) ۲؎ فتوح البلدان ص۳۶۹

۳؎ تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ۱، ص۱۳۳ و ص۱۳۵ (دمشق)

نیز لکھا ہے کہ اسی سال جبکہ مسلمانوں نے اصطخر کا محاصرہ کیا تھا، حضرت ابو موسیٰ اشعری نے اسلامی لشکر کو حضرت عمرؓ کا یہ فرمان سنایا:۔

من عبد اللہ عمرؓ امیر المؤمنین الی عثمان بن ابی العاصی سلام علیک اما بعد فانی قد امددتک بعبد اللہ بن قیس فاذا التقیتما فعثمانؓ الامیر و تطاوعا۔ والسلام	اللہ کے بندے مسلمانوں کے امیر عمرؓ کی طرف سے عثمانؓ بن ابو العاصی کے نام، السّلام علیکم، اما بعد: میں نے عبد اللہ بن قیسؓ (ابو موسیٰ اشعری) کو تمہاری مدد کے لئے بھیجا ہے، جب تم دونوں ملو تو عثمانؓ امیر ہونگے اور ایک دوسرے کی اطاعت کرو۔ والسلام

اس کے بعد جب اصطخر کا محاصرہ بہت طول پکڑ گیا تو عثمانؓ نے ابو موسیٰؓ اشعری سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے اطراف میں جو نواحی اور علاقے واقع ہیں ان کی طرف امراء لشکر کو بھیجوں تاکہ وہ ان پر یلغار کریں اور جو چیز ان کو وہاں سے ملے وہ تمام لشکر میں تقسیم کردیں، جو اصطخر شہر کے محاصرہ کئے ہوئے ہے، ابو موسیٰؓ نے کہا کہ میں تقسیم کو مناسب نہیں سمجھتا بلکہ جو چیز امراء کو ملے وہ ان ہی کی ہو، عثمانؓ نے کہا کہ اگر میں ایسا حکم کردوں تو اس شہر کے محاصرہ کے لئے کوئی شخص نہیں رہ جائے گا، بلکہ سب کے سب نکل جائیں گے اور غنیمت لے کر لوٹیں گے، اس کے بعد تمام مسلمانوں نے حضرت عثمان کی رائے پر اتفاق کیا [1]

بہت ممکن ہے کہ اس سال عثمان نے جو توج کے مرکز سے ساحلی علاقوں پر یلغار کرائی۔ اسی میں ہندوستان پر حملہ ہوا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اصطخر کے محاصرہ کے ایام میں امراء لشکر نے حضرت عثمانؓ کی رائے کے مطابق جو اطراف و جوانب پر حملے کئے تھے اور غنیمت حاصل کی تھی ان میں یہاں کی فتوحات بھی شامل ہوں۔

حضرت عثمانؓ مقام توج کو فوجی مستقر بنانے کے بعد گرمی کے موسم میں اطراف و جوانب میں جہاد کرتے تھے اور جاڑے کے موسم میں توج آجاتے تھے، اسی طرح وہ حضرت عمرؓ

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ۱ ص ۱۴۵ و ص ۱۴۶ [2] ص ۱۵۱ ج ۱۔

اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جہاد کرتے تھے، [1] اس لئے ان کے زمانہ میں ہندوستان کی فتوحات بھی گرمی کے موسم میں ہوئی تھیں۔

اس جہاد کے سیاسی اور دینی اسباب ہندوستان میں ان فتوحات کی سیاسی وجہ یہ تھی کہ مکران سے سرندیپ تک کے پورے ساحلی علاقے اور ان کے راجے، مہاراجے ایرانی سلطنت کے ماتحت اور زیر اثر تھے، اور یہاں کے جاٹ (زط) وغیرہ ایرانی فوج میں شامل ہو کر مسلمانوں سے جنگ کرتے تھے، بلکہ ان ہندوستانیوں کے ذریعہ عرب کے سواحل پر بھی ایرانی اثر کام کر رہا تھا، ایرانیوں سے جنگ کی صورت میں مسلمانوں کے لئے ضروری تھا کہ ان کے ان مددگاروں سے نبٹا جائے تاکہ ان کو ہندوستان سے فوجی اور مالی امداد نہ مل سکے

امام طبری نے لکھا ہے کہ ۱۷ھ میں جب علاؑ بن حضرمی نے فارس پر حملہ کیا اور ایرانیوں نے اسلامی فوج کو اپنے محاصرہ میں لے لیا تو حضرت عمرؓ نے بصرہ سے مسلمانوں کے لئے مدد بھیجی اور اسلامی فوج صحیح وسلامت واپس آئی، اس کے بعد ایرانیوں نے اپنے بادشاہ سے خط وکتابت کی، وہ اس زمانہ میں مرو میں تھا، اس کو ایرانیوں نے جوش دلایا اس نے باب، سندھ، خراسان، حلوان وغیرہ سب جگہ کے عوام کو ابھارا، پھر کیا تھا انھوں نے آپس میں چھیڑا ؤں کیا اور ۲۱ھ میں نہاوند کی جنگ میں جمع ہوئے (۱) نیز اس سے پہلے عہد صدیقی میں ہندوستان کے سیابجہ اور جاٹوں نے بحرین میں مرتدوں کے سردار حطم بن ضبیعہ کی معیت میں اسلامی فوج سے باقاعدہ مقابلہ کیا تھا، اور شکست کھانے کے بعد ہندوستان بھاگ آئے تھے، اسی طرح یمامہ میں مرتدوں نے ان ہندوستانیوں کی ہندی تلواریں استعمال کی تھیں، ان اسباب کی بنا پر مسلمانوں نے ایران کی جنگ میں ہندوستان کے ان ساحلی علاقوں کو بھی اپنے حربی نقشہ میں رکھ لیا جہاں سے مسلمانوں کے خلاف ایرانیوں کو مدد ملتی تھی۔ اور اس کی دینی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو اللہ کا دین پھیلانا تھا، رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ۱ ص ۱۵۱۔ [2] تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۲

علیہ وسلم نے ہندوستان میں جہاد کرنے والی جماعت کو نارِ جہنّم سے آزادی کی بشارت دی تھی، حضرت ابوہریرہؓ نے ہندوستان کے جہاد میں شریک ہونے کی خواہش کی تھی، اور مسلمان اس وقت کے منتظر تھے کہ کب اسلام کی دولت سے ہندوستان کو بھی حصہ ملے، جہاں سے ان کے تجارتی اور معاشی تعلقات بہت قدیم تھے، وہ اپنی متاعِ دین و ایمان ہندوستان کے بازار میں جلد سے جلد لانا چاہتے تھے، تاکہ یہاں کی سعید روحیں اس روحانی سودے کو بھی خرید سکیں۔

اس جہاد میں شریک ہونے والے قبائل ان فتوحات میں قبیلۂ ثقیف کے علاوہ بحرین اور عمان کے بنو عبد القیس، بنو تمیم، بنو ازد، بنو بکر بن وائل اور بنو ناجیہ کا عنصر غالب تھا، خاص طور سے عبد القیس کے افراد اسلامی لشکر میں بہت زیادہ تھے، طبری اور ابن اثیر نے لکھا ہے کہ ۱۹ھ میں جب عثمانؓ یا حکمؓ نے توج پر پہلی بحری مہم روانہ کی تو ان کے لشکر میں بنو عبد القیس، بنو ازد، اور بنو ناجیہ کے لوگ شامل تھے، ابن اثیر نے اس فوج کی تعداد دو ہزار بتائی ہے، نیز توج میں جن مسلمانوں کو آباد کیا گیا تھا، ان میں بھی عبد القیس کے گھرانے زیادہ تھے، ظاہر ہے کہ ہندوستان کی فتوحات ایرانی سلسلۂ فتوحات کی کڑیاں تھیں اور ان میں بھی وہی لوگ شریک رہے ہوں گے جو توج کی فوج میں تھے۔

یہ جہاد فدائیانہ اور رضا کارانہ تھا ہندوستان پر مسلمانوں کے ان ابتدائی بحری حملوں کی حیثیت فدائیانہ اور رضا کارانہ تھی، اور عثمانؓ و حکمؓ دونوں بھائیوں نے اپنے طور پر یہاں لشکر اسلام بھیجا تھا، ان کے بارے میں مرکزِ خلافت سے کوئی ہدایت نہیں تھی حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر بھی نہیں تھی، حضرت عمرؓ اب تک بحری مہمات کے خلاف تھے، اس کے لئے ۱۵ھ میں مشورہ ہوا اور حضرت عمرؓ راضی ہوئے مگر عملی طور سے ۲۳ھ میں بحری مہمات کا سلسلہ شروع ہوا چنانچہ اسی سال مکران پر بھی سرکاری طور سے حملہ کیا گیا۔

شطِ عثمانؓ بصرہ میں مستقل سکونت

حضرت عثمانؓ بن ابو العاصی اور ان کے بھائی حکم اور مغیرہ رضی اللہ عنہم ۱۵ھ سے ۲۳ھ سے بحرین وعمان کے مشرقی مرکز اور محاذ سے امارات وغزوات کی خدمت انجام دے کر ہندوستان، خراسان اور فارس کے مختلف بلاد و امصار میں اسلامی سرگرمی دکھاتے رہے، حتّٰی کہ ۲۴ھ میں حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت حکم ثقفی رہ کو معزول کر کے ان کی جگہ عبید اللہ بن زیاد کو مقرر کیا، اور ۲۹ھ میں حضرت عبداللہ بن عامر بن کریز رہ کو بصرہ کا امیر اور فارس کی مہمات کا ذمہ دار بنا کر حضرت عثمان ثقفی رہ کو سبکدوشی دی، اس کے بعد بنو ابی العاصی نے بصرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی، اور طائف و مدینہ کی زمین و مکان کے عوض اور اپنی خدمات کے صلہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے بہت بڑی جاگیر حاصل کر کے اسی میں فارغ البالی اور خوشحالی کی زندگی بسر کی، آگے چل کر خانوادۂ آلِ ابی العاصی پر کئی پشت تک عزت و شہرت، مال و دولت، اور نیک نامی و ناموری کا سایہ رہا۔

شطِ عثمانؓ کی جاگیر بصرہ میں جس مقام پر یہ خانوادہ قیام پذیر ہوا، اس کا نام شطِ عثمانؓ ہو اس طرف شہر کا جو دروازہ تھا اس کا نام بابِ عثمان تھا۔ علامہ ابن عبد البر اور علامہ ابن قتیبہ کی تصریح کے مطابق حضرت عثمانؓ نے عثمانؓ ثقفی کو بصرہ میں بارہ ہزار جریب (بیگھ) از زمین جاگیر کے طور پر دی تھی۔ [1]

علامہ بلاذری ؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے عثمان ثقفی رہ کے مدینہ منورہ کے مکان کو لے کر اپنے عامل عبداللہ بن عامر کو لکھا کہ ان کو بصرہ میں زمین دیجئے،

---

[1] الاستیعاب بذیل اصابہ ج۲ ص۹۲، وکتاب المعارف ص۱۱۱۔ [2] (ساحل عثمان)

چنانچہ شطِ عثمان نامی علاقہ ان کو دیا گیا، جو اُبلّہ کے قریب واقع تھا، اور یہاں کی سرزمین سنگلاخ تھی، عثمان رضؓ نے اس کو صاف کر کے آباد کیا، بصرہ میں باب عثمانؓ ان ہی کی طرف منسوب ہے[1] بلاذری ؒ نے دوسری جگہ شطِ عثمان کے بارے میں لکھا ہے کہ اسے عثمانؓ ثقفی نے طائف میں واقع اپنی ایک زمین کے عوض حضرت عثمانؓ غنی سے خرید ا تھا[2]۔ اور علامہ ابن سعدؒ اور علامہ ابن حزم ؒ نے لکھا ہے کہ عثمان ثقفی ؓ نے بصرہ میں مکان بنایا اور وہاں بہت سی زمینیں حاصل کیں، ان ہی میں شطِ عثمان کا علاقہ تھا جو اُبلّہ کے بالمقابل واقع تھا۔[3]

شطِ عثمان کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ۲۲ جمادی الاخریٰ ۲۹ھ میں ایک تمسک نامہ تحریر فرمایا تھا جس سے اس کا محلِ وقوع، جاگیر اور قطائع کی نوعیت اور دوسری کئی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں، معجم البلدان میں یہ تحریر محفوظ ہے، ہم اسے یہاں درج کرتے ہیں،

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ھذا الکتاب عبد اللہ عثمان امیر المؤمنین لعثمان بن ابی العاصی، انی اعطیتك الشط لمن ذھب الی الاُبلّة من البصرة والمقابلة قریة الاُبلّة، والقریة التی کان الاشعری عمل فیھا، واعطیتك ما کان الاشعری عمل من ذلك، واعطیتك براح ذلك الشطاحة وسبخة فیما بین الخرارة الی دیر جابیل الی القبرین اللذین علی الشط، المقابلین للابلة واعطیتك

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ تحریر اللہ کے بندے اور مسلمانوں کے امیر عثمانؓ کی ہے، عثمان بن ابو العاصی کے نام، میں نے تم کو ساحل سمندر کا وہ علاقہ عطا کیا جو بصرہ سے اُبلّہ کی طرف جانیوالے کو ملتا ہے جس کے سامنے اُبلّہ کا قریہ اور وہ قریہ ہے جسے ابو موسیٰ اشعری نے بسایا تھا، اس طرف جو حصہ اشعریؓ نے آباد کیا تھا وہ بھی تم کو دیا نیز میں نے تم کو اس ساحل کی جھاڑیاں اور سنگلاخ زمینیں دیں جو خرارہ سے دیر جابیل کی طرف لب دریا دو قبروں تک کا علاقہ ہے، یہ دونوں قبریں اُبلّہ کے

---

[1] فتوح البلدان ص۳۴۶، [2] ، ص۳۵۶، [3] طبقات ابن سعد ج ۵، ص۳۲ وجمہرۃ انساب العرب ص۲۶۶،

ما عملت من ذلك انت وبنوك ،
إن احدًا تعطيه شيئًا من ذلك
من اخوتك فاعمله، عن عطيتك
وامرتُ عبد الله بن عامر ان لا يمنعكم
شيئًا اخذتموه ترون انكم تستطيعون
عمله من ذلك فما كان فيه بعد
ما عملتم واخترته من فضل لا
ترونكم ما عملتموه فليس لكم ان
تتحولوا دونه لمن أراد امير المؤمنين
ان يعمل فيه حجة له، واعطيتك
ذلك عوضًا عن ارضك التي
أخذتُ منك بالمدينة التي
اشتراها لك امير المؤمنين
عمر بن الخطاب رضي الله عنه
وما كان فيما سميتُ فضلُ عن
تلك الارضين فانها اعطيتها عطيتك
اياها اذ عزلتك عن العمل ، و
قد كتبت الى عبد الله بن عامر
ان يعينك في عملك ويحسن لك
العون، فاعمل بسم الله وعونه
وأمسك شهد المغيرة بن الاخنس،

سامنے پڑتی ہیں، اور میں نے تم کو وہ حصہ بھی دیا جسے
تم اور تمہارے لڑکوں نے پہلے سے آباد کیا تھا، اس
میں سے اگر تم اپنے بھائیوں میں سے کسی کو دینا چاہو
تو اپنے عطیہ سے دے سکتے ہو، اور میں نے بصرہ کے
حاکم عبد اللہ بن عامر کو حکم دے دیا ہے کہ وہ تمہارے
مقبوضہ علاقہ میں سے کسی حصے کے بارے میں
روک ٹوک نہ کریں، جس کے بارے میں تم کو خیال
ہے کہ اسے قابل استعمال بنا سکو گے، تمہارے استعمال
کرنے اور پسند کرنے کے بعد اگر کوئی ٹکڑا بچ گیا
جسے تم سمجھتے ہو کہ تمہارا آباد کردہ علاقہ نہیں ہے
تو اس میں تم کو یہ حق نہیں ہے کہ اگر امیر المومنین
کسی دوسرے شخص کو آباد کرنے کے لئے دینا چاہیں
تو تم آڑے آؤ۔ میں نے یہ جاگیر تم کو مدینہ منورہ
کی اس زمین کے عوض میں دی ہے جسے میں نے
لے لیا ہے، اور جسے امیر المومنین عمر بن خطاب نے
تمہارے لئے خریدا تھا۔ میں نے اوپر جن عطیات
وقطائع کا ذکر کیا ہے ان سے زائد جو زمین اس
علاقہ میں واقع ہے، اسے بھی میں نے تم کو امارت
سے سبکدوش کرنے پر دیدیا ہے۔ اور عبد اللہ بن
عامر کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے کام میں حسب
ضرورت اچھی طرح مدد کریں، اب تم اللہ کا نام

والحارث بن الحکم بن ابی العاص، و فلان بن ابی فاطمہ، وکتب تاریخہ لثمان بقین من جمادی الاخرۃ سنۃ ۲۹ھ[1]

لے کر اس کی مدد سے کام شروع کر دو، اور اس علاقہ پر اپنا قبضہ کر لو، گواہ مغیرہ بن اخنس، حارث بن حکم بن ابو العاصی (بن امیہ) اور فلان بن ابو فاطمہ، تاریخ کتابت ۲۲ جمادی الآخرہ ۲۹ھ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس تحریر کے ساتھ حاکمِ بصرہ عبداللہ بن عامرؓ کو ایک خط لکھا جس میں اس معاملہ میں عثمانؓ ثقفی کی پوری پوری مدد کرنے کا حکم دیا تھا۔

اس علاقہ کی تمدنی جھلکیاں بصرہ کے قریب ابلہ کی جانب بارہ ہزار بیگھہ یہ وسیع وعریض اور ویران وسنگلاخ علاقہ بہت جلد بڑا بارونق اور پر بہار بن گیا، حضرت عثمانؓ نے اپنے تمام بھائیوں کو اسی علاقہ میں آباد کیا اور سب کو اسی میں سے ایک ایک ٹکڑا دیا جو بعد میں ان کے ناموں سے مشہور رہا، اور شطِ عثمانؓ کے علاقہ میں کئی مشہور مقامات بن گئے، بلاذری رحمۃ نے لکھا ہے کہ عثمان نے اپنی جاگیر سے حفصؓ کو حفصان، ابو امیہؓ کو امیتان، حکمؓ کو حکمان، اور مغیرہؓ کو مغیرتان نامی حصہ دیا، اور ایک بھائی ابو عمرو کے حصہ میں نہر الارحا ر آئی، جس پر پن چکیاں چلتی تھیں۔[2]

اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے شط عثمان شہر بصرہ سے متصل بہت بڑی آبادی کی شکل اختیار کر گیا، اس طرف شہر پناہ کا جو دروازہ تھا اس کا نام بابِ عثمانؓ رکھا گیا،[3] اور یہاں کا سرکاری انتظام بصرہ کے عام انتظام سے الگ کیا گیا، زیاد بن ابو سفیان نے ۴۵ھ میں بصرہ کی امارت کے زمانہ میں بابِ عثمانؓ و بالبیہ کا امیر وحاکم شیبان بن عبداللہ اشعری کو بنایا تھا۔[4] اس علاقہ میں متعدد حمام اور پن چکیاں جاری ہوئیں۔ اس وقت بصرہ کی تمدنی زندگی میں حماموں اور غسل خانوں کی اہمیت اور آمدنی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ سرکاری اجازت کے بغیر کوئی شخص حمام تعمیر نہیں کر سکتا تھا، ایک ایک حمام سے روزانہ ایک ایک ہزار درہم

---

[1] معجم البلدان ج ۵ ص ۳۶۶، [2] فتوح البلدان ص ۳۵۶، [3] ؍؍ ص ۳۴۶، [4] کامل مبرد ج ۳ ص ۲۶۳،

کی آمدنی ہوتی تھی، غلہ جات کی آمدنی اس کے علاوہ تھی، ان میں دو حمام خانوادۂ ابوالعاصی کے بھی تھے، ایک عثمان رض کے بھائی حکم کا، اور دوسرا عثمان رض کے لڑکے عبداللہ کا۔ حمام حکم بن العاصی کے سلسلے میں یہ واقعہ بہت دلچسپ ہے کہ بصرہ کے محلہ بلال آباد میں مسلم بن ابوبکرہ کا ایک حمام تھا، ایک مرتبہ ابوبکرہ نے اپنے بیٹے مسلم سے کہا کہ تمہارے حمام کی روزانہ کی آمدنی ایک ہزار درہم ہے کسی کو اس کی خبر نہ ہونے پائے، مگر اسی دوران میں ایک مرتبہ مسلم بن ابوبکرہ بیمار پڑا تو اپنے بھائی عبدالرحمن بن ابوبکرہ سے اس کا تذکرہ کردیا اور یہ بات شدہ شدہ دوسروں تک پہونچ گئی، اور لوگوں نے حمام تعمیر کرنے کی درخواست دیکر اجازت چاہی، ان ہی میں حکم بن ابوالعاصی بھی تھے، ان کو حمام بنانے کی اجازت مل گئی۔ [۱]

بصرہ میں سب سے پہلا حمام عثمان رض کے صاحبزادے عبداللہ رض نے بنوایا تھا، جو حمام عبداللہ بن عثمان بن ابوالعاصی رض کے نام سے مشہور تھا، اور حضرت معاویہ رض کے باغ میں ایک پُر فضا مقام پر تھا، اسی کے پاس عیسیٰ بن جعفر کا محل بھی تھا۔ [۲]

نہر الارحا عثمان کے بھائی ابوعمرو ثقفی کی ملکیت تھی جس پر پن چکیاں چلتی تھیں اور انکی آمدنی ان ہی کو ملتی تھی۔ عثمان کی بہن بابہ بنت ابوالعاصی کا مکان ان کے بھائی حکم کے خطۂ حکمان سے تھوڑی دُور پر تھا، یہ خطہ طارق بن ابوبکرہ کے مکان کے سامنے واقع تھا۔ [۳]

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مجاہدینِ ہند کی زندگی کا ہر دَور کس قدر کامیاب اور قابلِ رشک تھا۔ اور وہ جہاں جہاں گئے کامیابی و کامرانی، عیش و مسرت، اور عزت و شہرت ان کے ساتھ رہی اور ہر جگہ دین کے ان خادموں کا استقبال مخدومیت کی شان نے کیا۔

خانوادۂ ابوالعاصی کا مجد و شرف

جب ۱۴ھ میں حضرت عتبہ بن غزوان رض نے حضرت عمر رض کے حکم سے ابلہ (ارض الہند) کے قریب بصرہ کو آباد کیا، تو بنو ثقیف نے اس کی آبادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، یہاں سب سے پہلا خطہ اور مکان ثقیف کی مشہور شخصیت طبیب العرب

[۱و۲] فتوح البلدان ص ۳۴۳، [۳] ص ۳۴۴ ۔

حارث بن کلدہ ثقفی کے صاحبزادے نافع بن حارث ثقفی کا تھا، اس کے بعد بنو ثقیف کے مختلف گھرانوں نے یہاں مکانات تعمیر کئے اور شہر کی آباد کاری میں نمایاں حصہ لیا، ان ہی میں حضرت عثمان ثقفی اور ان کے بھائی تھے، ان حضرات کو اہلِ بصرہ میں نمایاں عزت و شہرت اور پُر شکوہ زندگی ملی، اور بعد میں کئی صدیوں تک ان کی اولاد میں مجد و شرف، جاہ و جلال، خوش حالی و فارغ البالی اور علم و فضل کا دار دورہ رہا، اور ان کے تذکرہ نگاروں نے ان کی اس خصوصیت کو نمایاں طور سے بیان کیا ہے، ابنِ سعد نے ان کے جاہ و جلال اور دولت و ثروت کو یوں بیان کیا ہے کہ عثمانؓ کی اولاد آج بھی بصرہ میں موجود ہے، جو نجیب و شریف ہے، ان کی آمدنی اور دولت میں خوب ترقی ہوئی، ان کی آبادی بہت بڑی ہے اور لوگ نیک و صالح ہیں، دوسری جگہ لکھا ہے کہ عثمانؓ اور ان کا خانوادہ بصرہ میں اقامت پذیر ہوا، ان کو یہاں بڑی عزت و شہرت ملی۔[1]

ابن قتیبہؒ نے تیسری صدی میں لکھا ہے کہ عثمان ثقفی کی اولاد میں اب تک اعیان و اشراف پائے جاتے ہیں۔[2] ابنِ عبدالبرؒ نے پانچویں صدی میں ان کے مجد و شرف کا تذکرہ یوں کیا ہے کہ عثمان کی اولاد اعیان و اشراف میں سے ہے۔[3] ابنِ حزمؒ نے بھی پانچویں صدی میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ عثمان بن ابی العاصی کے اعقاب و اولاد اب تک بصرہ میں موجود ہیں، یہاں ان کی آبادی کثیر ہے اور یہ لوگ عزت و شہرت کے مالک ہیں۔[4] اور امام نوویؒ نے ساتویں صدی میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ عثمانؓ کی اولاد میں بڑی کثرت ہے، اور لوگ اعیان و اشراف ہیں۔[5]

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۷، ص ۴۰ و ج ۵ ص ۵۰۹، [2] کتاب المعارف ص ۱۱، [3] الاستیعاب بذیل اصابہ ج ۳ ص ۹۳،
[4] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۶، [5] تہذیب الاسماء و اللغات ج ۱ ص ۳۲۔

(۳)

فاتحِ ہند حضرت محمدؒ بن قاسم ثقفی

رحمۃ اللہ علیہ

قبیلہ بنو ثقیف کی ایک شاخ بنو مالک میں سے بنو ابی العاصی نے عہدِ فاروقی میں اپنے مجاہدانہ کارناموں سے ہندوستان کو اسلام کی متاعِ گراں مایہ سے رُوشناس کرایا۔ اور جانبین میں سلسلۂ تعارف و تعلق جاری ہوا، یہاں تک کہ اسی قبیلہ کی دوسری شاخ احلاف میں سے بنو ابی عقیل کے افراد نے خلیفہ ولید اموی کے دَور میں اس ملک کو فتح کر کے اسلام اور مسلمانوں کا وطن بنایا، یوں تو اس دُور میں بہت سے ثقفی خصوصاً آلِ ابی عقیل کے لوگ یہاں مجاہد و فاتح کی حیثیت سے آئے، اور اپنی ایمانی حرارت سے اس ملک کو زندگی دی، مگر ان میں حضرت محمد بن قاسم ثقفی رحمۃ اللہ علیہ اپنی خداداد صلاحیت اور جواں ہمتی کی وجہ سے بجا طور پر فاتحِ ہند کہے جانے کے مستحق ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ اس ثقفی نوجوان کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رہے گی، اور جب تک یہاں اسلام کا نام لیا جائے گا، محمدؒ بن قاسمؒ کا نام زندہ رہے گا۔

انھوں نے ۷۲ھ میں بصرہ میں امارت و حکومت کے گہوارے میں آنکھ کھولی، اور طفلی کے ایام ناز و نعمت کی فضا میں بصرہ کے گلی کوچے میں گزارے، جہاں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور امام حسن بصری اور امام محمد بن سیرین رحمہما اللہ کے وجود کی برکتیں عام تھیں، اور عین عنفوان شباب میں جب کہ ان کی عمر صرف سترہ سال کی تھی، ۸۳ھ میں فارس

کے امیر و حاکم بنائے گئے، اس کے بعد ۹۲ھ سے ہندوستان کے غزوات و فتوحات کی قیادت کی اور ۹۶ھ میں عراق میں جاں بحق ہو گئے، اس طرح ان کی زندگی کا کارواں بصرہ میں سترہ سال تک سامانِ سفر مہیا کرتا رہا۔ پھر اس نے فارس کے میدان جنگ سے اپنا سفر شروع کیا اور ہندوستان ہوتا ہوا واسط کے جیل خانہ میں پہونچ کر ختم ہو گیا، یہ ہے ان کے کاروان زندگی کی داستان جو مختلف جہات میں بکھری ہوئی ہے، اور اس کی کوئی مرتب کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے۔

یہ عجیب بات ہے، اس عظیم فاتحِ اسلام کی شخصیت ہی کو نہیں بھلایا گیا بلکہ اسکے کارناموں کو بھی طاقِ نسیاں کی نذر کر دیا گیا جو یقیناً اسلامی تاریخ کی مقدس امانت تھے اور ان کی حفاظت مؤرخینِ اسلام کا فرضِ منصبی تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے فارس کے فاتحانہ و مجاہدانہ کارنامے کا کہیں پتہ نہیں چلتا اور ہندوستان کی فتوحات پر کوئی مستند اور مبسوط کتاب نہیں ہے، البتہ بعد میں ان کو ایک محیّر العقول انسان کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی، اس مقالہ میں حضرت محمد بن قاسم کی شخصیت کے بارے میں جہاں سے جو کچھ مل سکا ہے پیش کیا جا رہا ہے اس میں ان کے مجاہدانہ و فاتحانہ کارناموں کی تفصیل مقصود نہیں ہے۔ اس میں حضرت محمد بن قاسم کی حجاج سے دامادی کی نسبت، فارس کے دورِ امارت کے کارنامے، ہندوستان کے فتح کے وقت اُن کی عمر کی بحث، اور اُن کی موت کے اسباب خصوصی مباحث ہیں، جن پر خاص طور سے توجہ دی گئی ہے۔

نام و نسب اور خاندانی حالات

حضرت محمد بن قاسم بن محمد بن حکم بن ابو عقیل بن مسعود بن عامر بن معتب بن مالک بن کعب بن عمرو بن سعد بن عوف بن ثقیف [۱] آپ ثقیف کی شاخ احلاف یعنی بنو عوف کے خاندان آل ابو عقیل سے ہیں۔ آپ کے آبا و اجداد میں حضرت معتب بن مالک نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اسلام کے داعی و مبلغ بن کر اپنے قبیلہ بنو ثقیف اور احلاف کو حق کی دعوت دی، مگر انھوں نے آپ کو شہید کر دیا، ان کے بارے میں

[۱] جمہرۃ انساب العرب ۲۶۶ و ۲۶۸،

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "مثلہ مثل صاحب یاسین" ان ہی کی اولاد میں ابو عقیل بن مسعود بن عامر بن معتب ہیں، جن کی اولاد میں اموی دور میں بڑے بڑے مجاہدین و فاتحین اور نامی گرامی امراء و حکام پیدا ہوئے، خاص طور سے حکم بن ابو عقیل کے خاندان سے یہ سلسلہ خوب چلا، چنانچہ حجاج بن یوسف بن حکم بن ابو عقیل، اور محمد بن قاسم بن محمد بن حکم بن ابو عقیل اسی خانوادۂ آلِ ابو عقیل سے ہیں اور خاندانی رشتہ سے محمدؒ بن قاسم، حجاج بن یوسف کے برادر عم زاد ہیں، بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن قاسمؒ کی والدہ کا نام حبیبہ تھا، ان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ [1]

علی بن حامد اوچی کوفی نے چچ نامہ میں بار بار آپ کا لقب عماد الدین لکھا ہے، مگر اس طرح کے القاب کا رواج چھٹی صدی میں ہوا، جبکہ امراء و سلاطین اور اعیان و اشراف میں اپنے لئے "الدین" کی اضافت کے ساتھ لقب اختیار کرنے کا ذوق عام تھا، محمدؒ بن قاسم کے لئے تاریخوں میں ایسا کوئی لقب نہیں ملتا۔

آپ کے والد قاسم بن محمد بن حکم ثقفی اموی دور میں بصرہ کے امیر و حاکم رہ چکے ہیں، حجاج بن یوسف اور یوسف بن عمر بن محمد بن حکم دونوں نے عراق کی امارت و حکومت کے زمانہ میں اپنی طرف سے ان کو بصرہ کا حاکم مقرر کیا تھا، حجاج بن یوسف کی طرف سے بصرہ کی ولایت کے متعلق علامہ ابن حزم نے لکھا ہے:-

والقاسم بن محمد بن الحکم بن ابی عقیل، ولی البصرۃ للحجاج [2]	قاسم بن محمد بن حکم حجاج بن یوسف کی نیابت میں بصرہ کے والی و حاکم تھے۔

حجاج بن یوسف کے بعد یوسف بن عمر نے ان کو بصرہ کی ولایت دی، جیسا کہ علامہ بلاذریؒ نے انساب الاشراف میں لکھا ہے کہ ۹۶ھ میں ولید بن عبد الملک کے مرنے پر اہلِ بصرہ نے قاسم بن محمد کے بجائے اپنی مرضی سے عبد اللہ بن ابو عثمان بن عبد اللہ بن

---

[1] چچ نامہ ص۱۹۲، [2] جمہرۃ انساب العرب ص۲۶۷ و ص۲۶۸۔

امیہ بن خالد بن اُسید کو بصرہ کا والی و حاکم منتخب کرلیا، اور قاسم بن محمد نے راہِ فرار اختیار کی، اس وقت وہ یوسف بن عمر کی طرف سے بصرہ کے امیر تھے، بلاذری کے آخری الفاظ یہ ہیں:۔

وھرب القاسم بن محمد الثقفی عامل یوسف بن عمر علیہا[1]	بصرہ پر یوسف بن عمر کے عامل قاسم بن محمد ثقفی وہاں سے بھاگ نکلے،

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاسم بن محمد ثقفی کوئی کامیاب اور ہوشیار حاکم نہیں تھے، اور بصرہ جیسے ہنگامہ خیز اور باشعور شہر میں وہ نظم و نسق قائم نہیں کرسکے، حجاج اور یوسف کی ثقفیت نے اس ثقفی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی، مگر وہ خود آگے نہ بڑھ سکے، ویسے بھی قاسم بن محمد ثقفی کا شمار ثقیف کے غیر ذی شعور افراد میں ہوتا تھا، چنانچہ محمد بن حبیب بغدادی نے کتاب المحبّر میں ان کا شمار "حمقی ثقیف" میں کیا ہے، نیز اسی زمرہ میں عبدالرحمٰن بن ام الحکم (بن عبداللہ بن ربیعہ) اور مغیرہ بن عبداللہ بن ابوعقیل کو داخل کیا ہے[2]

چچ نامہ کی بعض عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قاسم بن محمد اپنے صاحبزادے کے ساتھ ہندوستان کی فتوحات میں شریک تھے۔ مگر یہ بات یوں صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستان میں محمد بن قاسمؒ کی فتوحات کا زمانہ ۹۲ھ سے ۹۶ھ تک ہے، اور جیسا کہ معلوم ہوا اس زمانہ میں ان کے والد قاسم بن محمد بصرہ کے حاکم تھے اور ۹۶ھ میں اس عہدہ سے خود علیحدہ ہوگئے تھے لہٰذا اس مدت میں وہ ہندوستان کیسے آسکتے تھے،

بصرہ میں ولادت ۶۲ھ میں | ۱۶ھ میں جب بصرہ آباد کیا تو بنو ثقیف کے لئے گویا دوسرا طائف بن گیا، انھوں نے یہاں کی آبادی میں نمایاں حصہ لیا، اموال و املاک پر قبضہ کیا، قطائع اور جاگیریں حاصل کیں، قصور و محلات اور مکانات بنوائے، یہاں کی کئی نہریں اور حمام ان کی ملکیت میں تھے، شطِ عثمان اور درجاہِ جنگ (درگاہ جنگ) ثقیف کے مشہور علاقے تھے، ساتھ ہی یہاں کے بنو ثقیف نے اموی دَور کے سرکاری اور ملکی انتظامات میں کام کئے

[1] انساب الاشراف جلد ۴، قسم دوم ص ۱۵۳، [2] کتاب المحبّر ص ۳۸۱، [3] چچ نامہ ص ۱۹۲

بڑے بڑے عہدے پر فائز ہوئے، اس طرح طائف کی ساری رونق بصرہ میں سمٹ آئی، حضرت محمد بن قاسمؒ کے والد بصرہ ہی میں مدتوں امارت و حکومت کی خدمت انجام دیتے رہے، حجاج بن یوسف اور یوسف بن عمر کی گورنری کے ایام میں یہاں کے امیر رہے، یہاں تک کہ ۹۶ھ میں اس منصب سے جُدا ہوئے، یہیں پر جاہ و حشم اور ناز و نعم کے گہوارے میں محمد بن قاسمؒ نے آنکھ کھولی، اور پروان چڑھے اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا وہ ۸۳ھ میں فارس کے امیر بنائے گئے، اس وقت ان کی عمر سترہ سال کی تھی، اس حساب سے ان کی پیدائش ۶۶ھ کے حدود میں ہوئی تھی۔

نشو و نما اور تعلیم و تربیت اس زمانہ میں اگرچہ دارالخلافت ملک شام کا شہر دمشق تھا، مگر عراق کے دونوں آباد شہر کوفہ اور بصرہ اسلامی حضارت و ثقافت اور دینی علوم و فنون کے مرکز تھے، ایک طرف بصرہ کی آبادی و ملکیت پر بنو ثقیف کا غلبہ تھا اور خلافت کے امور و معاملات میں بھی وہ زیادہ دخیل تھے، ان کے علاوہ مختلف قبائل اپنی اپنی روایات سے بصرہ کو دلکش بنا رہے تھے، دوسری طرف حضرات صحابہؓ اور تابعینؒ کے وجودِ باجود سے بصرہ کے گلی کوچے آباد تھے، اور مسلمان ان کی دید و زیارت اور ان سے اخذ و کسب کے لئے جمع ہو رہے تھے، ایک مرتبہ زیاد کے زمانہ میں بصرہ کے مجاہدوں اور غازیوں کا شمار کیا گیا تو اسّی ہزار مجاہد اور ایک لاکھ بیس ہزار ان کے لڑکے بچے حساب میں آئے۔[1]

اس سے بصرہ کی آبادی اور وہاں کے دینی جوش اور اسلامی حمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسی مقدس اور علمی و دینی فضا میں محمد بن قاسم پروان چڑھے۔ اس وقت بصرہ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ متوفی ۹۳ھ کی ذاتِ گرامی مرجعِ خلائق تھی، اور عالمِ اسلام سے مسلمان کھنچ کھنچ کر دنیا میں اس آخری صحابیٔ رسولؐ کی زیارت اور ان سے

[1] فتوح البلدان صـ ۳۲۵۔

احادیثِ رسولؐ سننے کے لئے آتے تھے، نیز حضرت امام حسن بصریؒ متوفی ۱۱۰ھ کے زہد و تقدس علم و فضل اور شہرت و عظمت نے اہل دین و دیانت اور اربابِ دل کے لئے بصرہ کو بڑا پرکشش بنا دیا تھا۔

محمد بن قاسمؒ نے ۸۳ھ تک اپنی زندگی کے سترہ سال[1] اسی مقدس ماحول میں گزارے اگرچہ اس درمیان میں ان کے حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت حسن بصریؒ سے ملنے اور ان سے کسبِ فیض کرنے کی روایت نہیں ملتی، مگر اس زمانہ کے عام اسلامی و دینی ذہن کے مطابق ان کے والدین نے ضرور ان بزرگوں کی خدمت میں بھیجا ہوگا اور ان حضرات کے انفاسِ گرم نے ان کے دل میں یقین و ایمان کی حرارت پیدا کی ہوگی، اس زمانہ میں عام طور سے خلفاء و امراء اپنی اولاد کو حصولِ برکت اور تعلیم و تربیت کے لئے صحابہؓ اور تابعین کی صحبت میں رکھتے تھے، اس رواج کے مطابق محمد بن قاسمؒ کو بھی تابعیت کا شرف حاصل ہوا ہوگا، ورنہ ان کے تبع تابعی ہونے میں کلام نہیں ہے، وہ ۶۶ھ میں پیدا ہوئے، اور عین شباب میں ۸۳ھ میں فارس کی جنگ و امارت پر بھیج دیے گئے، پھر نو دس سال کے بعد ۹۲ھ میں ان کو ہندوستان کی مہم پر آنا پڑا، یہاں تک کہ ۹۶ھ میں انتقال کر گئے، اس طرح وہ کُل تیس[2] سال تک زندہ رہ کر جوانی ہی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کہنا چاہئے کہ ان کی عملی زندگی کا آغاز میدانِ جہاد سے ہوا اور انجام بھی وہیں ہوا، اس لئے نہ ان کے عام واقعات کتابوں میں ملتے ہیں اور نہ ہی اُن کی علمی زندگی کے بارے میں کوئی بات ملتی ہے، اگر ان کی زندگی نے وفا کی ہوتی اور کچھ دنوں بزم کی فرصت ملی ہوتی تو شاید دوسرے مجاہدینِ اسلام کی طرح ان کی مرویات بھی ہم تک پہونچی ہوتیں۔

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۲۵

محمد بن قاسمؒ کی شادی، اور حجاج بن یوسف کی دامادی کا قصہ

حضرت محمد بن قاسمؒ حجاج بن یوسف کے حقیقی چچازاد بھائی تو نہیں ہیں، البتہ خاندان اور رشتہ میں چچازاد بھائی ضرور ہوتے ہیں، لیکن یہ جو مشہور ہے کہ وہ حجاج بن یوسف کے داماد بھی ہیں اور حجاج کی بیٹی ان سے بیاہی تھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، صرف چچ نامہ میں اس کا ذکر افسانوی رنگ میں پایا جاتا ہے، اس میں ہے کہ "محمد بن قاسم پسر عم او بود، و داماد نیز بود" پھر ایک حکایت درج ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن حجاج نے خوش ہو کر محمد بن قاسم سے کہا کہ تم مجھ سے اپنی کوئی حاجت طلب کرو، محمد بن قاسم نے کہا کہ آپ مجھے کسی مقام کا امیر و حاکم بنا کر اپنی صاحبزادی سے میری شادی کر دیں، یہ سنکر حجاج نے خفگی میں محمد بن قاسمؒ کے سر پر چھڑی مار دی جس کی وجہ سے ان کا عمامہ گر گیا، پھر حجاج نے وہی بات کہی اور محمد بن قاسمؒ نے اپنی بات دہرائی، اور جب تیسری بار یہ گفتگو ہوئی تو حجاج نے کہا کہ اچھا میں اس شرط پر تم سے اپنی بیٹی کی شادی کرتا ہوں کہ تم لشکر لے کر فارس یا ہندوستان جاؤ اور اس کو فتح کر کے نظم و ضبط قائم کرو، اور مال غنیمت بھیجو۔[1]

حجاج بن یوسفؒ کے رعب و داب اور محمد بن قاسم کی ذات سے یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے۔ پھر انساب و تذکرہ اور تاریخ کی کتابوں میں حجاج کی بیٹی سے محمد بن قاسم کے نکاح کا واقعہ نہیں ملتا، بلکہ حجاج کی اولاد میں اس کی کسی بڑی لڑکی کا ذکر تک نہیں ہے، ابن قتیبہؒ نے حجاج کی اولاد میں یہ نام دیئے ہیں (۱) محمد (۲) ابان (۳) عبد الملک (۴) ولید اور (۵) جاریہ (ایک بچی)۔[2]

اور ابن حزمؒ نے ان کے یہ نام لکھے ہیں (۱) محمد (۲) عبد الملک (۳) ابان (۴) سلیمان،[3] اس میں ولید کے بجائے سلیمان ہے، اور کسی بچی کا نام بھی نہیں ہے۔

بعض معاصر مصری فضلاء نے لکھا ہے کہ حجاج نے اپنی بہن زینب سے محمد بن قاسمؒ کی

---

[1] چچ نامہ ص ۱۹۰، [2] کتاب المعارف ص ۱۷۶، [3] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۷،

شادی کی تھی جو حسن و جمال اور عقل و کمال میں یکتائے زمانہ تھی اور اس دور کے شعراء اپنے اشعار میں اس کے حسن و جمال کا تذکرہ کرتے تھے۔ اس وقت محمد بن قاسمؒ کی عمر سترہ سال کی تھی بلکہ اس قول میں یہ اشکال ہے کہ محمد بن قاسم جب ۸۳ھ میں فارس کی مہم پر بھیجے گئے تو ان کی عمر سترہ سال کی تھی، اور اسی سال حجاج کی بہن زینب کا انتقال ہوا، جیسا کہ ابن اثیر نے کامل میں ۸۳ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ اس سال عبدالرحمان بن الاشعث کے خروج پر حجاج بن یوسف نے احتیاطاً اپنی عورتوں اور بچوں کو بصرہ سے شام منتقل کر دیا تھا۔

وفیھن اختہ زینب التی ذکرھا النمیری فی شعرہ،	ان ہی میں حجاج کی بہن زینب بھی تھی جس کا تذکرہ نمیر نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔

اور جب ابن الاشعث کو ہزیمت ہوئی تو حجاج نے خلیفہ عبدالملک اور اپنی بہن زینب کو اس کی خوشخبری کا خط لکھا، جس وقت یہ خط پہنچا، زینب خچر پر سوار ہو رہی تھی، اسی حالت میں اس نے خط کھولا، اتفاق سے سواری بدک گئی اور زینب گر کر اسی وقت مر گئی۔[۲] اس اشکال کے باوجود محمد بن قاسم کے داماد ہونے کے مقابلہ بہنوئی ہونا ممکن ہے، اور ہو سکتا ہے کہ محمد بن قاسمؒ کے صاحبزادے عمرو بن محمد بن قاسم اسی زینب کے بطن سے ہوں۔

فارس کی ولایت و امارت ۸۳ھ محمد بن قاسم نے حکومت و امارت میں آنکھ کھولی اور اسی میں پروان چڑھے، جوانی کے ایام میں ہی ان میں خداداد قابلیت اور انتظامی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے حداثتِ سن ہی میں بڑی بڑی مہمات انجام دینے لگے۔ حجاج بن یوسف نے ان کو علاقہ فارس کی حکومت دی، جہاں کے حالات نہایت ابتر تھے، ۸۱ھ میں حجاج نے خوارج کو شکست دے کر خراسان، کرمان اور فارس وغیرہ

---

[۱] المحاضرات الاسلامیہ، [۲] الکامل ج ۴ ص ۴۹۶ (بیروت)

مشرقی ممالک کے انتظامی امور پر توجہ دی، اور ان علاقوں میں نئے نئے امراء و حکام مقرر کئے۔ خراسان میں مہلب بن ابی صفرہ کو اور سجستان میں عبید اللہ بن ابوبکرہ کو حاکم بنایا، ۷۹ھ میں عبید اللہ بن ابوبکرہ کا انتقال ہوگیا، ۸۱ھ میں مہلب بن ابی صفرہ کے بیٹے مغیرہ کو خراسان کے خراج پر مامور کیا اور ۸۲ھ میں مہلب اور مغیرہ باپ بیٹے دونوں کا انتقال ہوگیا۔[1]

اسی نئے نظام کے سلسلے میں حجاج نے محمد بن قاسم کو فارس اور شیراز کی امارت و حکومت دے کر وہاں کے باغیوں اور سرکشوں سے جہاد کرنے کا حکم دیا تھا۔ خلیفہ بن خیاط نے ۸۳ھ کے واقعات کی ابتداء اسی سے کی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

سنة ثلاث وثمانين، فيها ولّى الحجاجُ محمد بن القاسم فارس وامره بقتل الاكراد۔[2]

۸۳ھ میں حجاج نے محمد بن قاسم ثقفی کو فارس کی ولایت دیکر کردوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا۔

ابن قتیبہ نے عیون الاخبار میں لکھا ہے:۔

وقال ابو اليقظان: ولّى الحجاج محمّد بن القاسم بن محمد بن الحكم الثقفي قتال الاكراد بفارس فابادهم (الى ان قال) وهو جعل شيراز معسكراً و منزلاً لولاة فارس۔[3]

ابو الیقظان کا بیان ہے کہ حجاج نے محمد بن قاسم ثقفی کو کردوں سے قتال کے لئے فارس کا والی بنایا اور انھوں نے کردوں کو تباہ و برباد کیا، نیز انھوں نے شیراز کو فوجی چھاؤنی اور فارس کے حکام کے لئے دارالامارۃ بنایا۔

یاقوت حموی نے محمد بن قاسم کی ولایت فارس اور تعمیر شیراز کو یوں بیان کیا ہے:۔

شيراز، وهي مما استجد عمارتها و اختطاطها في الاسلام قيل: اول من تولّى عمارتها محمد بن القاسم بن

شیراز ان شہروں میں سے ہے، جن کی تعمیری تجدید اور منصوبہ بندی اسلامی دور میں ہوئی ہے، شیراز کی تعمیر جدید کے نگراں حجاج کے چچا زاد بھائی

[1] تاریخ طبری ج ۸ ص ۳۱۹، [2] تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ۱ ص ۳۷۵، [3] عیون الاخبار ج ۱ ص ۲۲۹،

(محمد بن الحکم بن ابی) عقیل، محمد بن قاسم ثقفی تھے،

ابن عم الحجاج، [۱]

۸۳ھ سے ۹۲ھ تک محمد بن قاسم نے فارس کے امیر و حاکم رہ کر وہاں کے سرکش گروں کا خاتمہ کیا، شیراز کو جدید عربی و اسلامی طرز تعمیر کے مطابق آباد کیا، اور اس طرح اسے اسلامی مرکز بنایا کہ علاقۂ فارس میں شیراز مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی اور اموی عمال و ولاۃ کا دار الامارہ بن گیا، ان کی یہ پوری نو دس سالہ مدتِ امارت اسلامی خدمات اور غزوات و فتوحات میں گذری حتّٰی کہ ۹۲ھ میں جب ان کو ہندوستان کی مہم پر جانے کا حکم ہوا تو وہ رے کی جنگی مہم پر جانے کے لئے تیار تھے۔ بلاذری کا بیان ہے کہ محمد بن قاسم فارس میں تھے اور حجاج نے ان کو رے کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا تھا اور وہ پورے طور سے فوج کشی کی تیاری کر کے ابو الاسود جہم بن زحر جعفی کو مقدمۃ الجیش کا امیر مقرر کر چکے تھے کہ اسی اثناء میں حجاج کا حکم ہندوستان پر جہاد کے لئے پہنچا، نیز اس نے حکم دیا کہ شیراز میں اتنی مدت ٹھہرے رہو کہ پوری مدد پہنچ جائے [۲]۔

محمد بن قاسم نے اپنی امیری کے ایام میں ایک مرتبہ فارس کی خدمات اور غزوات و فتوحات کو اس شعر میں بیان کیا تھا، ؎

فلرب فتیۃ فارس قد راعتہا ولرب قرن قد ترکت قتیلا [۳]

فارس کے بہت سے جوانوں کو میں نے لرزہ براندام کیا ہے اور بہت سے طاقتوروں کو مار کر چھوڑ دیا ہے

فتنۂ ابن اشعث اور محمد بن قاسم ۸۱ھ میں ابن الاشعث نے حجاج بن یوسف کے مظالم کے خلاف خروج کیا جس میں بصرہ کے قرّاء اور عُبّاد و زہاد نے حصہ لیا اور اس تحریک کا خاتمہ رجب ۸۳ھ میں ہوا، اسی سال محمد بن قاسم فارس کے امیر بنائے گئے، اور ان کو بھی ان عباد و زہاد اور قراء کے خلاف تادیبی کارروائی کرنی پڑی،

علامہ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ ابن اشعث کے ساتھ خروج کرنے والوں

---

[۱] معجم البلدان ج ۵ ص ۳۲، [۲] فتوح البلدان ص ۴۲۳، [۳] ” ص ۴۲۸۔

میں حضرت عطیہؒ بن سعد بن جنادہ عوفی بھی تھے۔ اور جب ناکامی کے بعد ابن اشعث کے آدمی مختلف بلاد و امصار میں پناہ گزین ہوئے تو عطیہؒ عوفی علاقہ فارس میں پہنچے، اس وقت محمدؒ بن قاسمؒ فارس کے امیر و حاکم تھے، حجاج نے ان کو عطیہ عوفیؒ کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرنے کو لکھا، اور محمد بن قاسمؒ نے اس کے حکم کی تعمیل کی، اس موقع پر ابنِ سعدؒ کے الفاظ یہ ہیں:-

وخرج عطية مع ابن الاشعث على الحجاج فلما انهزم جيش ابن الاشعث هرب عطية الى فارس، فكتب الحجاج الى محمد بن القاسم الثقفى: ان ادع عطية فان لعن على بن ابيطالب، والا فاضربه اربعمائة سوط، واحلق راسه ولحيته۔[1]	عطیہؒ نے ابن اشعثؒ کے ساتھ حجاج کے خلاف خروج کیا، اور جب ابن اشعثؒ کی فوج نے شکست کھائی، تو عطیہ فارس کی طرف بھاگ گئے، حجاج نے محمدؒ بن قاسم ثقفی کو لکھا کہ عطیہؒ کو گرفتار کرو، اگر وہ علیؓ بن ابی طالب پر لعنت کریں تو چھوڑ دو، ورنہ ان کے چار سو کوڑے مارو، اور ان کے سر اور ڈاڑھی کے بال مونڈ دو۔

محمدؒ بن قاسمؒ نے عطیہؒ کو بلا کر حجاج کا خط سنایا اور جب انھوں نے اس فعل سے انکار کیا، تو ان کے چار سو کوڑے مارے، اور سر اور ڈاڑھی منڈوا دیئے۔ عطیہؒ اس حادثۂ فاجعہ کے بعد بھی فارس ہی میں رہے، پھر خراسان چلے گئے اور ۱۰۳ھ میں جب عمر بن ہبیرہ عراق کا امیر ہوا، تو اس کی اجازت سے کوفہ میں آکر زندگی کے دن پورے کئے حتی کہ یہیں ۱۱۱ھ میں انتقال ہوا۔

چچ نامہ کی روایت کے مطابق حضرت عطیہؒ عوفی نے محمد بن قاسمؒ کی امارت میں ہندوستان کی فتوحات میں شریک رہ کر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ چچ نامہ کے الفاظ یہ ہیں:-

"(محمد بن قاسم) پس چوں ازار مابیل رواں شد، (محمد بن) صاحب (مصعب) بن عبدالرحمن را بمقدمہ لشکر کرد، و جہم بن زحر الجعفی را ساقہ لشکر کرد، و عطیہ بن سعد عوفی را در میمنہ نصب کرد، و موسیٰ بن سنان بن سلمۃ الہذلی را بمیسرہ بگماشت"[2]

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۱۳، [2] چچ نامہ ص ۱۰۲۔

یہ حضرت عطیہؒ عوفی کے ایمان و اخلاص کی کھلی دلیل ہے کہ انھوں نے حجاج اور اس کی سیاست سے شدید اختلاف اور اس کی طرف سے اس ذلت آمیز سزا کے باوجود اسلام کی تبلیغ اور اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے پورا پورا ساتھ دیا اور اپنی بیش بہا خدمات سے دین کی خدمت کی، حضرت ابوالحسن عطیہ بن سعد بن جنادہ عوفی کوفی جلیل القدر تابعی ہیں، حضرت ابوہریرہ رضؓ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ جیسے جلیل القدر صحابہؓ سے حدیث کی روایت کی ہے اور ۱۱۱ھ میں کوفہ میں فوت ہوئے۔ [1]

ہندوستان کی امارت اور غزوات و فتوحات ۷۶ھ

ایک طرف محمد بن قاسم اپنی خدمات سے فارس کے بگڑے حالات کو درست کرنے میں مصروف تھے اور خلافت کے خلاف ابھرنے والی طاقتوں کو زیر کر رہے تھے، دوسری طرف ہندوستان اور سندھ کے حالات میں تیزی سے ابتری پیدا ہو رہی تھی، حجاج کے عامل مکران سعید بن اسلم کلابی کو ۷۸ھ میں محمد بن حارث علافی اور معاویہ بن حارث علافی نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے قتل کرایا، اور مکران میں اپنی طاقت جمع کرلی تھی، یہ دونوں بھائی بنی سامہ بن لوئی سے تھے اور سندھ میں اموی خلافت کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا، مگر حجاج نے ۷۹ھ میں مجاعہ بن سعر تمیمی کو مکران کی ولایت دی، اور انھوں نے ان کو زیر کیا، افسوس کہ مجاعہ بن سعر کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ جلد ہی انتقال کر گئے۔ حجاج نے ۸۰ھ میں محمد بن ہارون بن ذراع نمیری کو مکران کا حاکم مقرر کیا۔ [2] ان کی ولایت کے زمانہ میں ہندوستان کے اندر اموی خلافت کے وقار کا سوال پیدا ہوگیا، اور صورتِ حال بڑی نازک ہوگئی، بات یہ ہوئی کہ محمد بن ہارون کے دورِ امارت میں سراندیپ کے راجہ نے ایک جہاز میں حجاج کے پاس ان عورتوں کو روانہ کیا جن کے آبا و اجداد تاجر تھے اور ان کا انتقال سراندیپ میں ہوگیا تھا، اور ان عورتوں کی پیدائش وہیں کی تھی، جب یہ جہاز دیبل کے سامنے سے گذرا تو سندھ کے بحری ڈاکوؤں نے چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ذریعہ اس پر حملہ کیا اور

[1] لسان المیزان ص ۲۲۵، [2] تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ا ص ۳۵۸ و ۳۹۰،

جہاز کو تمام سامان سمیت پکڑ لیا، اس میں ایک عورت قبیلہ بنی یربوع کی تھی، اس نے یا حجاج کہہ کر حجاج کی دہائی دی، جب حجاج کو اس جہاز کی گرفتاری اور اس عورت کی دہائی کا علم ہوا تو اس نے وہیں سے یا لبیک کہا، اور فوراً راجہ داہر کے پاس سرکاری آدمی بھیج کر ان عورتوں کے رہا کرنے کا سوال اٹھایا مگر راجہ داہر نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ ان عورتوں کو میں نے نہیں پکڑا ہے بلکہ ڈاکوؤں نے پکڑا ہے، ان پر میرا قابو نہیں چلتا ہے، یہ غیر ذمہ دارانہ جواب سن کر حجاج نے عبید اللہ بن نبہان کو دیبل پر چڑھائی کے لئے روانہ کیا، وہ یہاں آکر شہید ہو گئے۔ تو حجاج نے بدیل بن طہفہ بجلی کو لکھا کہ وہ فوراً دیبل کی طرف کوچ کریں، وہ اس وقت عمان میں تھے، چنانچہ بدیل بن طہفہ یہاں آئے مگر وہ بھی شہید ہو گئے۔[1]

عرب خواتین کا جہاز وہ بھی ایک غیر مسلم راجہ کی طرف سے حجاج کی خدمت میں بھیجا گیا ہو، سندھ کی حدود میں لوٹ لیا جائے اور جب خلافت کی طرف سے یہاں کے راجہ سے اس کے بارے میں بات چیت کی جائے تو راجہ کا جواب نہایت غیر ذمہ دارانہ ہو، اور تادیبی کارروائی کے طور پر خلافت کی دو دو مہمات ناکام ہوں۔ یہ سب ایسے واقعات تھے جنھوں نے اموی خلافت اور حجاج کی امارت کے وقار کا مسئلہ پیدا کر دیا تھا، اور حجاج کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے ترکش کے آخری تیر کو داؤ پر لگا دے، چنانچہ اس نے ۹۲ھ میں محمد بن قاسم کو حکم دیا کہ تم فارس کی مہمات چھوڑ کر ہندوستان کا رخ کرو، اس وقت محمد بن قاسم رے کی مہم پر نکلنے کے لئے تیار تھے مگر اس حکم کے بعد ہندوستان پر فوج کشی کی تیاری میں مصروف ہو گئے، بلاذری کا بیان ہے:۔

وکان محمد بفارس، وقد امرہ ان یسیر الی الری، وعلی مقدمتہ ابو الاسود جہم بن زحر الجعفی،	محمد بن قاسم فارس میں امیر تھے اور حجاج نے ان کو رے کی مہم پر جانے کا حکم دیا تھا جس میں مقدمۃ الجیش کے امیر ابو الاسود جہم بن زحر جعفی تھے، مگر حجاج نے محمد بن قاسم کو اپنے پاس بلا لیا اور

[1] فتوح البلدان ص ۴۲۵

فردہ الیہ، وعقد لہ علی ثغر الھند واُمرہ ان یقیم بشیراز حتی یتتام الیہ اصحابہ ویوافیہ ماعدلہ[1]

ثغر ہند پر ان کو تعینات کیا، اور حکم دیا کہ وہ ابھی شیراز جاکر اتنی مدت ٹھہریں کہ ان کے پاس مزید فوج پہنچ جائے، اور جو ساز و سامان جمع کیا ہے وہ سب ان کو ملجائے۔"

اور مؤرخ یعقوبی کا بیان ہے :۔

وجّہ الحجاج محمد بن القاسم بن محمد بن الحکم بن ابی عقیل الثقفی الی السند، سنۃ اثنتین وتسعین، وأمرہ ان یقیم بشیراز من ارض فارس حتی یمکن الزمان فقدم محمد شیراز فاقام بھا ستۃ اشھر[2]

حجاج نے محمد بن قاسم ثقفی کو ۹۲ھ میں سندھ کی طرف روانہ کیا، اور حکم دیا کہ وہ شیراز میں اتنی مدت ٹھہریں کہ بحری سفر کا زمانہ آجائے، چنانچہ محمد بن قاسم حجاج کے پاس سے پہلے شیراز آئے، اور چھ ماہ وہاں قیام کیا،

محمد بن قاسم ؒ نے چھ ماہ تک شیراز میں رہ کر ہندوستان میں جہاد کے لئے پورا انتظام کر لیا، حجاج نے فارس کی فوجوں کے ساتھ ساتھ مزید چھ ہزار شامی فوج دی، اس کے علاوہ بے شمار متطوع اور فدائی حضرات بھی جمع ہو گئے، نیز ہر قسم کے ضروری سامان بہم پہنچائے گئے، اس کے بعد انھوں نے سندھ کا رخ کیا، اور شیراز سے چل کر ارمائیل میں فروکش ہوئے۔

ہندوستان میں امارت کے وقت محمد بن قاسم کی عمر

تقریباً تمام مؤرخوں نے ہندوستان کی امارت و فتوحات کے وقت محمد بن قاسم کی عمر صرف سترہ سال بتائی ہے، حالانکہ ان کی یہ عمر فارس کی امارت کے وقت تھی نہ کہ ہندوستان کی امارت و جہاد کے وقت، لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی دلیل صرف دو تین اشعار ہیں جو محمد بن قاسم کی اس کم عمری اور حداثتِ سن میں فارس کی امارت کے موقع پر بطور تہنیت کہے گئے تھے، خلیفہ بن خیاط نے ۹۳ھ میں دیبل کی فتح اور نیرون کی طرف کوچ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

قال ابو عبیدۃ ولاہ الحجاج، وھو ابن سبع عشرۃ سنۃ وفی ذلک یقول یزید

ابو عبیدہ نے بیان کیا ہے کہ جب حجاج نے محمد بن قاسم کو والی و امیر بنایا، اس وقت وہ سترہ سال کے تھے، اور اسی بارے میں

[1] فتوح البلدان ص۴۲۳، [2] تاریخ یعقوبی ج۲ ص۳۳۵،

بن الحکم:- یزید بن حکم کہتا ہے:-

ان الشجاعۃ والسماحۃ والندی لمحمد بن القاسم بن محمد

شجاعت اور شرافت اور سخاوت محمدؒ بن قاسم بن محمد کے لئے سزاوار ہے

قاد الجیوش لسبع عشرۃ حجۃً یا قرب ذلک سوددًا من مولد[1]

انھوں نے سترہؔ سال کی عمر میں فوجوں کی قیادت کی ان کی پیدائش اور سرداری کے درمیان کا زمانہ کتنا قریب ہے

ان اشعار میں فارس یا سندھ کی امارت و ولایت کا تذکرہ نہیں ہے مگر خواہ مخواہ اس کا انطباق سندھ کی ولایت اور فتح پر کیا گیا، حالانکہ درحقیقت یہ تہنیتی اشعار فارس کی ولایت اور وہاں پر فوجوں کی قیادت وسیادت کی مناسبت سے کہے گئے ہیں، اور ان دونوں شعروں کو مختلف شعراء کے نام سے معمولی فرق کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، کسی نے یزید بن حکم، کسی نے زیاد الاعجم اور کسی نے حمزہ بن بیض حنفی کا نام لیا ہے، اور مؤرخ یعقوبی نے تو اس وقت ان کی عمر صرف پندرہؔ ہی سال کی بتائی ہے، اور استدلال میں زیاد الاعجم کے نام سے ان ہی دونوں اشعار کو پیش کیا ہے مگر دوسرے شعر کے پہلے میں لسبع عشرۃ حجۃ کے بجائے لخمس عشرۃ حجۃ لکھ دیا ہے اس کی عبارت یہ ہے:-

وکان لمحمد بن القاسم فی الوقت الذی غزا فیہ بلاد السند والھند وقاد الجیوش وفتح الفتوح خمس عشرۃ سنۃ

محمدؒ بن قاسم نے جس وقت بلاد سندھ و ہند میں جہاد کیا، اور فوجوں کی قیادت کی، اور فتوحات حاصل کیں ان کی عمر پندرہؔ سال کی تھی،

اور جیسا کہ ہم نے کہا دلیل میں تیسرا مصرعہ یوں درج کیا ہے، قاد الجیوش لخمس عشرۃ حجۃ[2] ہندوستان کی فتوحات کے وقت محمد بن قاسم کی عمر سترہؔ سال بتلانے والوں میں ہمارے علم میں سب سے پہلے ابن قتیبہؒ ہیں جنھوں نے عیون الاخبار میں ابو الیقظان کے حوالہ سے یہ لکھا ہے:

ثم ولاہ السند فافتتح السند والھند، وقاد الجیوش وھو ابن سبع عشرۃ سنۃ

فارس کے بعد حجاج نے محمد بن قاسم کو سندھ کا والی بنایا اور انھوں نے سندھ اور ہندوستان کو فتح کیا اور

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ۱ ص ۲۸۷ ، [2] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۳۴

فقال فیہ الشاعر۔

فوجوں کی قیادت کی، اس وقت وہ سترہ سال کے تھے، اسی کے متعلق شاعر نے کہا ہے:۔

اس کے بعد شاعر کو بتایا ہے کہ حمزہ بن بیض حنفی ہے اور دونوں اشعار نقل کئے ہیں، اس میں پہلا مصرعہ یوں ہے "ان السماحۃ والمروۃ والندیٰ" اور چوتھے مصرعہ کے بارے میں لکھا ہے:۔

ویروی: یاقرب ذلك سورة من مولد" السورۃ المنزلۃ الرفیعۃ۔ [1]

ایک روایت میں سودداً" کے بجائے سورۃ" ہے جس کے معنیٰ بلند مرتبہ کے ہیں،

تعجب ہے کہ علامہ ابن قتیبہؒ نے ایک لفظ کے اختلاف وتحقیق کو پیش کیا مگر یہ تحقیق نہیں کیا کہ اگر ۹۲ھ میں فتح سندھ کے وقت محمد بن قاسمؒ کی عمر صرف سترہؔ سال کی تھی تو ۸۳ھ میں فتح فارس کے وقت ان کی عمر کیا رہی ہوگی، اور اس عمر میں کسی ملک کی ولایت تو کیا کوئی ذمہ داری بھی دی جاسکتی ہے؟ علامہ ابن حزمؒ نے اپنی دقتِ نظر کے باوجود سترہؔ سال ہی کو بیان کیا ہے۔

محمد بن القاسم الذی فتح بلاد الھند، ولہ سبع عشرۃ سنۃ [2]

محمد بن قاسمؒ نے بلاد ہند کو فتح کیا، اس وقت ان کی عمر سترہؔ سال تھی۔

علامہ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں ۹۲ھ کے واقعات میں فتح دیبل کا ذکر کرتے ہوئے محمد بن قاسمؒ کی عمر سترہؔ سال کی بتائی ہے۔

وافتتح محمد بن قاسم۔ وھو ابن عم الحجاج بن یوسف۔ مدینۃ الدیبل وغیرھا من بلاد الھند وکان قد ولاہ الحجاج غزو الھند وعمرہ سبع عشرۃ سنۃ [3]

حجاج بن یوسف کے برادر عم زاد محمد بن قاسمؒ نے دیبل وغیرہ ہندوستان کے شہر فتح کئے، اور ان کو حجاج نے ہندوستان میں جہاد کے لئے مقرر کیا تھا، اس وقت ان کی عمر سترہؔ سال کی تھی۔

اور چچ نامہ میں بھی یہی ہے ملاحظہ ہو "او را لولایت ہند نصب کرد، ہنوز در سن ہفدہ سالگی بود و بہ جہت تہنیت آں امارت حمزہ بن بیض الحنفی این شعر گفت" اسکے بعد مذکورہ بالا دونوں اشعار درج ذیل ہیں [4]

---

[1] عیون الاخبار ج۱ ص۲۲۹، [2] جمھرۃ انساب العرب ص۲۵۱، [3] البدایہ والنہایہ ج۹ ص۸۷، [4] چچ نامہ ص۹۶۔

علامہ بلاذری نے ان تمام مورخوں کے مقابلہ میں محمد بن قاسم کی سندھ اور ہند کی فتوحات کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے، مگر انھوں نے یہ بات نہیں کہی بلکہ ان کی گرفتاری اور موت کو بیان کرتے ہوئے، ان کے بارے میں حمزہ بن بیض حنفی کے یہ دونوں اشعار نقل کر دیئے ہیں، نیز اس ساتھ کسی دوسرے شاعر کا ایک شعر یہ نقل کر دیا ہے:۔

ساس الرجال لسبع عشرۃ حجۃ   ولداتہ عن ذاک فی اشغال[1]

محمد بن قاسم نے سترہ سال کی عمر میں مردانہ سیاست سے کام لیا اور لوگوں کو رام کیا جبکہ ہم عمر کھیل کود میں محو

اس شعر میں بھی ولایت فارس پر تہنیت دی گئی ہے اور اس وقت ان کی عمر سترہ سال بتائی گئی ہے۔ ہمارے مورخوں کے قول کو مان کر محمد بن قاسم کی عمر ۹۳ھ یا ۹۴ھ میں فتح ہندوستان کے وقت صرف سترہ سال کی تسلیم کر لی جائے تو ۸۳ھ میں جب کہ وہ فارس کے امیر بنائے گئے ان کی عمر چھ سات سال کی ماننی پڑے گی، جو ایک مضحکہ خیز بات ہوگی، اس عمر میں کسی بچہ کو ملک کی ولایت اور غزوات کی امارت تو دور کی بات ہے گھر کی کوئی معمولی سی ذمہ داری بھی نہیں دی جاتی ہے، درحقیقت فارس کی امارت کے وقت محمد بن قاسم کی عمر سترہ سال کی تھی، اور اسی موقع پر بعض شعرا نے ان کے کارناموں کو دیکھ کر یہ اشعار کہے تھے، اور اعتراف کیا تھا کہ محمد بن قاسم اپنی نوجوانی اور نوخیزی کے باوجود قابلیت و صلاحیت، مروت و شرافت اور دریا دلی اور سخاوت میں تجربہ کار سن رسیدہ بزرگوں کی صف کے آدمی ہیں، اور وہ اسی نوعمری میں اپنی انتظامی صلاحیت، اور سیاسی بصیرت کی وجہ اسلامی لشکر کے قائد و امیر بنے، عوام و خواص میں مقبول ہوئے، وہ بجا طور پر اس عمر میں اس منصب کے مستحق ہیں، ان اشعار کا تعلق ہندوستان کی امارت و فتح سے نہیں ہے، بلکہ اس وقت انکی عمر چھبیس ستائیس سال کی تھی، اور وہ فارس کی مہمات میں نو دس سال گزار چکے تھے۔

سندھ اور ہندوستان کی فتوحات کا اجمالی تذکرہ	ثقفی جوان اور مجاہد و فاتح حضرت محمد بن قاسم کی سوانح کا یہ المیہ بہت ہی افسوسناک ہے کہ انھوں نے مختصر سی زندگی میں فارس

[1] فتوح البلدان ص ۴۴۲۔

اور ہندوستان میں شاندار فتوحات حاصل کیں، نو دس سال تک فارس کے امیر رہے، اور باغیوں کی سرکوبی، اسلامی غزوات و فتوحات اور ملکی تعمیر و ترقی میں نمایاں خدمات انجام دیں، پھر کم و بیش چار سال تک سندھ اور ہندوستان میں اسلام کا بول بالا کیا، اس طرح ابتدائے جوانی سے لے کر جواں مرگی تک کل تیرہ ۱۳ چودہ ۱۴ سال میں انواع و اقسام کی اسلامی خدمت انجام دی، مگر ان کے ان عظیم الشان اور کثیر التعداد کارناموں کا عشر عشیر بھی ہماری تاریخوں میں نہ آسکا یقیناً واقدی کی کتاب اخبار فتوح بلاد السند، اور مدائنی کی کتاب ثغر الہند، کتاب عمال الہند اور فتح مکران میں محمد بن قاسم ؒ کی فتوحات کا مفصل تذکرہ رہا ہوگا، مگر یہ کتابیں ناپید ہیں، اور ان کا کہیں وجود نہیں معلوم ہوتا، البتہ ان کتابوں کی کچھ روایات سے جن کو بلاذری ؒ اور یعقوبی وغیرہ نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ ان فتوحات کا علم کسی نہ کسی حد تک ہوتا ہے، علامہ ابن اثیر اور علامہ ابن خلدون نے جو تھوڑی بہت تفصیل بیان کی ہے، وہ اُن ہی کتابوں کی رہین منت ہے اور طبری اور دوسرے مورخوں نے صرف ہندوستان کی فتوحات کی سن وار فہرست دیدی ہے، اس سلسلہ میں فارسی کی تاریخ چچ نامہ نسبتاً مفصل ہے، مگر دوسری مستند روایات کی تائید کے بغیر اس کو تسلیم کرلینا، تحقیقی ذہن و مزاج کے خلاف ہے، یہاں ہم کو ہندوستان کی فتوحات کا تفصیلی تذکرہ مقصود نہیں ہے اس لئے بلاذری اور یعقوبی کے بیان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

بلاذری کا بیان ہے کہ محمد بن قاسم شیراز سے مکران آئے پھر وہاں سے نکل کر قز پور، ارمائیل دیبل اور تیرون کو فتح کیا، اور دیبل سے ایک مہم سدوسان روانہ کی، اور فتح حاصل کرنے کے بعد وہاں اپنا حاکم و امیر مقرر کیا، پھر دریائے سندھ عبور کر کے علاقہ کچھ میں آئے جہاں راجہ داہر سے جنگ ہوئی اور وہ مارا گیا، اس کے بعد راور، برہمن آباد (منصورہ) الرور، بغرور، ساوندری، اور بسمد کو فتح کر کے دریائے بیاس کو عبور کر کے ملتان آئے اور اسے فتح کیا، یہاں چار ہزار مسلمانوں کو آباد کیا، اور جامع مسجد تعمیر کی، ابھی محمد بن قاسم ملتان کے انتظام میں

ؒ فتوح البلدان ص ۴۴۳ -

مصروف تھے کہ رمضان ۹۵ھ میں حجاج کا انتقال ہوگیا، اس خبر کو سن کر محمد بن قاسم الرور لغرور چلے آئے، اور یہاں سے ایک فوجی دستہ بھیلمان علاقہ گجرات کی طرف روانہ کیا اور بھیلمان اور سرست کو صلح کے ذریعہ فتح کیا، پھر کیرج آئے جہاں راجہ داہر کے لڑکے دوہر سے جنگ ہوئی اور وہ مارا گیا، البتہ ایل کیرج نے اطاعت قبول کرلی۔ اسی دوران میں ۹۶ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہوگیا، ایک مرتبہ حجاج نے ہندوستان کی فتوحات وغزوات کے دخل وخرچ کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ ساٹھ لاکھ کی رقم خرچ ہوئی ہے اور ایک کروڑ بیس لاکھ کی آمدنی ہوئی ہے، یہ دیکھ کر حجاج نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا کہ ہم نے اپنے دل کو تسکین دی، خون بہا پایا مزید ساٹھ لاکھ کی رقم ملی اور داہر کا سر نفع میں رہا۔ [1]

مؤرخ یعقوبی کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ۹۲ھ میں حجاج نے محمد بن قاسم کو سندھ کی طرف روانہ کیا، آپ نے مکران، فنزبور، ارمائیل اور دیبل کو فتح کیا، دیبل کی جنگ فیصلہ کن رہی، اس کے تمام علاقے مطیع بن گئے، اس کے بعد نیرون کو فتح کرکے حجاج سے آگے بڑھنے کی اجازت چاہی، حجاج نے لکھا ہے کہ تم جہاں تک فتح کروگے سب پر تمہاری حکومت وامارت ہوگی۔ نیز خراسان کے حاکم قتیبہ بن مسلم کو اسی قسم کا خط لکھا کہ تم دونوں (محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم) میں سے جو فتح کرتا ہوا حدود چین میں داخل ہوگا وہی وہاں کا امیر ہوگا، اس کے بعد محمد بن قاسم نے فاتحانہ سرگرمی تیز کردی، یہاں تک کہ دریائے سندھ کو عبور کرکے سہبان (سدوسان) کو فتح کیا، اور ساحلی علاقہ میں راجہ داہر سے مقابلہ ہوا جس میں وہ مارا گیا، پھر آگے بڑھ کر الرور اور دوسرے بلاد وامصار فتح کئے، اسی اثناء میں حجاج نے محمد بن قاسم کو لکھا کہ میں نے خلیفہ ولید کو ضمانت دی ہے کہ ہندوستان کی فتوحات میں جسقدر رقم خرچ ہوگی، میں اتنی رقم بیت المال میں داخل کردوں گا، لہٰذا تم مجھے اس ضمانت میں کامیاب کرکے رہائی کی صورت پیدا کرو، محمد بن قاسم نے یہ خط پاکر اصل خرچہ

[1] فتوح البلدان ملخص از صفحہ ۴۳۲ تا صفحہ ۴۴۴۔

سے زیادہ رقم ہندوستان سے روانہ کردی ۔ [1]

خلیفہ بن خیاط کی تاریخ سب سے پرانی سنہ وار تاریخ ہے، اس میں محمدؒ بن قاسم کی فتوحات کا سنہ وار ذکر یوں ہے، ۹۲ھ میں محمدؒ بن قاسم نے قزپور اور ارمائیل کو فتح کیا۔ ۹۳ھ میں دیبل فتح کر کے نیرون کی طرف کوچ کیا، اسی موقع پر حجاج کا خط ملا کہ تم جس قدر علاقہ فتح کروگے اس کے امیر تم ہی ہوگے۔ ۹۴ھ میں راجہ چچ مارا گیا، ۹۵ھ میں ملتان فتح کیا۔ [2] اور ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۹۳ھ میں محمدؒ بن قاسم کے ہاتھوں ہندوستان کی فتوحات مکمل ہوئیں۔ [3]

راجہ داہر سے جنگ ۹۳ھ

۹۳ھ میں محمدؒ بن قاسم اور راجہ داہر کی جنگ فیصلہ کن جنگ تھی اور داہر کے کام آجانے کے بعد پورا علاقہ مسلمانوں کے لئے صاف ہوگیا تھا حتی کہ کئی مورخوں نے لکھا ہے کہ اسی جنگ کے بعد سارا ہندوستان فتح ہوگیا تھا اور اسی سال کو یہاں کی فتح کا سال قرار دیتے ہیں، ہم اس جنگ کو ثقہ مورخوں کی روایت کے مطابق بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ فتح ہندوستان میں محمدؒ بن قاسمؒ کے چار سالہ غزوات و فتوحات کا حاصل ہے، بلاذری رح نے لکھا ہے کہ محمد بن قاسمؒ نے دریائے سندھ عبور کرنے کی یہ ترکیب کی کہ راجہ کچھ راسل کے علاقہ میں دریا پر پل باندھا اور وہیں سے اسے عبور کیا، راجہ داہر اسی علاقہ میں روپوش تھا۔ یکبارگی اسلامی فوج کے اس علاقہ میں داخل ہو جانے پر اس نے مقابلہ کی تیاری کی، وہ ہاتھی پر سوار تھا اور اس کے ارد گرد بہت سے ہاتھی تھے، مسلمانوں سے مقابلہ ہوا تو اس کی فوج کے ٹھاکروں نے اتنی بہادری سے جنگ کی کہ ویسی شدید جنگ سننے میں نہیں آئی تھی، راجہ داہر ہاتھی سے اتر کر زمین پر خود لڑتا تھا اور دن بھر کی سخت لڑائی کے بعد شام کو میدانِ جنگ میں کام آیا، اور اس کی فوج کو شکست ہوئی، مسلمانوں نے اس کا

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ملخص از صفحہ ۳۴۵ تا صفحہ ۳۴۷، [2] تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ۱ ص ۳۰۴ و ص ۳۰۵ و ص ۳۰۸ و ص ۳۰۹ ۔ [3] کتاب المعارف ص ۲۳۵،

پیچھا کر کے جیسے چاہا قتل کیا، مدائنی کی روایت کے مطابق راجہ داہر کو بنی کلاب کے ایک مجاہد نے قتل کیا تھا، اور اس موقعہ پر یہ اشعار کہے :-

الخیل تشہد یوم داھر والقنا	ومحمد بن القاسم بن محمد
جنگ داہر کے دن، شہسوار، اور نیزے	اور محمدؒ بن قاسم اس پر گواہ ہیں کہ
انی فرجت الجمع غیر معرد	حتّٰی علوت عظیمھم بمھند
میں نے مجمع کو پھاڑ کر دشمنوں کے بادشاہ پر	ہندی تلوار سے حملہ کیا
فترکتہ تحت العجاج مجدلا	متعفر الخدین غیر موسد
اور میں نے گرد و غبار کے نیچے پچھڑا ہوا یوں چھوڑا	کہ اس کے دونوں رخسار گرد آلود تھے اور سرہانے تکیہ بھی نہیں تھا

ابن کلبی کے بیان کے مطابق داہر کو قاسمؒ بن ثعلبہ بن عبداللہ بن حصن طائی نے قتل کیا تھا، منصور بن حاتم کا بیان ہے کہ بھڑوچ میں راجہ داہر اور اس کے قاتل دونوں کی تصاویر بنا کر یادگار قائم کی گئی، آخر میں بلاذریؒ نے لکھا ہے کہ :-

لمّا قتل داھر غلب محمد بن القاسم	راجہ داہر کے قتل ہو جانے کے بعد محمدؒ بن قاسم پورے
علی بلاد السند۔ [1]	سندھ پر قابض ہو گئے۔

خلیفہ بن خیاط نے حضرت امام کہمس بن حسن بصریؒ کا بیان یوں درج کیا ہے کہ میں جنگ داہر میں محمد بن قاسمؒ کے ساتھ تھا، راجہ داہر ہمارے مقابلہ میں زبردست فوج لیکر آیا، اس وقت اس کے ساتھ ستائیس جنگی ہاتھی، ہم بھی دریا پار کر کے ان کے مقابلہ میں آئے، نتیجہ کے طور پر اللہ تعالےٰ نے دشمن کو شکست دی اور راجہ داہر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا، تو ہم نے غنیم کا پیچھا کیا، اور مسلمانوں کا ایک دستہ ان کو قتل کر کے فوجی پڑاؤ میں واپس آیا، جب رات کا اندھیرا چھا گیا تو راجہ داہر ایک جمِ غفیر لے کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوا، جس کے ہاتھ میں ننگی تلواریں تھیں، اور ایک شدید ترین معرکہ کے بعد راجہ داہر اور اس کے

[1] فتوح البلدان ص۴۴۲ -

اکثر فوجی قتل ہو گئے اور جو باقی رہ گئے تھے بھاگ کھڑے ہوئے، محمد بن قاسمؒ نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے شہر برہماد (برہمن آباد) تک آئے، یہاں پھر دشمن کی ایک زبردست فوج نے مقابلہ کیا مگر محمد بن قاسمؒ نے اس سے جنگ کر کے شہر میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا، اور جب وہ شہر میں محصور ہو گئے تو اسے فتح کیا، اس کے بعد کیرج کو فتح کیا۔[۱] حضرت امام ابوالحسن کہمس بن حسن بصریؒ جلیل القدر تبع تابعی ہیں! امام وکیعؒ، اور امام عبداللہؒ بن مبارکؒ، وغیرہ کے استاذ ہیں، بڑے عابد و زاہد اور باخدا بزرگ تھے، عبادت کے ساتھ اپنی والدہ کی خدمت میں مشغول رہا کرتے تھے اور جب ان کا انتقال ہو گیا تو بصرہ سے مکہ مکرمہ چلے آئے اور یہیں ۱۴۹ھ میں انتقال فرمایا۔[۲]

محمد بن قاسمؒ کی گرفتاری اور موت ۹۶ھ افسوس کہ محمدؒ بن قاسم جیسے بہادر اور فاتح و منتظم نوجوان کو بنو امیہ کے دور کی گروہی عصبیت اور انتقام نے بہت جلد ضائع کر دیا اور ایک عظیم فاتح سے اموی دور محروم ہو گیا، اس وقت کچھ ایسے نامناسب حالات پیدا ہو گئے تھے کہ اپنے قابل سے قابل تر افراد کو انتقام اور عداوت کی بھینٹ چڑھا دینا معمولی بات اور عین کامیابی تھی۔

رمضان ۹۵ھ میں حجاج مرا، مرنے سے پہلے اس نے اپنے لڑکے عبدالملک اور یزید بن مسلم کو عراق کے خراج پر مقرر کیا، ربیع الاول ۹۶ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہوا اور سلیمان بن عبدالملک خلیفہ ہوا، اس نے عبدالملک بن حجاج کو ہٹا کر یزید بن ابی کبشہ کو عراق کے خراج پر رکھا، پھر اسی سال یزید بن ابی کبشہ اور یزید بن مسلم دونوں کو عراق سے برطرف کر کے یزید بن مہلب بن ابوصفرہ کو عراقین کا امیر و حاکم بنایا، اور صالح بن عبدالرحمٰن تمیمی کو امیر خراج مقرر کیا۔[۳] ادھر عراق میں یہ تبدیلیاں ہو رہی تھیں، ادھر محمد بن قاسم ہندوستان

---

[۱] تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ۱ ص ۳۰۴ ، [۲] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۵۱ ، و صفۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۲۳۵

[۳] کتاب المعارف ص ۱۵۵ و تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ۱ ص ۴۲۰ ۔

کی فتوحات میں آگے بڑھ رہے تھے کہ یکبارگی عداوت وانتقام کی آگ عراق میں بھڑکی جس کے شعلے ہندوستان میں پہنچے، اور محمد بن قاسم کی صالح جوانی اس بھٹی میں جل بھن گئی جسد و انتقام کی اس بھٹی کو یزید بن مہلب اور صالح بن عبد الرحمن نے جلایا اور اس کے لئے ایندھن مہیا کیا، کیونکہ حجاج اور اس کے خاندان اور عمال سے یزید بن مہلب اور صالح بن عبد الرحمن دونوں کو پرانی عداوت تھی اور دونوں ہی انتقام کے وقت کے انتظار میں تھے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ حجاج نے عراق کی گورنری کے زمانہ میں ۷۹ھ میں مہلب بن ابی صفرہ کو خراسان کا امیر بنایا جب وہ ذی الحجہ ۸۳ھ میں مرنے لگا تو اپنے بیٹے یزید بن مہلب کو اپنا جانشین مقرر کیا، اس وقت یزید کی عمر تیس سال کی تھی، جب خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کا دور آیا تو اس نے خراسان سے یزید کو ہٹا کر قتیبہ بن مسلم کو وہاں کی ولایت دی، یہ سب کام حجاج بن یوسف کے مشورہ سے ہوا، حالانکہ حجاج یزید کا بہنوئی تھا اور یزید کی بہن ہند بنت مہلب اس سے بیاہی تھی، مگر جواں سال یزید کی اقبال مندی پر حجاج حسد کرنے لگا اور اسے خطرہ ہوا کہ یہ شخص آگے چل کر کہیں میری جگہ نہ لے لے، ابن خلکان نے لکھا ہے:-

وکان الحجاج یکرہ یزید لما یری فیہ من النجابۃ فیخشیٰ منہ ان لا یترتب مکانہ فکان یقصدہ بالمکروہ فی کل وقت کے لا یثب علیہ،

حجاج یزید بن مہلب کی قابلیت کو دیکھ کر اس سے نفرت کرتا تھا اور ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کی جگہ نہ لے لے، اس لئے حجاج ہر وقت یزید کو ستایا کرتا تھا، تاکہ وہ حجاج کا مقام نہ پاسکے۔

آخر میں حجاج نے یزید بن مہلب کو گرفتار کر کے جیل میں بند کردیا مگر وہ کسی طرح نکل کر ملک شام میں سلیمان بن عبد الملک کے پاس پہنچا، سلیمان نے اپنے بھائی خلیفہ ولید بن عبد الملک سے کہہ سن کر معاملہ رفع دفع کرایا، جب سلیمان خلیفہ ہوا تو اس نے یزید بن مہلب کو پھر خراسان کی امارت دی، حجاج یزید کو گرفتار کرکے نہایت ہی سخت قسم کی سزا دیتا تھا، ایک مرتبہ یزید نے تخفیف کی التجا کی تو کہا کہ روزانہ ایک لاکھ درہم ادا کرو، چنانچہ اسی شرط اور جبر پر سزا میں

کمی بیشی ہوتی تھی، جس روز یہ رقم نہیں پہونچتی تھی، حجاج رات تک اسے سخت سے سخت سزا دیتا تھا۔[۱] نیز حجاج نے آلِ مہلب کو طرح طرح سے ستایا اور ان کو عبرتناک سزائیں دیں۔

آلِ مہلب اپنے دن لوٹنے کے انتظار میں خون کا گھونٹ پی پی کر زندگی گزارتے تھے، اور جوں ہی یزید بن مہلب ۹۶ھ میں عراق کا امیر ہوا بنو مہلب کے لوگ حجاج اور اسکے خانوادہ آلِ ابوعقیل کے درپے ہوگئے، پھر یزید بن مہلب کے ساتھ عراق کے خراج پر صالح بن عبدالرحمن کا مقرر ہونا جلتی آگ پر تیل چھڑکنے کے مرادف ہوگیا ہے۔ بلاذری کے بیان کے مطابق حجاج نے صالح کے بھائی آدم بن عبدالرحمن کو خوارج کا ساتھ دینے کے الزام میں قتل کیا تھا۔[۲] اس لئے صالح نے بھی عراق کی امارت پاکر حجاج کے خاندان سے اپنے بھائی کا انتقام لیا اور آلِ ابی عقیل کو انواع واقسام کی تکالیف دیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یزید بن مہلب اور صالح بن عبدالرحمن کی طرح خلیفہ سلیمان بھی آلِ ابوعقیل کے خلاف تھا چنانچہ اسی نے ان کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کا حکم جاری کیا تھا، خلیفہ بن خیاط کا بیان ہے :۔

کتب سلیمان بن عبد الملک الی صالح بن عبد الرحمن ان یاخذ آل ابی عقیل و یحاسبھم فولی صالح حبیب بن المھلب حرب الھند، و یزید بن ابی کبشۃ الخراج، فاقام بھا یزید بن ابی کبشۃ اقل من شھر ثم مات و استخلف اخاہ عبید اللہ بن ابی کبشہ فعزلہ صالح، و ولی عمران بن نعمان الکلاعی،

سلیمان نے صالح کو لکھا کہ وہ آلِ ابوعقیل کو گرفتار کرکے ان سے حساب لے۔ صالح نے ہندوستان کی جنگ پر حبیب بن مہلب اور یہاں کے خراج کی وصولی پر یزید ابوکبشہ کو مقرر کیا، یزید ایک ماہ سے کم ہی مدت میں مرگیا اور اپنے بھائی عبیداللہ کو اپنا جانشین بنا گیا، مگر صالح نے اسے معزول کرکے اس کی جگہ عمران نعمان کلاعی کو مقرر کیا، پھر کچھ دنوں کے بعد حرب اور خراج دونوں کا محکمہ حبیب بن مہلب کے حوال

---

[۱] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۴۱۴ و ۱۵
[۲] فتوح البلدان ص ۴۴۲

ثم جمع حربها و خراجها لحبیب بن المهلب[1] کر دیا۔

ادھر عراق میں سندھ کے انتظامات میں یہ رد و بدل ہو رہا تھا اور ادھر محمد بن قاسمؒ ہندوستان کے سیاہ و سفید کے مالک کی حیثیت سے غزوات و فتوحات میں مشغول تھے اسی دوران میں وہ انتقامی سازش کا شکار ہو کر گرفتار ہوئے اور عراق بھیجے گئے، جہاں صالح بن عبد الرحمن نے دوسرے بہت سے آل ابو عقیل کے ساتھ محمد بن قاسم کو بھی انواع و اقسام کی سخت سے سخت تکلیف دی، یہاں تک کہ یہ سب کے سب اسی حالت میں لقمۂ اجل بن گئے، بلاذری کا بیان ہے۔

وولی سلیمان بن عبد الملک فاستعمل صالح بن عبد الرحمن علی خراج العراق، وولی یزید بن ابی کبشۃ السکسکی السند، فحمل محمد بن القاسم مقیدا مع معاویۃ بن المهلب، فحبسه صالح بواسط، فعذبه صالح فی رجال من آل ابی عقیل حتی قتلهم، وکان الحجاج قتل آدم اخا صالح، وکان یری رای الخوارج۔[2]	سلیمان نے صالح کو عراق کے خراج کی وصولی پر مقرر کیا تو اس نے یزید بن ابو کبشہ سکسکی کو سندھ کا والی بنایا، جس نے محمد بن قاسم کو قید کر کے معاویہ بن مہلب کے ساتھ عراق روانہ کیا، اور صالح نے ان کو واسط کے قید خانہ میں قید کیا، پھر ان کو اور آل ابو عقیل کے لوگوں کو طرح طرح کی تکلیف دے کر مار ڈالا" حجاج نے صالح کے بھائی آدم بن عبد الرحمن کو خوارج کے ہمنوا ہونے کے جرم میں قتل کیا تھا۔

خیاط اور بلاذری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ سلیمان نے صالح بن عبد الرحمن کو آل ابو عقیل کے خلاف کارروائی کرنے کا پورا اختیار دے دیا تھا تاکہ وہ ان کے امراء و حکام کی آمدنیوں کا حساب لے، اور جرم کی شکل میں اپنی صوابدید سے سزا دے، گویا آج کل کی طرح فوجی عدالت قائم کر کے صالح کو اس کا جج مقرر کیا ابن خلکان نے یزید بن مہلب کے ذکر میں اتنی تصریح اور کی ہے کہ آل ابی عقیل کو سزا اور عذاب دینے کا کام عبد الملک بن مہلب کے سپرد تھا۔[3] صالح نے یہ اختیار پاتے ہی سندھ کے نظام میں اپنی

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ا صـ۳۲۳ ، [2] فتوح البلدان صـ۴۴۲ ، [3] ابن خلکان ج ۲ صـ۲۶۲ ،

مصلحت ومنشاء کے مطابق مالیاتی اور حربی دو شعبے قائم کئے، اور حربی شعبہ کا افسر اعلیٰ حبیب بن مہلب کو بنایا، اور مالیاتی صیغہ یزید بن ابی کبشہ کے حوالے کیا، جس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے قید کیا اور حبیب بن مہلب کے بھائی معاویہ بن مہلب کی نگرانی میں جو اس وقت اپنے بھائی کے ساتھ سندھ میں تھا، محمد بن قاسم کو عراق بھیج کر صالح بن عبد الرحمٰن کے قبضہ میں دے دیا، اس نے محمد بن قاسم کو صرف حجاج کے خانوادہ اور آلِ ابو عقیل میں ہونے کی وجہ سے اس خاندان کے دوسرے سر برآوردہ افراد کے ساتھ واسط کے جیل خانہ دیماس میں جسے حجاج نے بنوایا تھا اور یزید بن مہلب کو اس میں رکھ کر سزا دی تھی، بند کر کے ان کو طرح طرح کی سخت سزائیں دیں حتیٰ کہ اسی تعذیب و سزا کی حالت میں جیل خانہ کے اندر محمد بن قاسم اور دیگر آلِ ابو عقیل تکالیف کی تاب نہ لا کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

مؤرخ یعقوبیؒ نے اس موقع پر یزید بن ابی کبشہ کی امارتِ خراج کا ذکر نہیں کیا ہے اور حبیب بن مہلب کی امارت کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ اسی نے محمد بن قاسم کو گرفتار کیا، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

فوجه سليمان حبيب بن المهلب اليها فدخل البلاد وقاتل قوماً كانوا ناحية مهران، واخذ محمد بن القاسم فالبسه المسوح وقيده، وحبسه، [۱]

سلیمان نے حبیب کو سندھ کی طرف روانہ کیا اس نے یہاں آکر دریائے سندھ کے علاقہ میں دشمن سے جنگ کی، اور محمد بن قاسم کو پکڑ کر ٹاٹ پہنایا اور گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔

اگرچہ اس بیان میں نہ محمد بن قاسم کے صالح کے پاس عراق بھیجنے کا ذکر ہے اور نہ ان کے جیل خانہ میں مرنے کی تصریح ہے، مگر واقعہ یہی ہے کہ ان کو جیلخانہ میں طرح طرح کی سزا دیکر کام تمام کیا، علامہ ابن حزم نے ان دونوں مورخوں کی تصریح کے خلاف لکھا کہ محمد بن قاسم نے یزید بن مہلب کی شدید ترین سزا برداشت نہ کرتے ہوئے خودکشی کر لی تھی، ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

[۱] تاریخ یعقوبی ج ۲ صفحہ ۳۵

وقتل نفسہ فی عذاب یزید بن المہلب[1]	محمد بن قاسم نے یزید بن مہلب کے عذاب میں خودکشی کرلی تھی،

والیٔ عراق یزید بن مہلب کی ایذا رسانی سمجھ میں آتی ہے، جو پہلے حجاج کے ہاتھوں مصائب کا شکار ہوچکا تھا، یقیناً وہ بھی اپنے بھائیوں حبیب بن مہلب اور معاویہ بن مہلب کی طرح محمدؒ بن قاسم کی گرفتاری اور ایذا رسانی میں پیش پیش تھا، اور صالح بن عبدالرحمن کے انتقام میں اس کا انتقام بھی شامل تھا۔ مگر یزید بن مہلب یا صالح بن عبدالرحمان کی قید اور ایذا رسانی میں محمدؒ بن قاسم کا خودکشی کرلینا صحیح نہیں معلوم ہوتا، غالباً علامہ ابن حزم کو اشتباہ پیدا ہوگیا ہے اور انھوں نے بیٹے کے واقعہ کو باپ سے منسوب کردیا ہے۔ درحقیقت محمد بن قاسمؒ کے صاحبزادے عمرو بن محمد بن قاسم نے سندھ میں محمد بن غزوان کلبی کی تعذیب وایذا رسانی میں خودکشی کرلی تھی، جیساکہ ان کے حالات میں معلوم ہوگا۔

محمد بن قاسمؒ کی موت کے ان تین واقعاتی بیانات کے مقابلہ میں ایک افسانوی بیان بھی ہے جو چچ نامہ میں درج ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد بن قاسم نے راجہ داہر کی دو لڑکیوں سریا دیو، اور پرمل دیو کو خلیفہ ولید بن عبدالملک کی خدمت میں بھیجا۔ جب ولید نے سریا دیو کو پاس بلایا تو اس نے کہا کہ ہم خلیفہ کے قابل نہیں رہ گئی ہیں، ہم سے محمدؒ بن قاسم نے تعلق پیدا کیا ہے، یہ سنتے ہی خلیفہ ولید نے غصہ میں آکر محمدؒ بن قاسم کو خط لکھا کہ تم فوراً اپنے کو کچی کھال میں بند کرکے دربارِ خلافت میں حاضر کرو، اس وقت محمدؒ بن قاسم مقام اودھاپر میں تھے، فوراً حکم کی تعمیل کی گئی اور اسی حال میں عراق روانہ کئے گئے مگر دو دن کے بعد راستہ میں مرگئے، جب لاش دربار میں پہونچی تو سریا دیو نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ راجہ داہر اور دوسرے راجوں کا بدلہ لے لیا، خلیفہ کو عقل اور دوراندیشی سے کام لینا چاہیے تھا، یہ سن کر خلیفہ نے دونوں بہنوں کو دیوار میں چنوادیا۔[2]

چچ نامہ میں یہ افسانہ مدائنی کے حوالہ سے درج ہے، حالانکہ بلاذری، یعقوبی اور خلیفہ

---

[1] جمہرۃ انساب العرب ص۲۶۸ ، [2] چچنامہ ص۲۴۲ ،

بن خیاط، سندھ کی اس دور کی فتوحات اور واقعات کو عموماً مدائنی ہی کی روایت سے بیان کرتے ہیں، مگر ان میں سے کسی نے اس داستان کی طرف اشارہ تک نہیں کیا ہے، معلوم نہیں صاحب چچ نامہ کو ۶۱۳ھ میں یہ کہانی کہاں سے مل گئی، جسے بعد کے فارسی تذکرہ نگاروں نے آنکھ بند کر کے اپنی کتابوں میں نقل کر دیا چنانچہ میر معصوم بھکری، نظام الدین بخشی اور میر شیر علی قانع تتوی نے اس روایت کو درج کیا ہے، اس کے جھوٹ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ چچنامہ میں محمد بن قاسم کے راجہ داہر کی لڑکیوں کے ولید کے پاس بھیجنے کے سلسلے میں یہ عبارت درج ہے :-

"محمد بن قاسم بدست خادمان حبشی بحضرت دار الخلافہ بہ بغداد فرستادہ بود" (صـ ۲۴۳)

حالانکہ اس وقت بغداد کا نام ونشان تک نہیں تھا، اسے تو خلیفہ منصور عباسی نے ۱۴۶ھ میں آباد کیا کرایا ہے۔

یورپ کے مریضان فکر و نظر مستشرقین و محققین اسی افسانوی روایت کو محمد بن قاسم کی موت کے بارے میں بیان کرتے ہیں اور اس کو صحیح قرار دینے کے لئے اپنا سارا زور خرچ کرتے ہیں۔

اپنا مرثیہ شرافت و اطاعت محمد بن قاسم کی فطرت میں داخل تھی، انھوں نے ہندوستان کی چہار سالہ فتوحات میں اپنی فوج اور رعایا میں بے پناہ مقبولیت حاصل کرلی تھی، اگر وہ چاہتے تو اموی خلافت و حکومت کے خلاف راجوں مہاراجوں کو لے کر صف آرا ہوجاتے، مگر انھوں نے نہایت شرافت و مروت اور انسانیت سے اپنے آپ کو حوالۂ زنجیر و زنداں کردیا۔ اور اس موقعہ پر صرف یہ ایک شعر زبان پر لائے جس میں اپنی ذات کے ضائع ہوجانے سے زیادہ خلافت کے نقصان عظیم ہوجانے پر غم ظاہر کیا۔ ؎

اضاعونی وای فتی اضاعوا	لیوم کریھۃٍ، وسداد ثغرٍ
یہ لوگوں نے کیا کیا کہ مجھ سے جوان کو ضائع کردیا	جو میدانِ جنگ میں اور سرحد کی حفاظت کے دن کام آتا

پھر جب واسط کے قید خانہ دیماس میں بے پناہ مظالم سے دوچار ہوئے تو نہایت ثابت قدمی اور صبر و استقامت کے ساتھ سب کچھ سہ لیا مگر اپنی شرافت و کرامت پر حرف نہیں آنے دیا اور ان چند اشعار میں گویا اپنا مرثیہ خود ہی کہا:۔

فلئن ثویت بواسط و بارضها　　رهن الحديد مكبلاً مغلولاً

اگر میں اس وقت واسط کی سرزمین میں　　زنجیروں کے حوالہ کر دیا گیا ہوں اور ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں

فلرب فتية فارسٍ قد رعتُها　　ولرب قرن قد تركتُ قتيلاً

تو میں اس سے پہلے فارس کے بہت سے جوانوں کو لرزہ براندام کر چکا ہوں اور بہت سے بہادروں کو موت کا مزا چکھا چکا ہوں

نیز آپ کے حبسیات واسط میں یہ اشعار ہیں:۔

لو كنت جمعت القرار لوطئت　　اناثٌ اعدت للوغى و ذكور

اگر مجھے اطمینان و سکون نصیب ہوتا تو میں　　میدانِ جنگ کو شبِ عروسی بنا دیتا

وما دخلت خيل السكاسك ارضنا　　ولا كان من عك علىّ امير

ہماری بستی میں بنو سکسک کے سوار کبھی داخل نہیں ہوئے تھے　　اور نہ قبیلہ عک میں سے کسی نے مجھ پر حکومت کی

ولا كنت للعبد المزونى تابعاً　　فيالك دهر بالكرام عثور[1]

اور نہ ہی میں کبھی عمانی غلام کے تابع رہا مگر افسوس　　کہ زمانہ شریفوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتا ہے

محمد بن قاسم نے ان اشعار میں اپنے گرفتار کرنے والوں اور سزا دینے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا ہے، اور ان کے مقابلہ میں اپنے خاندان کو اعلیٰ و اشرف بتایا ہے، یزید بن ابی کبشہ سکسکی بنو سکسک سے تھا جس نے ان کو گرفتار کیا تھا اور یزید بن مہلب اور حبیب بن مہلب اور معاویہ بن مہلب، جو سازش و سزا میں شریک تھے۔ بنو ازد سے تھے جن کا وطن عمان ہے، فارسی میں عمان کو مزون کہتے ہیں۔ ان اشعار سے بھی چچ نامہ کی کہانی غلط معلوم ہوتی ہے اور یہ کہ ان کے گرفتار کرنے والے اور سزا دینے والے فلاں فلاں گرے پڑے قبائل کے تھے

اہلِ ہند کا سوگ

انقلابات زمانہ کی یہ کتنی عبرت ناک صورت ہے کہ یہی ثقفی نوجوان اپنے اقبال

[1] فتوح البلدان ص۳۲۶،

کے دور میں جب نوخیزی میں فارس کا امیر بنایا گیا تو شعرائنے اس کی سترہ سالہ نوجوانی کی تہنیت کے نغمے سنائے، اور ہر طرف اس نوخیز فاتح ومجاہد کے کارناموں کی دھوم مچ گئی، مگر جب اس کے ادبار کا زمانہ آیا تو اس نے اپنی موت سے پہلے اپنا مرثیہ کہا، اور مرنے کے بعد کسی شاعر نے ایک شعر سے بھی اس پر اظہار رنج وغم نہیں کیا، البتہ محمدؒ بن قاسمؒ کی ہندوستانی رعایا اپنے عادل، شریف اور قابل حاکم کی مظلومانہ موت پر بہت روئی اور اپنے ملک میں اپنی رسم کے مطابق شاندار یادگار قائم کی۔

فبکی اھل الھند علی محمد، وصوروہ بالکیرج[1]	اہل ہند محمد بن قاسمؒ کی موت پر بہت روئے، اور انھوں نے کیرج میں اُن کا مجسمہ بناکر یادگار قائم کی۔

حضرت محمدؒ بن قاسم کی عمر انتقال کے وقت لگ بھگ تیس سال کی تھی، ان کے ایک صاحبزادے عمرو بن محمد بن قاسم ہیں جو باپ کی طرح ہندوستان کے عظیم فاتح گذرے ہیں۔

آلِ ابی عقیل اموی دور میں طوفان کی طرح اٹھے اور آندھی کی طرح ختم ہوئے، یہی حال ان کے حریف آلِ مہلب کا ہوا کہ شعلے کی طرح بھڑکے اور خاکستر کی طرح بجھ گئے، عباسی دور میں آل برامکہ کا عروج وزوال بڑا عبرتناک واقعہ ہے، مگر ان سے پہلے عروج وزوال کی یہ دونوں داستانیں اپنے اندر بڑی عبرت رکھتی ہیں، یہ کہنا ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آلِ ابو عقیل اور آل مہلب کی تباہی میں بڑا ہاتھ حجاج بن یوسف کی حریفانہ سیاست کا ہے جس نے اپنے مقابلہ میں دوسروں کا ابھرنا پسند نہ کر کے ان کو ستانا شروع کر دیا تھا، اس کے مرنے کے بعد اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اموی دور کے بہت سے اچھے اچھے فاتح ومجاہد اور حاکم وامیر باہمی عداوت وانتقام کی بھٹی میں جل بھن کر خاکستر ہوئے، جن میں محمدؒ بن قاسم ثقفی جیسے لوگ بھی تھے۔

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۲۵،

(۴)

امیرِ ہند عمرو بن محمد بن قاسم ثقفیؒ

فاتح ہند بن فاتح ہند، امیر سندھ بن امیر ہند عمرو بن محمد بن قاسم بن محمد بن حکم بن ابو عقیل ثقفیؒ کے حالاتِ زندگی بھی باپ کی طرح بہت کم ملتے ہیں بلکہ کہنا چاہئے کہ ملتے ہی نہیں، ہندوستان کی ابتدائی اسلامی تاریخ میں یہ المیہ کوئی نیا اور تنہا نہیں ہے، یہاں کے بہت سے مجاہدوں، امیروں، اور فاتحوں کے حالاتِ زندگی اور کارنامے لوحِ تاریخ پر نقش بن کر نہ ابھر سکے، باپ اور بیٹے کے حالات میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے: محمد بن قاسم کا شباب اپنی آب و تاب کے ساتھ، فارس میں چمکا اور سندھ و ہند میں اسکی حرارت نے اپنے جوہر دکھائے، اور واسط کے قید خانہ میں بجھا دیا گیا، بیٹا بھی جوانی میں سندھ کے مطلع سے چمکا اور سندھ میں بیس سال تک مختلف حیثیات سے اپنی جلوہ گری دکھاتا رہا اور سندھ ہی میں موت کی آغوش میں سو گیا۔

عمرو بن محمد قاسم اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے، یا ان کے اور بھی اولاد تھی، اس کا پتہ نہیں مگر ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے یہی صاحبزادے تھے جو اَلْوَلَدُ صِنْوُ لِاَبِیْہِ کے مصداق تھے، ان کی زندگی کی کتاب سندھ میں ۱۰۵ھ سے مرتب ہونی شروع ہوئی اور یہیں پر ۱۲۵ھ میں ختم ہو گئی، یہی بیس سالہ دورِ زندگی ان کی تاریخ کا کل سرمایہ ہے، وہ ۱۰۵ھ سے ۱۲۰ھ تک حکم بن عوانہ کلبی کی رفاقت و معیت میں سندھ کی امارت و حکومت کے اہم کام کرتے رہے، کئی فتوحات حاصل کیں، کئی ملکی معاملات سلجھائے اور شہر منصورہ آباد کر کے ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب و ثقافت

کا قلعہ تعمیر کیا، جس کی مرکزیت تقریباً چھ صدیوں تک باقی رہی، ۱۲۰ھ سے ۱۲۲ھ تک حکم بن عوانہ کلبی کی غیر موجودگی میں سندھ کے غزوات وفتوحات میں ان کی نیابت کے مفوضہ امور انجام دیئے، اور ۱۲۲ھ ۱۲۵ھ تک یہاں پر مستقل امیر وحاکم بن کر کئی اہم فتوحات حاصل کیں، فوجی بغاوت فرد کی اور تادیبی کارروائیاں کیں، ۱۲۵ھ میں معزول کر دیئے گئے، مگر سندھ کی سرزمین نے ان کو یہاں سے جانے نہیں دیا حتیٰ کہ ۱۲۶ھ میں والی سندھ محمد بن غزوان کلبی نے ان کو گرفتار کیا، اور اس کی قید میں عمرو بن محمد بن قاسم نے جان دیدی

اموی خلافت کا یہ درمیانی دور فتوحات وغزوات کے اعتبار سے بہت ہی تابناک ہے، اور اس دور میں دنیا کے بڑے بڑے ممالک عالم اسلام کے نقشے میں شامل ہوئے، مگر اس دور میں اندرونی سازشیں، رقیبانہ حرکتیں اور امراء وعمال کی باہمی چپقلشیں تیزی سے اپنے جوہر قابل کو کھو رہی تھیں، اور بڑے بڑے فاتح اس اندرونی سیاست کی نذر ہو رہے تھے، چنانچہ محمد بن قاسم اور ان کے صاحبزادے عمرو بن محمد بن قاسم بھی اسی سیاست کی بھینٹ چڑھ گئے، عمرو کا تذکرہ درحقیقت ان کے والد محمد بن قاسم کے تذکرہ کا تتمہ ہے، انھوں نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر ان کے مقبوضہ بلاد وامصار میں گویا ان کی نیابت کی اور ان ہی کے اصولوں پر سندھ میں کام کئے۔

ابتدائی حالات عمرو بن محمد بن قاسم بن محمد بن حکم بن ابو عقیل ثقفی کا تذکرہ کسی کتاب میں مستقل طور سے نہیں مل سکا، البتہ تاریخ یعقوبی، فتوح البلدان اور تاریخ طبری میں ضمنی طور سے ان کے مختصر حالات موجود ہیں جو بس غنیمت ہیں، تعجب ہے کہ صاحب چچ نامہ نے بھی ان کا کہیں نام تک نہیں لیا ہے، اور نہ ہی اس میں ایسا اشارہ ملتا ہے جس سے معلوم ہو کہ محمد بن قاسم کے کوئی اولاد تھی، عمرو بن محمد بن قاسم کی والدہ کا نام اور حال معلوم نہ ہو سکا یہ جو مشہور ہے کہ محمد بن قاسم حجاج بن یوسف کے داماد تھے، غلط ہے ورنہ عمرو کی والدہ حجاج کی بیٹی ہوتی، ایک قول کی بنا پر حجاج کی بہن زینب بنت

یوسف، محمد بن قاسم سے منسوب تھی، اس قول کی رو سے عمرو کی والدہ یہی زینب بنت
یوسف ثقفیہ ہوگی، مگر ابن اثیر نے تصریح کی ہے کہ حجاج کی بیٹی زینب ۸۳ھ میں ایک
موقع پر سواری سے گر کر فوت ہوگئی[1] اور اسی سال محمد بن قاسم سترہ سال کی عمر میں علاقہ
فارس کے حاکم و امیر بنائے گئے، اگر اس سے پہلے عمرو بن محمد بن قاسم پیدا ہوئے ہیں تو
زینب ان کی ماں ہوگی مگر ہمارا خیال ہے کہ عمرو کی پیدائش ۸۳ھ کے بعد محمد بن قاسم
کی فارس کی امارت و ولایت کے زمانہ میں ہوئی ہے، اور انہوں نے زندگی کے ابتدائی
دن اپنے والدین کی معیت میں فارس میں بسر کیے ہیں، اس سے زیادہ عمرو کی پیدائش
اور طفولیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

۱۰۵ھ سے ۱۲۰ھ تک حکم بن عوانہ کے ساتھ سندھ کی امارت و حکومت میں اسلامی خدمات

محمد بن قاسم ۹۶ھ میں واسط کے قید خانہ میں واصل بحق ہوگئے، اس کے نو سال کے بعد صاحبزادے عمرو بن محمد کا نام پہلی بار دیکھنے اور سننے
میں آتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مدت میں سندھ ہی میں موجود تھے، اور
خلافت کے ملکی و انتظامی امور میں دخل رکھتے تھے، یہ ان کا عنفوانِ شباب کا زمانہ
تھا، جو فارس کے بعد سندھ میں گذر رہا تھا، مگر اس مدت میں ان کے نام کہیں نہیں ملتا،
حالانکہ اس درمیان میں خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کے زمانہ میں سندھ کی ولایت پر
یزید بن ابی کبشہ، عبید اللہ بن ابی کبشہ، حبیب بن مہلب اور عمران بن نعمان کلاعی آئے،
حضرت عمر بن عبد العزیز کے وقت عمرو بن مسلم باہلی والی ہوئے، یزید بن عبد الملک کی
طرف سے ہلال بن احوز مازنی تمیمی آئے اور ہشام بن عبد الملک نے جنید بن عبد الرحمٰن
مری اور تمیم بن زید قینی کو یہاں یکے بعد دیگرے حاکم بنایا اور ان سب ولاۃ و حکام نے

[1] الکامل ج ۴ ص ۱۹۶۔

یہاں کے غزوات و فتوحات اور ملکی انتظامات میں حصہ لیا مگر عمرو بن محمد بن قاسم ان میں سے کسی کے ساتھ نظر نہیں آتے، یہاں تک کہ خلیفہ ہشام بن عبد الملک نے تمیم بن زید قینی کے بعد ۱۱۰ھ میں حکم بن عوانہ کلبی کو سندھ کی ولایت دی اور انہوں نے عمرو بن محمد بن قاسم کی جواں سال صلاحیت سے خوب کام لیا، اور اپنے پورے دور میں ہر موقع پر ان کو ابھرنے اور کھلنے کی آزادی دی،

بلاذری نے لکھا ہے کہ ہشام بن عبد الملک نے تمیم بن زید قینی کو سندھ کا امیر بنا کر بھیجا، مگر ان کا دور امارت کامیاب نہیں رہا اور جگہ جگہ بغاوت سرکشی اور خود مختاری کی دبا پھیل گئی، تمیم بن زید دیبل کے قریب ماء الجوامیس نامی ایک تالاب کے پاس انتقال کر گئے، اس کے بعد ہشام نے (۱۱۰ھ کے حدود میں) حکم بن عوانہ کلبی کو یہاں کا حاکم بنایا، انہوں نے یہاں آتے ہی اپنی دور اندیشی اور قابلیت سے بگڑے ہوئے حالات درست کئے، اور مسلمانوں کے لیے ایک شہر محفوظہ کے نام سے آباد کیا، اس زمانہ میں خالد بن عبد اللہ قسری عراق کا امیر و حاکم تھا، سندھ میں عمال کا عزل و نصب اسی کے اختیار میں تھا، اور حکم بن عوانہ اس کے ماتحت حاکم تھے، سندھ میں آتے ہی حکم بن عوانہ کی نگاہ جوہر شناس عمرو بن محمد بن قاسم پر پڑی، اور انہوں نے عمرو کی صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے دور امارت کو چار چاند لگائے، عمرو نے بھی خدمت کا میدان وسیع پاکر اپنے باپ کی طرح بہتر مجاہدانہ و فاتحانہ خدمات انجام دیں، اور خوب ترقی کی، بلاذری نے بیان کیا ہے۔

وکان عمرو بن محمد بن القاسم مع الحکم، وکان یفوض إلیہ ویقلدہ جسیم أمورہ وأعمالہ فأغزاہ من المحفوظۃ	عمرو بن محمد بن قاسم حکم بن عوانہ کے ساتھ کام کرتے تھے، حکم ان کو اپنی امارت و حکومت کے اہم امور و معاملات سونپ کر ذمہ دار بناتے تھے، حکم نے ان کو محفوظہ

فلما قدم علیہ وظفر، أمرہ أن یبنی دون البحیرۃ مدینۃ وسماھا المنصورۃ فھی التی ینزلھا العمال الیوم[1]	شہر کے مرکز سے جہاد کی مہم پر بھیجا، جب عمرو مظفر و منصور واپس آئے تو حکم نے حکم دیا کہ وہ دریا سے کچھ دور ایک شہر آباد کریں، حکم نے اس شہر کا نام منصورہ رکھا، جہاں آج تک (۲۵۵ھ) امراء و عمال قیام کرتے ہیں۔

اس مختصر بیان سے ہم کئی نتائج اخذ کر سکتے ہیں مثلاً۔

(۱) عمرو بن محمد بن قاسم ۱۰۵ھ حکم بن عوانہ کی آمد سے پہلے ہی نوعمری کے باوجود ملکی معاملات میں بصیرت و شہرت رکھتے تھے۔

(۲) حکم بن عوانہ، عمرو بن محمد سے اپنی حکومت و امارت کے کلیدی کام لیتے تھے اور ملک کے اہم معاملات ان کو سپرد کرتے تھے، حتیٰ کہ غزوات و فتوحات میں ان ہی کو امیر بنا کر بھیجتے تھے، اور محفوظہ کے اسلامی مرکز سے جو مہم روانہ کرتے تھے اس کے سربراہ عمرو بن محمد ہوتے تھے۔

(۳) حکم بن عوانہ کی امارت میں ان ہی کے حکم سے عمرو بن محمد نے شہر منصورہ کو بسایا تھا۔ جو اپنی آبادی کے دن سے بنو امیہ اور بنو عباسیہ کے عمال و ولاۃ کا دار الامارہ رہا، اس کے بعد ملوک ہبار یہ کا دار السلطنت قرار پایا اور کئی صدیوں تک سندھ میں اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا رہا، الغرض عمرو بن محمد بن قاسم نے حکم بن عوانہ کی ماتحتی میں ۱۰۵ھ سے ۱۲۰ھ تک تقریباً پندرہ سال ہندوستان میں اسلام کی شاندار خدمات انجام دیں، ملکی انتظامات میں حصہ لیا، غزوات و فتوحات

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۳۱۔

کی مہمات کو سر کیا، اور منصورہ جیسا اسلامی اور دینی مرکز آباد کیا، اس کے بعد ۱۲۰ھ میں حکم بن عوانہ پر ایک مصیبت آئی اور انہوں نے عمرو بن محمد کو اپنی فوج کے شہ سواروں کا مستقل امیر مقرر کیا۔

۱۲۰ھ سے ۱۲۲ھ تک حکم کی فوجی نیابت | یعقوبی کا بیان ہے کہ حکم بن عوانہ کے ساتھ عمرو بن محمد بن قاسم اور اعیان و اشراف کی ایک جماعت رہا کرتی تھی، اور وہ سندھ کی امارت پر رہ کر مفوضہ خدمات انجام دیتے تھے، اسی درمیان میں خلیفہ ہشام نے خالد بن عبداللہ قسری کو عراق سے معزول کیا اور یوسف بن عمرو ثقفی کو عراق کا امیر بنایا، یوسف بن عمرو ثقفی نے یہ منصب پاتے ہی خالد بن عبداللہ قسری کے مقرر کردہ امراء و عمال پر سختی شروع کر دی اور خالد بن عبداللہ کے سابقہ امور و معاملات کی سختی سے جانچ پڑتال کی اور اتنی زیادہ تکلیف دی کہ خالد بن عبداللہ تاب نہ لاکر فوت ہو گیا، نیز اس کی سختی سے بلال بن بردہ بھی اپنی جان حزیں کھو بیٹھے، چونکہ حکم بن عوانہ، خالد قسری کے بنائے ہوئے امیر اور سندھ میں اس کے نائب تھے اس لیے جب ان کو یوسف ثقفی کی سخت گیری اور تعذیب کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے بارے میں بھی سخت خطرہ محسوس کیا اور کہا إما فتح یرضی بہ یوسف و إما شھادۃ استریح بھا منہ یعنی میں یا تو ایسی فتح حاصل کروں گا جس سے یوسف خوش ہو جائے یا پھر شہادت پاکر سکون پا جاؤں گا، اور عمرو بن محمد بن قاسم کو اپنی فوج کے شہ سواروں کا امیر مقرر کر کے خود جہاد میں نکل گئے اور دشمن سے جہاد کرتے ہوئے (۱۲۲ھ میں) جام شہادت نوش کیا، اس موقع پر یعقوبی کے الفاظ یہ ہیں:-

وکان استخلف علی الخیل عمرو بن محمد بن القاسم الثقفی[1] | حکم نے جہاد میں جاتے ہوئے عمرو بن محمد بن قاسم کو سوار فوج پر اپنا نائب بنایا۔

مطلب یہ کہ عمرو بن محمد ۱۲۰ھ سے ۱۲۲ھ تک سندھ میں اسلامی فوج کے امیر رہے اور حکم بن عوانہ کے نائب کی حیثیت سے فوجی خدمات انجام دیتے رہے۔

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۸۹۔

سندھ کی مستقل امارت ۱۲۲ھ سے ۱۲۵ھ تک

عمرو بن محمد نے تقریباً پندرہ سال ہند (سندھ) میں حکم بن عوانہ کی معیت و ماتحتی میں بیش بہا خدمات انجام دیں،

پھر دو سال تک ان کی غیر موجودگی میں فوجی امیر رہے، اس کے بعد ۱۲۲ھ سے ۱۲۵ھ تک سندھ کے مستقل امیر و حاکم رہے اور اس مختصر سی مدت امارت میں شاندار کارنامے انجام دیئے، اور حکم بن عوانہ کی امارت کے پہلے دن سے ان کی شہادت کے دن تک سندھ میں ان کے نائب بن کر ہر قسم کی مہمات میں حصہ لیا اور یہاں کے سرد و گرم کا تجربہ حاصل کیا۔ ان ترجیحی وجوہ کی بنا پر عمرو بن محمد، حکم بن عوانہ کی شہادت کے بعد سندھ کی امارت کے مستحق تھے، مگر حکم کی شہادت کے بعد ایک مدمقابل نکل آیا جس کا پہلے سے کہیں تذکرہ نہیں ملتا ہے اور نہ اس کا کوئی کارنامہ تھا، یہ یزید بن عرار نامی ایک شخص تھا، حکم کی شہادت کے بعد عمرو بن محمد اور یزید بن عرار میں سندھ کی امارت کے لیے کشمکش پیدا ہو گئی اور جب بات طول پکڑ گئی اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو اس کے بارے میں عراق کے گورنر یوسف بن عمرو ثقفی کو لکھا گیا جو سندھ کے معاملات کا ذمہ دار تھا، اس نے معاملہ کی نزاکت کو دیکھکر خلیفہ ہشام کو لکھا، ہشام نے یوسف بن عمر کو لکھا کہ اگر عمرو بن محمد بن قاسم سن کہولت کو پہنچ گئے ہوں تو ان ہی کو سندھ کا والی بناؤ، عمرو بن محمد بن قاسم ابھی پکی عمر کو نہیں پہنچے تھے، مگر چوں کہ ثقفی تھے اور یوسف بن عمرو بھی ثقفی تھا، اس لیے خاندانی تعلق اور ثقیفیت کی وجہ سے یوسف بن عمرو نے عمرو کی طرفداری کی اور یزید بن عرار کے مقابلہ میں ان ہی کو سندھ کا امیر بنا کر سرکاری کاغذات اور عہد نامہ وغیرہ ان کے نام روانہ کیا، عمرو بن محمد نے سندھ کی امارت پاتے ہی یزید بن عرار کو گرفتار کیا اور جیل خانہ میں ڈال دیا[1]

ایک شاندار فتح اور پورے علاقہ سندھ کی اطاعت

بلاذری کا بیان گذر چکا ہے کہ عمرو بن محمد نے حکم بن عوانہ کے دور امارت میں ان ہی کے حکم سے منصورہ آباد کیا تھا، مگر یعقوبی نے لکھا ہے کہ عمرو بن محمد نے سندھ کی مستقل امارت پا کر پہلے یزید بن عرار

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۸۹،

کو گرفتار کیا، پھر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دریا سے کچھ دور منصورہ شہر آباد کیا، اور اسے امراء و حکام کا مستقر بنا کر اسی مرکز سے غزوات و فتوحات کا سلسلہ جاری کیا، اثنائے جنگ میں ایک موقعہ پر دشمن کی بچی کھچی فوج نے سنبھالا لیا اور ایک شخص کو اپنا راجہ بنا کر منصورہ پر چڑھائی کر دی اور چاروں طرف سے اسے گھیر لیا، دشمن کا یہ وار بہت سخت تھا، عمرو بن محمد نے عراق کے گورنر یوسف بن عمرو کو خط لکھ کر صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کمک طلب کی، یوسف نے عراق سے چار ہزار تازہ دم فوج بھیجی، اس فوج نے آتے ہی دشمن سے سخت مقابلہ کیا، اور راجہ کو اپنی فوج لے کر منصورہ سے پسپا ہونا پڑا، اس طرح عمرو بن محمد دشمن کے نرغے سے بچ سکا، اسکے بعد اس نے یلغار و حصار کا بدلہ لینے کی تیاری کی، اور ایک بھاری فوج تیار کر کے معن بن زائدہ شیبانی کو اس کے مقدمۃ الجیش کا امیر بنایا، اور اسلامی فوج نے راجہ کی فوج پر شب خون مارا، اور بڑی بے جگری سے میدانِ جنگ میں جم کر مقابلہ کیا اس گھمسان کی جنگ کے نتیجہ میں راجہ کی فوج کا بڑا حصہ میدان میں کام آیا، اور خود راجہ بھی زخموں سے چور ہو کر ایک جگہ گر پڑا، اسلامی فوج کو اس کی خبر نہ مل سکی اور اس کی فوج کے کچھ آدمیوں نے بھاگتے ہوئے اُسے دیکھ لیا، نظر پڑتے ہی سب کے سب الراہ الراہ (رائے، رائے) یعنی راجہ پکار اُٹھے، اور اسے اپنے ساتھ لے کر اس طرح بھاگے کہ ان میں سے کسی نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، اس واقعہ کے بعد سندھ کا پورا علاقہ عمرو بن محمد بن قاسم کا مطیع ہو گیا۔[1]

عمرو بن محمد کے خلاف مروان بن یزید بن مہلب کی فوجی بغاوت اور ناکامی

حجاج بن یوسف نے یزید بن مہلب اور آلِ مہلب کو حسد اور رقابت میں بری طرح پریشان کیا تھا اور اس کی زندگی ہی میں اس خاندان کے اقبال کا سورج اِدبار کے گہن میں بے نور ہونے لگا تھا، پھر بعد میں یزید بن مہلب اور صالح بن عبدالرحمٰن نے خلیفہ سلیمان کی شہ پر حجاج بن یوسف کے خاندان ابو عقیل کے افراد کو گرفتار کر کے قتل کرنا شروع کیا تھا کہ اسی رقیبانہ و حاسدانہ سیاست نے محمد بن قاسم

---

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۸۹۔

ثقفی جیسے کام کے آدمی سے اموی دورِ خلافت کو محروم کر دیا، اور آلِ مہلب نے آل ابوعقیل سے پورا انتقام لیا، مگر اب تک اس آگ کی چنگاریاں مہلبیوں کے سینے میں دبی ہوئی تھیں اور بچے کھچے آل ابوعقیل کو جلانے کے لیے جہاں موقع ملتا تھا ابھر جاتی تھیں، چنانچہ عمرو بن محمد بن قاسم بھی ایک مرتبہ ان کی لپیٹ میں آتے آتے بچا، اور ایک مہلبی کے فتنہ سے محفوظ رہا۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ جن دنوں عمرو بن محمد بن قاسم سندھ کے غزوات و فتوحات میں مصروف تھا، اور اس کی فوجیں میدان جنگ میں کام کر رہی تھیں، یزید بن مہلب کے بیٹے مروان بن یزید مہلب نے جو کہ فوج میں امیر تھا ایک نیا گل کھلایا، اور عمرو بن محمد کے خلاف فوجی بغاوت کرا دی، اس نے فوجی افسروں کی ایک جماعت کو عمرو بن محمد کے مقابلہ کے لئے ابھارا اور ان باغی افسروں اور فوجیوں نے اسلامی فوج کے ساز و سامان اور جانوروں کو لوٹنا شروع کر دیا، آخر کار عمرو بن محمد کو اس بغاوت کے خلاف تادیبی کارروائی کرنی پڑی اور معن بن زائدہ شیبانی اور عطیہ بن عبدالرحمٰن کو ساتھ لے کر مقابلہ کے لیے نکلا، اور باغی فوج کو شکست دے کر منتشر ہونے پر مجبور کر دیا، مروان بن یزید بن مہلب بھی میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا، عمرو بن محمد کو معلوم تھا کہ یہ کام مروان بن یزید کا ہے اور اسی نے میری فوج کے ایک حصّہ کو گمراہ کیا ہے۔ اس لیے اس نے میدان جنگ میں اعلان کیا کہ "ابن مہلب کے علاوہ تمام لوگوں کے لئے امن ہے"، اس اعلان کے بعد باغی فوج مطیع ہو گئی اور مروان بن مہلب کا پتہ بتا دیا، اور عمرو بن محمد نے اسے تلاش کر کے قتل کر دیا[1]۔ یزید بن عرار کے فتنہ کے بعد مروان بن یزید بن مہلب کا یہ دوسرا فتنہ بہت خطرناک تھا جسے عمرو بن محمد بن قاسم نے کامیابی کے ساتھ ختم کیا، اور ان دونوں میں سے کسی کا اثر عمرو بن محمد کی امارت یا زندگی پر نہیں پڑ سکا، مگر ان دنوں ایک تیسرا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا جسے اگرچہ عمرو بن محمد نے ختم کر دیا، مگر اس کے دوررس اثرات سے نہ بچ سکا، اور بعد میں اسی نے اس کی جان لی۔

---

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۸۹ و ص ۳۹۰۔

محمد بن غزان کلبی کی تادیب | امام طبری نے ۱۲۶ھ کے واقعات و حوادث کے بیان میں لکھا ہے کہ عمرو بن محمد بن قاسم نے سندھ میں اپنی حکومت کے زمانہ میں محمد بن غزان کلبی کو گرفتار کر کے مار پیٹا اور والی عراق یوسف بن عمرو کے پاس بھیج دیا، یوسف نے بھی محمد بن غزان کو سزا دی اور ایک بڑی رقم بطور جرمانہ کے اس پر عائد کی، اور حکم دیا کہ ہر جمعہ کو اس رقم کا ایک حصہ ادا کرتا رہے ورنہ عدم ادائیگی کی صورت میں پچیس کوڑے مارے جائیں گے، یہ پوری رقم محمد بن غزان ادا نہ کر سکا اور کوڑوں کی مار کھائی، جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ کی انگلیاں سوکھ گئیں[1] یہ نہ معلوم ہو سکا کہ عمرو بن محمد نے محمد بن غزان کلبی کو کس جرم میں یہ سزا دی اور دلوائی، غالباً اس نے بھی سندھ میں اپنی امارت کا دعوی کیا ہوگا، حکم بن عوانہ بھی کلبی تھے اور محمد بن غزان بھی کلبی تھا، اسی کلبیت نے اسے استحقاق سمجھایا ہوگا، یہ واقعہ ۱۲۶ھ سے پہلے کا ہے، اور جب ۱۲۶ھ میں یوسف بن عمرو کی جگہ عراق کی گورنری منصور بن جمہور کلبی کو ملی تو عمرو بن محمد کے حق میں اس کا نتیجہ موت کی صورت میں ظاہر ہوا، جیسا کہ بعد میں معلوم ہوگا۔

۱۲۵ھ میں سندھ کی امارت سے معزولی | ۱۲۵ھ میں خلیفہ ہشام بن عبد الملک کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ ولید بن عبد الملک خلیفہ ہوا، اس نے سندھ کے معاملات میں تبدیلی پیدا کی اور عمرو بن محمد بن قاسم کو معزول کر کے اس کی جگہ اس کے سابق حریف و رقیب یزید بن عرار کو سندھ کی امارت دی، اور اس کی دیرینہ تمنا پوری ہوئی، بقول یعقوبی یزید بن عرار نے سندھ میں بڑی کامیاب حکومت کی، اور یہاں غزوات و فتوحات کی آٹھ کامیاب مہمات انجام دیں، اس نے یزید بن عرار کے متعلق یہ بھی لکھا ہے۔

وکان میمون النقیبۃ[2]۔	یزید بن عرار پاک طینت آدمی تھا۔

یزید بن عرار نے سندھ میں حکومت و امارت پانے کے بعد عمرو بن محمد بن قاسم سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا، ورنہ اگر وہ چاہتا تو گذشتہ سزاؤں کا بدلہ لے سکتا تھا، یہ اس کی

[1] تاریخ طبری ج ۷، ص ۲۷۲ (دار المعارف مصر)۔ [2] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۴۰۰۔

شرافت طبع اور سلامت روی کی بات تھی، حالانکہ عمرو بن محمد معزولی کے ساتھ سندھ ہی میں رہے یہاں تک کہ ولید بن یزید کی خلافت کا تیرہ چودہ ماہہ دور ختم ہوگیا، اور ۱۲۶ھ میں یزید بن ولید بن عبد الملک کی خلافت ہوئی، اور عمرو بن محمد کی موت کے دن قریب آگئے۔

۱۲۶ھ میں عمرو بن محمد بن قاسم کی موت

یزید بن ولید بن عبد الملک نے ۱۲۶ھ میں خلیفہ ہوتے ہی یوسف بن عمرو ثقفی کی جگہ عراق کی گورنری منصور بن جمہور کلبی کو دی، جب یوسف کو اس کی خبر لگی تو وہ ملک شام کی طرف بھاگ گیا، منصور بن جمہور نے عراق کی حکومت پاتے ہی سندھ کی امارت میں ردو بدل کیا اور یزید بن عرار کو معزول کر کے اس کی جگہ عمرو بن محمد بن قاسم کے حریف محمد بن غزان کلبی کو مقرر کیا، اس کے ساتھ اسے سجستان کی امارت بھی دی اور محمد غزان بیک وقت سندھ اور سجستان دونوں علاقوں کا امیر و حاکم بن گیا اب وہ عمرو بن محمد بن قاسم سے اپنا انتقام لینے کے لیے تیار ہوگیا، امارت پاکر پہلے سجستان گیا، اور وہاں یزید بن ولید کے لیے بیعت لی، اس کے بعد سندھ آیا، یہاں آنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عمرو بن محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے قید کیا اور پولیس کے ایک دستہ کو نگرانی پر مقرر کر کے خود نماز پڑھنے کے لئے چلا گیا، عمرو بن محمد بن قاسم نے موقع پاکر پولیس کی تلوار لے لی، اور نیام سے نکال کر اس پر اس طرح اپنے کو ڈال دیا کہ تلوار شکم کے اندر گھس گئی۔ یہ حال دیکھ کر لوگ چیخنے چلانے لگے، محمد بن غزان شور سن کر باہر نکلا اور صورت حال کے بارے میں پولیس وغیرہ سے معلومات لیں، پھر عمرو بن محمد بن قاسم سے پوچھا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی ہے؟ عمرو نے جواب دیا کہ تمہاری سزا اور تکلیف کے ڈر سے میں نے یہ اقدام کیا ہے، محمد بن غزان نے کہا کہ میں تم کو کتنی ہی سخت سزائیں دیتا مگر تمہارے ساتھ یہ حرکت نہ کرتا جو تم نے خود اپنے ساتھ کی ہے، اس واقعہ کے تین دن کے بعد عمرو بن محمد بن قاسم کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد محمد بن غزان نے سندھ میں خلیفہ یزید بن ولید کے حق میں بیعت لی[1] — علامہ ابن حزم نے جو یہ لکھا ہے کہ محمد بن قاسم نے یزید بن مہلب کی قید میں خودکشی کر لی تھی، شاید ان کو ان کے بیٹے عمرو بن محمد بن قاسم کے اس واقعہ سے اشتباہ ہوگیا ہے

[1] تاریخ طبری ج ۷، ص ۲۰۲

(۵)

امام ربیع بن صبیح بصری ہندیؒ

حضرت امام حسن بصری متوفی ۱۱۰ھ رحمۃ اللہ علیہ کے دو بصری شاگردوں کو ہندوستان سے خصوصی تعلق تھا، اور ان کے واسطہ سے آپ کے فیوض و برکات اس ملک میں پھیلے ہیں، ان میں سے ایک حضرت امام ابو حفص ربیع بن صبیح بصری ہندی صاحب الحسن فقیہ ہیں، اور دوسرے حضرت امام ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری ہندی صاحب الحسن محدث ہیں۔

اول الذکر ۱۶۰ھ میں ہندوستان کے علاقہ گجرات میں ایک جہاد میں آئے اور یہیں فوت ہوئے، اور ثانی الذکر کئی بار ہندوستان آئے گئے۔

امام حسن بصریؒ کے ان دونوں تلامذہ کا ہندوستان سے خصوصی تعلق رکھنا اس خاص ذہن کی بنیاد پر تھا، جسے حضرت امام حسن بصریؒ نے ہندوستان کے بارے میں ان میں پیدا فرمایا تھا، اس سلسلہ میں امام حسن بصریؒ کے وطن بصرہ اور ان کی زندگی کے بعض حالات پر توجہ ضروری ہے، آپ کا آبائی وطن عراق کا ایک معمولی سا شہر میسان تھا جسے دشت میسان بھی کہتے ہیں، اور جو بصرہ کے نشیبی علاقہ میں واقع تھا، علامہ سمعانی نے میسان کے بارے میں لکھا ہے:

ھی بُلیدۃ بأسفل البصرۃ[1] — میسان بصرہ کے نشیبی علاقہ میں ایک چھوٹا سا شہر ہے

آپ کے والد یسار وہیں سے گرفتار کر کے مدینہ منورہ لائے گئے، اور آپ کی پیدائش

[1] کتاب الانساب ورق۔

عہدِ فاروقی میں مدینہ منورہ میں اور نشو و نما وادی القریٰ میں ہوئی، مگر آپ نے بصرہ کو مستقل مسکن بنایا، بصرہ عراق کا وہی مقام ہے جو پہلے ارض الہند کے نام سے مشہور تھا، یہاں کی قریبی بندرگاہ "ابلہ" میں عمان، بحرین، فارس، ہندوستان اور چین کے تجارتی جہاز آکر ٹھہرتے تھے۔

۱۴ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عتبہ بن غزوان رضؓ کو ایرانیوں سے مقابلہ کے لیے عراق کے اس علاقہ میں امیر لشکر بنا کر بھیجا تو فرمایا اے عتبہ! میں نے تم کو ارض الہند کا امیر بنایا ہے، یہ مقام ہمارے دشمن ایرانیوں کی بہت بڑی جولانگاہ ہے[1] عتبہ رضؓ نے یہاں پہونچ کر ایرانیوں سے مقابلہ کیا اور جب ابلہ جو بصرہ سے تھوڑے فاصلہ پر تھا فتح ہوا تو عتبہؓ نے حضرت عمر رضؓ کو لکھا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ابلہ پر فتح دی، یہاں پر عمان، بحرین فارس، ہندوستان اور چین سے بحری کشتیاں آکر ٹھہرتی ہیں[2]۔

پھر حضرت عمر رضؓ کے حکم سے عتبہ نے ابلہ کے پاس ہی بصرہ آباد کر کے ارض الہند کو تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل کیا اور قبۃ الاسلام بصرہ اور ہندوستان کے درمیان وہ دینی، علمی فکری اور ثقافتی تعلق پیدا ہوا جس کے مقابلہ میں دورِ جاہلیت کے تمام تجارتی اور معاشی تعلقات ہیچ ہو گئے، اور ارض الہند کے آس پاس ابلہ، اور میسان وغیرہ میں ہندوستان کی جو روایات بکھری ہوئی تھیں وہ سب سمٹ سمٹا کر بصرہ میں آگئیں۔

بصرہ کی مرکزیت اور ہندوستان سے اس کے قدیم و جدید تعلقات کی وجہ سے حضرت امام حسن بصریؒ اور ان کے دونوں تلامذہ ربیع بن صبیح بصریؒ اور اسرائیل بن موسیٰ بصریؒ کو سرزمینِ ہند سے ایک خاص قسم کا علمی اور دینی ربط پیدا ہو گیا۔

مزید برآں یہ کہ امام حسن بصری ۴۳ھ سے ڈھائی سال تک سجستان کے شہر زرنگ میں ربیع بن زیاد حارثی کے میر منشی (سکریٹری) رہے، یہ مقام جو آج کل افغانستان میں واقع

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۲ ص۲۰۶ طبع مصر، [2] الاخبار الطوال دینوری ص۱۱۷ طبع مصر،

ہے، سیاسی اور تہذیبی لحاظ سے بڑی حد تک سندھ سے تعلق رکھتا تھا، امام حسن بصریؒ کے زمانۂ قیام میں کابل فتح ہوا جو ان دنوں کئی وجوہ سے سندھ سے نسبت رکھتا تھا، امام حسن بصری نے ہندوستان کی سرحد پر واقع اس شہر کے جہاد میں پوری دلچسپی لی۔ کیا عجب ہے کہ آپ حدودِ سندھ میں بھی تشریف لائے ہوں، کابل کی جنگ میں عباد بن حصین حنظلی نے بڑی بہادری دکھائی تھی، امام حسن بصری نے اس جہاد میں ان کے کارناموں کی داد ان الفاظ میں دی ہے۔

ماظننت رجلاً یقوم مقام ألف، حتی رأیت عباد بن حصین[1]

جب میں نے عباد بن حصین کے کارناموں کو دیکھا تو مجھے یقین آیا کہ ایک آدمی ایک ہزار آدمیوں کے قائم مقام ہو سکتا ہے۔

یہی عباد بن حصین ہیں جن کے نام پر بعد میں عبادان آباد ہوا، اور امام ربیع بن صبیح نے اسی عبادان کو اپنا مرکز بنایا جس کی تفصیل بعد میں آرہی ہے۔

خود حضرت امام حسن بصری علم و زہد کے ساتھ ساتھ بہت بڑے مجاہد بھی تھے، اور اپنے بہادرانہ کارناموں کی وجہ سے اس میں بھی شہرت کے مالک تھے، ان کے اس خاص وصف کا اعتراف ان کے دور کے بڑے بڑے فوجی افسروں اور بہادروں کو بھی تھا، آپ علم و روحانیت کی طرح ڈیل ڈول اور جسمانیت میں بھی بھاری بھر کم شخصیت کے مالک تھے اور صحیح معنوں میں ان لوگوں میں سے تھے جن کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے بسطۃً فی العلم والجسم کا وصف بیان فرمایا ہے، اصمعی نے اپنے والد کا قول نقل کیا ہے کہ امام حسن بصری سے زیادہ چوڑی کلائی کا آدمی میں نے نہیں دیکھا، ان کی کلائی کی چوڑائی ایک بالشت تھی[2] حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ امام حسن بصری بہادروں میں سے تھے، جعفر بن سلیمان کا بیان ہے

---

[1] فتوح البلدان، ص ۳۸۰ طبع مصر، [2] وفیات الاعیان، ابن خلکان ج ۱ ص ۱۳۹ طبع ایران۔

کہ مہلب بن ابی صفرہ آپ کو ہمیشہ لڑائیوں میں آگے رکھتا تھا[۱] مہلب بن ابی صفرہ اموی دورِ خلافت میں سجستان کا گورنر تھا جس نے سندھ تک میں اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے امن و امان قائم کیا تھا، وہ ان ہی جنگوں میں امام حسن بصری کو آگے آگے رکھتا تھا؛

آپ نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے علم و عمل کی زندگی میں مجاہدانہ سرگرمیاں پورے طور پر جاری رکھی، اور کتاب و سنت کی بزم کے ساتھ تیغ و سنان کے رزم کو بھی سنبھالا، امام ذہبیؒ کا بیان ہے کہ حسن بصری نے ہوش سنبھالنے کے بعد جہاد اور علم و عمل کو اپنے لئے لازم قرار دیدیا، آپ مشہور بہادروں میں سے ایک تھے، اور بہادری میں آپ کا تذکرہ قطری بن فجارہ کے ساتھ کیا جاتا تھا[۲] قطری بن فجارہ مشہور خارجی بہادر گذرا ہے، حضرت مصعب بن زبیرؓ کے زمانہ میں اس نے خروج کیا، اور بیس سال تک لڑتا رہا اور حجاج بن یوسف اپنے زمانہ میں اس کے مقابلہ کے لیے یکے بعد دیگرے فوجی مہم روانہ کرتا رہا؛

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حسن بصریؒ نے سیاسی اور جنگی معاملات میں حصہ لیا، اور اپنے مجاہدانہ کارناموں میں معاصرین میں نام آوری حاصل کی، یہی رنگ آپ کے تلامذہ کی زندگی میں نمایاں رہا، اور انہوں نے بھی اسلامی علوم کی خدمت و اشاعت کے ساتھ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے جہاد و غزوات میں حصہ لیا، ان میں امام ربیع بن صبیح بصریؒ اپنے استاذ کے عکس معلوم ہوتے ہیں، اور زہد و تقویٰ، ذکر و فکر، علم و عمل کی طرح جہاد و غزوہ میں ان کے پرتو ہیں۔

نام و نسب آپ کا نام ربیع، والد کا نام صبیح اور کنیت ابو حفص اور ابوبکر ہے، مگر ابو حفص زیادہ مشہور ہے، قبیلہ بنو سعد کے آزاد کردہ غلام ہیں، اس لیے سعدی کی نسبت سے متعارف ہیں، صبیح بروزن فعیل ہے مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوریؒ تحفۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں:۔

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۲ ص۲۷ طبع حیدر آباد [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص۶۷ طبع حیدر آباد۔

وھو ابن صبیح بفتح الصاد المھملۃ السعدی البصری[1]	ربیع کے والد صبیح میں صاد کو زبر ہے، وہ بصری اور سعدی ہیں۔

امام بخاریؒ نے تاریخ کبیر میں[2] اور ابن سعدؒ نے طبقات کبریٰ میں[3] ان کی کنیت ابو حفص بتائی ہے، امام ربیع کی وِلا کا تعلق جس قبیلہ بنو سعد سے ہے، اسے امام بخاریؒ نے صرف بنی سعد لکھا ہے، اور عام طور سے ان کو بنو سعد بن تمیم بتایا گیا ہے، مگر ابن سعد نے بنی سعد بن زید بن مناۃ بن تمیم لکھا ہے آپ کا اصلی وطن بصرہ تھا، جس پر تمام تذکرہ نویس متفق ہیں۔

حصولِ تعلیم اور شیوخ آپ نے دوسری صدی ہجری کے اوائل میں آنکھ کھولی، جس میں ہر اعتبار سے اسلام ترقی پذیر تھا، سندھ سے لے کر مغرب اقصیٰ تک مجاہدین اسلام کے قافلے رواں دواں تھے، ہر طرف اسلامی شان و شوکت اور فتح و نصرت کا پھریرا لہرا رہا تھا پورا عالم اسلام دینی علوم و فنون کے اساتذہ و تلامذہ سے معمور تھا، آپ کا وطن قبۃ الاسلام بصرہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز بنا ہوا تھا، اس ماحول کی برکتوں سے آپ پوری طرح فیضیاب ہوئے، اور اس دور کے جلیل القدر علماء سے علم حاصل فرمایا، اور اس زمانہ کی سب سے بڑی اور پر عظمت شخصیت حضرت امام حسن بصریؒ کے اسوہ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا، آپ کے شیوخ و اساتذہ میں علم دین کے یہ ائمہ و اساطین شامل ہیں۔

امام حسن بصریؒ، امام عطاء بن ابی رباح مکیؒ، امام یزید رقاشیؒ، امام قیس بن سعدؒ، امام حمید الطویلؒ، امام ابو الزبیرؒ، امام ابو غالب صاحب امامہؒ، امام ثابت بنانیؒ، امام مجاہد بن جبرؒ وغیرہ رحمہم اللہ[4] امیر ابن ماکولا نے آپ کے شیوخ میں حازم کرمانی اور

---

[1] تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی ج ۴ ص ۲۰۸ طبع دہلی۔ [2] التاریخ الکبیر ج ۲ قسم اول ص ۲۵۴
[3] طبقات ابن سعد ج ۷ قسم دوم ص ۳۶ [4] کتاب الجرح والتعدیل ج ۱ قسم ثانی ص ۴۶۴ اور تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۷۔

اور حبان الصائغ کو بھی شمار کیا ہے[1] یہ تمام اساتذہ و شیوخ اپنی اپنی ذات سے علم دین کی ایک ایک انجمن تھے، جن کے فیوض و برکات سے پورا عالم اسلام متمتع ہو رہا تھا، اس فہرست میں اس دور کے ہر علم و فن کے ائمہ موجود ہیں، محدث، فقیہ، جرح و تعدیل کے امام، عباد و زہاد اور غازی و مجاہد سب ہی امام ربیع کے اساتذہ شامل ہیں، اس سے آپ کی جامعیت اور فضل و کمال کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

تلامذہ اور اصحاب اسی طرح آپ کے تلامذہ و اصحاب میں اس دور کے ہر طبقۂ علم و فن کے ارباب کمال پائے جاتے ہیں، جن میں سر فہرست حضرت امام محمد بن حسن شیبانیؒ صاحب امام ابو حنیفہؒ کا نام نامی ملتا ہے، آپ نے براہ راست امام ربیع سے احادیث کی روایت کی ہے، چنانچہ کتاب الحجہ علی اہل المدینہ میں مختلف مقامات پر امام محمدؒ نے اخبرنا الربیع بن صبیح البصری کہہ کر ان سے یزید رقاشی اور حسن بصری کی مرویات نقل فرمائی ہیں[2]۔ ان کے علاوہ امام ربیع کے حلقۂ تلامذہ میں یہ ائمہ دین پائے جاتے ہیں،

امام سفیان ثوریؒ، امام عبدالرحمن بن مہدیؒ، امام عبداللہ بن مبارکؒ، امام وکیع بن جراح، امام ابو الولیدؒ، امام ابو الولید طیالسیؒ، امام آدم بن ابی ایاسؒ، امام علی بن عاصمؒ، امام سلیمان دارانیؒ، امام محمد بن قاسم اسدیؒ، امام علی بن جعدؒ، امام سعید بن عامرؒ، اور امام روحؒ وغیرہ رحمہم اللہ[3] آپ کے ان شاگردوں میں بھی ائمۂ حدیث، ائمۂ فقہ، ائمۂ جرح و تعدیل اور مجاہد و غازی موجود ہیں۔

علمی اوصاف و کمالات اور ثقاہت امام ربیع بن صبیح فقہائے محدثین میں شمار کیے جاتے ہیں، بلاذری نے فتوح البلدان میں ایک موقع پر آپ کا ذکر کرتے ہوئے آپ کے نام کے

---

[1] الاکمال جلد ۲ ص ۲۷ و ص ۳۰۷ [2] مثال کے لیے کتاب الحجہ جلد اول کے صفحات ۲۵۲، ۲۸۰، ۳۹۰، ۳۹۵ وغیرہ ملاحظہ ہوں، [3] کتاب الجرح والتعدیل ج ا ق ۲ ص ۴۶۴ و تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۷ اور الجوہر النقی وغیرہ۔

ساتھ الفقیہ کا لقب استعمال کیا ہے[1] آپ کے فضائل ومناقب کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ تبع تابعین کے زمرے میں نمایاں شخصیت رکھتے ہیں۔

امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے:-

وکان یحیی لا یحدث عنہ، قال ابوالولید کان الربیع لا یدلس، کان المبارک اکثر تدلیسا منہ[2]

امام یحیٰ قطان اُن سے روایت نہیں کرتے تھے، ابوالولید کا قول ہے کہ ربیع تدلیس نہیں کرتے بلکہ مبارک بن فضالہ ان سے زیادہ مدلس ہیں۔

ابن شاہین نے کتاب اسماء الثقات میں آپ کا تذکرہ کیا ہے اور علمائے جرح و تعدیل کے اقوال سے ثقاہت ثابت کی ہے۔

الربیع بن صبیح، قال یحیی ثقۃ، وقال مرۃ اخری ضعیف، وقال فیہ لاباس بہ رجل صالح[3]

ربیع بن صبیح کے بارے میں یحیٰ نے ایک موقع پر ثقہ اور دوسرے موقع پر ضعیف کہا ہے، اور ساتھ ہی کہا ہے کہ ان سے حدیث کی روایت میں کوئی حرج نہیں ہے، وہ صالح آدمی تھے۔

امام الجرح والتعدیل عبدالرحمن بن مہدی آپ کے شاگردوں میں ہیں، اور بلا تردد آپ سے روایت کرتے ہیں، چنانچہ ابوحفص عمرو بن علی کا بیان ہے:-

کان عبدالرحمن بن مھدی یحدث عن الربیع بن صبیح۔

عبدالرحمن بن مہدی ربیع بن صبیح سے حدیث کی روایت کیا کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے:-

لاباس بہ رجل صالح،

ان سے روایت کرنے میں مضائقہ نہیں، وہ صالح آدمی تھے۔

[1] فتوح البلدان ص ۳۶۲، [2] التاریخ الکبیر ج ۲ قسم اول ص ۲۵۴، [3] تاریخ اسماء الثقات لابن شاہین، قلمی، باب الراء۔

امام ابوزرعہ کا قول ہے :-

شیخ، صالح، صدوق	ربیع شیخ صالح اور صدوق ہیں۔

عبدالرحمن اپنے والد کا قول نقل کرتے ہیں کہ :-

الربیع بن صبیح رجلٌ صالحٌ	ربیع بن صبیح صالح آدمی ہیں۔

ابوالولید طیالسی کا قول ہے :-

ماتکلم احدٌ فیہ إلاوالربیع فوقہ	جو شخص بھی ربیع کی ذات میں کلام کرتا ہے، ربیع اس سے بلند ہیں۔

عثمان دارمی کا بیان ہے کہ میں نے یحیٰ بن معین سے ربیع بن صبیح کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا :-

لیس بہ باس	ان سے روایت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے

چونکہ ابن معین کا یہ جملہ ربیع کی ثقاہت کے لیے کچھ زیادہ مناسب نہیں تھا اس لیے میں نے ان سے دریافت کیا کہ ربیع بن صبیح اور مبارک بن فضالہ میں سے کون آپ کے نزدیک زیادہ معتبر اور پسند ہے۔ تو جواب دیا کہ ان دونوں میں بہت زیادہ قربت ہے، میں نے کہا کہ میرے نزدیک ابن فضالہ ان احادیث میں زیادہ بہتر ہیں جن کو انھوں نے امام حسن بصری سے سُنا ہے، البتہ وہ بسا اوقات تدلیس سے کام لیتے ہیں۔[1]

اس قسم کے الفاظ امام احمد بن حنبل سے ان کے صاحبزادے عبداللہ نے ربیع بن صبیح اور مبارک بن فضالہ کے بارے میں کتاب العلل و معرفۃ الرجال میں نقل کئے ہیں :-

سئل ابی عن مبارک والربیع بن صبیح فقال ماأقربھما مبارک و ھشام جالسا الحسن جمیعا عشر سنین	میرے والد سے مبارک اور ربیع کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ دونوں ہی ایک مرتبہ کے ہیں، مبارک اور ہشام دونوں دس سال تک

[1] ان اقوال کے لیے کتاب الجرح والتعدیل ج اول قسم ثانی صفحہ ۴۶۴ و صفحہ ۴۶۵ ملاحظہ ہو۔

وکان المبارک یدلس[1]	امام حسن بصری کی صحبت میں بیٹھے ہیں، البتہ مبارک تدلیس کرتے تھے۔

اسی کتاب میں امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ کا بیان ہے کہ میں نے والد سے ربیع بن صبیح کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ لاباس بہ رجل صالح" پھر امام شعبہ کا قول بیان کیا کہ ربیع اور مبارک میں مبارک میرے نزدیک زیادہ بہتر ہے[2]

ابو حاتم رازی کا قول ہے۔

رجل صالح، والمبارک احب الیّ منہ۔	ربیع صالح آدمی ہیں، اور مبارک میرے نزدیک ربیع سے زیادہ بہتر ہے۔

امام شعبہ کا قول گذرا ہے کہ ربیع کے مقابلہ میں مبارک ان کے نزدیک زیادہ بہتر ہیں پھر بھی شعبہ نے ربیع کے بارے میں فرمایا ہے :۔

الربیع من سادات المسلمین	ربیع مسلمانوں کے پیشواؤں میں سے ہیں۔
اسی طرح امام عقیلی کا قول ہے :۔	
بصری سیئ من سادات المسلمین	ربیع بصری مسلمانوں کے سرداروں میں سے ہیں'
امام ابن عدی کا بیان ہے :۔	
لہ احادیث صالحۃ مستقیمۃ ولم أر لہ حدیثاً منکراً، وارجو انہ لاباس بہ ولا بروایاتہ[3]	ربیع کی تمام مرویات و احادیث صالح اور مستقیم ہیں، میں نے انکی کوئی منکر حدیث نہیں پائی، مجھے امید ہے کہ ان کی شخصیت اور ان کی روایات میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

[1] کتاب العلل ومعرفۃ الرجال الامام احمد بن حنبل ص۲۲ طبع انقرہ ۱۹۶۳ء [2] ایضاً ص ۱۳۵،
[3] ان تمام اقوال کے لیے تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۷ ملاحظہ ہو۔

پر ائمۂ دین کی یہ شہادتیں شاہد عدل ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان سے احادیث کے اعاظم رجال نے روایت کی، مگر بعد میں زہد و تقوی، عبادت و ریاضت، اور جہاد و مرابطت میں ان کی محدثانہ و فقیہانہ حیثیت بعض ائمۂ جرح و تعدیل اور محدثین کے نزدیک اس معیار پر نہ رہی جو ان کے اصول روایت و درایت کے لیے مقرر ہے، اور بہت سے ائمۂ حدیث کو ان سے روایت کرنے میں کلام کی گنجائش نکل آئی، انہوں نے امام ربیع کی ذات وصفات کا احترام کرتے ہوئے ان کے بارے میں جرح کے الفاظ بھی استعمال کئے اور حدیثِ رسول کی حفاظت وصیانت میں ان کے زہد و اتقاء کی نرمی کو غیر معیاری قرار دیا،

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں :۔

كان الربيع بن صبيح رجلاً غزّاءً، واذا مدح الرجل بغير صناعته فقد وهص يعني دقّ۔

ربیع بن صبیح کثیر الغزوہ آدمی تھے۔ اور جب کسی شخص کی تعریف اس کی حدیث دانی کے بغیر کرتے ہیں تو اسے تعریف و توصیف کر کے ختم کردیتے ہیں۔

ابن ابی شیبہ نے ابن المدینی کا قول نقل کیا ہے :۔

هو عندنا صالح، وليس بالقوى۔

ربیع ہمارے نزدیک صالح ہونے کے باوجود حدیث کے معاملے میں قوی نہیں ہیں۔

ساجی کا قول ہے :۔

ضعيف الحديث، أحسبه كان يهِمُ وكان عبداً صالحاً۔

ربیع حدیث میں ضعیف ہیں، میرا گمان ہے کہ وہ وہم کرتے تھے اور وہ اس کے باوجود نیک بندے تھے۔

خالد بن خداش کا بیان ہے :۔

هو في هديه رجل صالح، وليس عنده

ربیع اپنی ذات و سیرت میں صالح آدمی ہیں، ان کے پاس کوئی ایسی حدیث نہیں ہے جو دوسروں

حديث يحتاج إليه

کے یہاں نہ ہو اور اس کی روایت کی ضرورت پڑے۔

عفان نے کہا ہے :-

حديث الربيع بن صبيح كلها مقلوبة

ربیع بن صبیح کی تمام حدیثوں میں قلب واقع ہے

یعقوب بن شیبہ کا قول ہے :-

رجل صالح، صدوق، ثقة ضعيف جداً۔

وہ صالح، صدوق، ثقہ آدمی ہونے کے باوجود بہت زیادہ ضعیف ہیں۔

ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے :-

وكان ضعيفا في الحديث، وقد روى عنه الثوري واما عفان فتركه فلم يحدث منه

ربیع حدیث میں ضعیف تھے، ان سے امام سفیان ثوری نے روایت کی، مگر عفان نے ان سے احادیث کی روایت نہیں کی۔

امام ابن حبان کا بیان ہے :-

كان من عبّاد اهل البصرة وزهّادهم، وكان يشبه بيته بالليل ببيت النحل من كثرة التهجّد، إلا ان الحديث لم يكن من صناعته فكان يهم فيما يروى كثيرا حتى وقع في حديثه المناكير من حيث لا يشعر

ربیع اہل بصرہ کے عبّاد وزہّاد میں سے تھے، تہجد کی کثرت کی وجہ سے راتوں کو ان کا مکان شہد کی مکھیوں کا چھتہ معلوم ہوتا تھا، یعنی تلاوت قرارت سے گونجتا تھا، مگر علم حدیث ان کا فن نہیں تھا، وہ اپنی بہت سی مرویات میں وہم میں مبتلا ہو جاتے تھے، یہاں تک کہ ان کی حدیثوں میں بہت سی منکر احادیث بھی آگئیں، اور ان کو

له ان تمام اقوال کے لیے کتاب الجرح والتعدیل ج ۱ قسم ۲ ص ۴۶۵، وتہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۷ و ص ۲۴۸، وطبقات ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۳۶ ملاحظہ ہو۔

لا یعجبنی الاحتجاج به اذا انفرد۔	اس کا پتہ نہ چلا، جس حدیث کے وہی تنہا راوی ہوں، اس سے دلیل و حجت پکڑنا مجھے پسند نہیں ہے؛

مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوریؒ نے ان کے صدوق اور عابد و مجاہد ہونے کے ساتھ ساتھ سئی الحفظ بتایا ہے:

صدوق، سیئ الحفظ، وکان عابداً مجاهداً [۱]	ربیع صدوق ہیں، ان کا حافظہ اچھا نہیں تھا؛ اور وہ عابد و مجاہد تھے۔

ان تمام اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمۂ جرح و تعدیل امام ربیع بن صبیح کے زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت، صداقت و امانت اور صالحیت و نیکی پر متفق ہیں، اور اس بارے میں ان کی دو رائیں نہیں ہیں، مگر زہد و عبادت کے غلبہ کی وجہ سے ان میں سچائی، نیکی، نیک نیتی اور اخلاص کا اس قدر ذوق پیدا ہو گیا کہ اس دور میں احادیث رسول کی روایت کے اصول پر وہ پورے نہ اتر سکے، اور علم حدیث سے زیادہ وہ زہد و عبادت اور جہاد و مرابطت کے آدمی بن گئے۔ اس معاملہ میں بقول ابو الولید طیالسی جس جس نے ان کے بارے میں کلام کیا وہ اس سے بلند تھے، ان پر جرح کے جن اسباب کو علماء نے بیان کیا ہے وہ یہ ہیں (۱) جو شخص حدیث کے فن کا نہیں ہوتا تھا ربیع اس کی بھی تعریف و توصیف بہت زیادہ کیا کرتے تھے، امام شافعیؒ نے ان کے بارے میں یہ بات بیان فرمائی ہے، یہ زہد و ریاضت کا خاص وصف کہ آدمی ہر شخص کے ساتھ غایت درجہ حسن ظن قائم کرنے لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صرف حضرات عبّاد و زہّاد کے طرق سے آئی ہوئی احادیث حضرات محدثین کے نزدیک معتبر نہیں ہیں اور جب تک وہ اصول حدیث کی رو سے دوسرے راویوں سے مروی نہ ہوں، ان کا اعتبار نہیں کیا جاتا (۲) انکے ضعیف ہونے کی دوسری وجہ ان کا وہم ہے جیسا کہ ساجی اور ابن حبان کا قول ہے، اور بقول ابن حبان وہ وہم میں پڑ کر منکر حدیثوں کی روایت کر دیتے ہیں، مگر ان کو پتہ نہیں چلتا

---

[۱] تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۲۳ ملاحظہ ہو۔

اس لیے جن احادیث کے تنہا وہی راوی ہیں اور دوسرے طرق سے وہ مروی نہیں ہیں، ان سے استناد و احتجاج نہیں کرنا چاہئے، یہ وہم بھی ورع و زہد کا معلوم ہوتا ہے جبکہ وہ عبادان میں مرابطت کرکے رات دن عبادت اور جہاد میں مصروف رہتے تھے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ ان کی احادیث میں قلب ہوتا تھا، اور ان کی روایات و احادیث مقلوب ہوتی تھیں۔ جیسا کہ عفان نے کہا ہے، یعنی ان کی احادیث میں ایک دوسرے کے رواۃ اور متون خلط ملط ہو جاتے تھے، یہ بھی وہم ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے، معلوم نہیں کس تصریح یا قول کی بنا پر صاحب تحفۃ الاحوذی نے ان کو سوء حفظ یعنی حافظہ کی خرابی سے منسوب کیا ہے، حالانکہ اس کی تائید کسی امام جرح و تعدیل کے قول سے نہیں ہوتی، الغرض جن ائمہ فن نے امام ربیع کے بارے میں کلام کیا ہے انہوں نے ان کو مدلس تک نہیں کہا ہے جبکہ ان کے معاصر اور قرین مبارک بن فضالہ کے بارے میں اس کی تصریح کی ہے[۲] بلکہ ان کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق ان کی زاہدانہ نیک نیتی، حسن ظن اور روایات میں وہم و قلب سے ہے، ان باتوں کے نتیجہ میں اگر ابن حبان یہ کہتے ہیں کہ وہ فن حدیث کے آدمی نہیں تھے، اور اپنی روایات میں اوہام میں یوں مبتلا ہو جاتے تھے کہ بغیر سمجھے مناکیر تک ان کی مرویات میں آگئی ہیں تو ابن عدی نے ان کے بارے میں یہ کہا ہے:-

لہ احادیث صالحۃ مستقیمۃ ولم ار لہ حدیثا منکرا[۱]	ان کی حدیثیں صالح اور درست ہیں، میں نے ان کی کوئی منکر حدیث نہیں دیکھی۔

اس سلسلہ میں خالد بن خداش کا یہ قول بھی قابل غور ہے۔

ولیس عندہ لاحادیث	ان کے یہاں کوئی ایسی مخصوص حدیث نہیں ہے

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۷، [۲] محدثین کے نزدیک تدلیس کی دو قسمیں ہیں، پہلی یہ کہ راوی نے اپنے کسی معاصر سے ملاقات کی ہو یا نہ کی ہو اس گمان کی بنا پر اس سے روایت کرے کہ اس نے یہ حدیث اس سے سنی ہے اور دوسری یہ کہ راوی اپنے کسی مشہور شیخ کی روایت بیان کرے مگر اس کا مشہور نام اور کنیت اور لقب ذکر نہ کرے اور کسی مصلحت سے ایسے نام یا کنیت یا نسبت سے اس کا تذکرہ کرے کہ اس کی طرف ذہن نہ جائے، مقدمہ ابن صلاح ص ۲۴

يحتاج اليه[1] — جس کی روایت کے لیے ان ہی کی احتیاج ہو۔

یعنی امام ربیع کی احادیث و مرویات وہی تھیں جو ان کے معاصر عام محدثین کے یہاں تھیں، کوئی ایسی حدیث نہیں تھی جس کی روایت میں وہ منفرد ہوں، اور وہ ان ہی کے واسطہ سے روایت کی گئی ہو، اس قول کی بنا پر امام ربیع کے یہاں کسی منکر حدیث کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، آپ کی احادیث و مرویات سنن ترمذی، مسند احمد، اور سنن ابن ماجہ، وغیرہ میں موجود ہیں۔

امام ربیع بن صبیح بصری کے بارے میں ان تمام اقوال اور جرح و تعدیل کے الفاظ میں حزم و احتیاط اور ادب و احترام کی جو روح پائی جاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں ضعف، وہم، قلب، وغیرہ کے بیانات ان کی صلاحیت و صداقت اور ثقاہت و عدالت تسلیم کرنے کے بعد ہیں، اور ان کا تعلق آپ کے خاص اوقات اور خاص حالات سے ہے، ان سے ہٹ کر وہ ثقہ، صدوق اور صالح محدث و فقیہ ہیں۔

امام ربیع بن صبیح حدیث کے پہلے مصنفوں میں — دوسری صدی ہجری کے وسط میں ۱۲۰ھ اور ۱۵۰ھ کے درمیان تمام عالم اسلام میں علم حدیث پر باقاعدہ کتابیں لکھی گئیں، اور ہر جگہ کے ائمہ حدیث نے اپنے یہاں کی حدیثوں کو فقہی ترتیب پر کتابی شکل میں مرتب و مدون کیا، امام ربیع بن صبیح نے بصرہ میں سب عالموں سے پہلے حدیث کو مدون کیا، جیسا کہ حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں لکھا ہے، نیز انہوں نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے:۔

ذكر الرامهرمزي في الفاصل أنه أول من صنف بالبصرة[1]	رامہرمزی نے المحدث الفاصل میں ذکر کیا ہے کہ امام ربیع نے بصرہ میں سب سے پہلے حدیث کی کتاب تصنیف کی۔

[1] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۷۔

صاحب کشف الظنون نے حدیث کی تدوین و تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب عبد الملک بن جریج اور امام مالک بن انس وغیرہ ائمہ حدیث کا زمانہ آیا تو انہوں نے احادیث کو باقاعدہ مدون کیا، ایک قول کے مطابق اسلام میں سب سے پہلے تصنیف کتاب ابن جریج کی ہے، اور ایک قول کے مطابق یہ امتیاز مؤطا امام مالک کو حاصل ہے، اس کے بعد چلپیؒ نے لکھا ہے :-

وقیل إن اول من صنف و بوّب الربیع بن صبیح بالبصرة ثم انتشر جمع الحدیث وتدوینه وتسطیره فی الاجزاء والکتب[1]

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بصرہ میں سب سے پہلے احادیث کی تدوین اور فقہی ابواب پر ترتیب کا کام ربیع بن صبیح نے کیا، اس کے بعد حدیث کے جمع و تدوین کا اور اجزاء اور کتابوں میں لکھنے کا رواج عام ہوا،

اس بیان میں حضرت ربیعؒ کو بصرہ میں پہلا مصنف حدیث بتانے کے ساتھ ان کے تفقہ کو بھی بیان کیا گیا ہے، اور فقہی ابواب پر احادیث مرتب و مدون کرنے میں آپ کی اولیت ظاہر کی گئی ہے، اسی لیے بعض مورخین نے آپ کو فقیہ کے لقب سے یاد کیا ہے۔

زہد و تقویٰ، اور عبادت و ریاضت

امام ربیعؒ نے اپنے شیخ حضرت حسن بصریؒ کی طرح ابتدا میں علم حدیث و فقہ میں شہرت حاصل کی، مگر بعد میں زہد و عبادت میں یوں مصروف ہو گئے کہ محدث و فقیہ سے زیادہ عابد و زاہد اور غازی و مجاہد کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور اپنی عملی سرگرمیوں کا مرکز عبادان کو بنایا جو اس زمانہ میں اہل اللہ کا مسکن تھا، غالباً تدوین حدیث کے بعد ہی آپ کی علمی زندگی نے عملی کروٹ لی۔

امام ابن جوزیؒ نے صفة الصفوة میں عبّاد عبادان کے ذیل میں عابد من بنی سعد کا تذکرہ کیا ہے اور اس عابد کا نام نہیں لیا ہے مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عابد حضرت ربیع بن صبیح بصری مولیٰ بنی سعد ہی ہیں، آپ نے عبادان کو اپنے زہد و مجاہدہ اور مرابطت

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۲۲۳

کا مرکز بنایا تھا اور آپ کا تعلق بنی سعد سے تھا، اگر اس عابد سے مراد آپ ہی ہیں تو ان کی زاہدانہ و عابدانہ زندگی کی ابتدا اس تذکرہ سے معلوم ہوتی ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بنی سعد کے کوئی اور بزرگ ہوں، اس عابد بنی سعد کا واقعہ ابو عاصم عبادانی بصری نے جو بہت بڑے محدث ہیں اور عبادان میں قیام کرتے تھے[1]۔ یوں بیان کیا ہے:۔

کان رجل من بنی سعد یقدم علینا فی اول ما اتخذت عبادان فکانت اذ ذاك وبیۃً	جس زمانہ میں عبادان کو مرکز بنایا گیا، وہاں وبائی امراض بہت زیادہ تھے اسی زمانہ میں ہمارے پاس عبادان میں بنی سعد کا ایک آدمی آیا کرتا تھا۔

بنو سعد کا یہ آدمی یہاں رات دن مسلسل نمازیں پڑھتا تھا، جب رات کا پچھلا پہر ہو جاتا تو دونوں گھٹنے اٹھا کر اور سمندر کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتا، اور اپنے حال پر گریہ و زاری شروع کر دیتا، اور جب کسی انسان کی آہٹ محسوس کرتا تو خاموش ہو جاتا، ایک رات کا واقعہ ہے کہ میں ساحل کی طرف گذرا تو میں نے اس کے رونے کی آواز سنی، وہ اس وقت رو رو کر یہ اشعار پڑھ رہا تھا:

الا یا عین ویحكِ اسعدینی | بطول الدمع فی ظُلَمِ اللیالی

اے آنکھ! تو رات کی ظلمتوں میں کثرت سے آنسو بہا کر مجھے نیک بخت بنا دے۔

لعلك فی القیامۃ أن تفوزی | بخیر الدھر فی تلك العلالی

شاید تو ان ہی آنسوؤں کی وجہ سے قیامت میں اچھے حالات کی مستحق ٹھہرے۔

جب میں قریب پہنچا تو وہ میری آہٹ پا کر خاموش ہو گیا، اور اسی حال میں اسے چھوڑ کر چلا آیا[2]۔

یہ بزرگ اگر ربیع بن صبیح بصری سعدی ہیں تو اس واقعہ سے ان کے عبادان سے ابتدائی تعلق اور زہد و عبادت کی شروع زندگی کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔

---

[1] کتاب الجرح والتعدیل ج ۲ قسم ۲ ص ۳۰۱، [2] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۴۵ طبع حیدرآباد۔

ابن قتیبہ نے عیون الاخبار میں حضرت امام ربیع بن صبیح کی زبانی ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے ان کی بزرگی اور ثقاہت کا پتہ چلتا ہے، فرماتے ہیں کہ جب حضرت ثابت بنانیؒ کا وصال ہوا تو میں اور اہل بصرہ ان کے جنازہ میں شریک ہوئے، اور میں، حمید الطویل اور ابو جعفر حسن تینوں قبر میں اترے میں سرہانے کی طرف تھا، میں اینٹ لگا رہا تھا کہ اتفاق سے میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی اور میں اٹھانے کے لیے جھکا تو لحد میں مجھے کوئی چیز نظر نہیں آئی حمید الطویل نے بار بار مجھ سے کہنا شروع کیا کہ ہماری لاش کو کسی نے اچک لیا ہے، اتنے میں قبر کے آس پاس والوں میں شور و ہنگامہ برپا ہو گیا، بہر حال ہم نے لحد برابر کر کے قبر میں مٹی گرائی اور کفن دفن کر کے لوٹ آئے، حمید الطویل اس واقعہ سے بہت متاثر تھے، وہ فوراً امیر بصرہ سلیمان بن علی کے پاس گئے اور ماجرا بیان کیا، اس نے یہ واقعہ سن کر کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا، البتہ میں اس کا منکر ہوں کہ ہمارے زمانہ میں کوئی ایسا شخص ہو جس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے، یہ بتایئے کہ آپ کے علاوہ کسی اور شخص نے بھی یہ واقعہ دیکھا ہے، حمید الطویل نے کہا ہاں ربیع بن صبیح، اور حسن بصری نے بھی اس کا مشاہدہ کیا ہے، یہ سن کر سلیمان بن علی نے کہا یہ دونوں حضرات عادل معتبر شاہد ہیں، اس کے بعد اس نے ثابت بنانی کے دیانتدار پڑوسیوں کو بھیجا کہ ان کی قبر کھود دیں، جب انہوں نے قبر کھودی تو ثابت بنانی کو نہیں پایا۔[1]

امام ربیع بصرہ کے عباد و زہاد میں بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ تھے اور یہاں کے عابدوں کے جلی و خفی احوال سے واقف تھے، امام ابن جوزی نے ایک عابد کے تذکرے میں حضرت محمد بن سماکؒ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ مجھے بصرہ کے عبّاد و زہّاد کی زیارت کا شوق ہوا تو میں ربیع بن صبیح کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ کیا آپ یہاں کسی ایسے عابد و زاہد کو جانتے ہیں جس پر خشیت الٰہی کا غلبہ ہو؟ انہوں نے کہا ہاں یہاں ایک ایسا

[1] عیون الاخبار ج ۲ ص ۳۱۸ و ص ۳۱۹

عابد ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ خوف خدا رکھنے والوں میں سے ہے، میں نے کہا کہ صبح کو نماز کے بعد آپ ہمیں ان کی خدمت میں لے چلئے، چنانچہ ربیع بن صبیح صبح سویرے ہمیں لے کر بصرہ کے ایک زاویہ میں پہونچے، دروازہ کھٹکھٹانے پر اندر سے ایک بوڑھی عورت نکلی، ربیع نے سلام کر کے پوچھا کہ آپ کے صاحبزادے کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ میرا بیٹا دنیا کو بھول چکا ہے، ربیع نے اس سے اندر آنے اور اس کے لڑکے سے ملاقات کرنے کی اجازت چاہی، بوڑھی نے اس شرط پر اجازت دی کہ تم اس کے سامنے قیامت کا ذکر نہ کرنا ہم نے اندر جا کر دیکھا کہ ایک نوجوان ہے جس کے بدن پر کمبل اور گردن میں زنجیر ہے جو ایک ستون سے بندھی ہوئی ہے، اور سامنے قبر کھدی ہوئی ہے اور وہ نوجوان کنارے بیٹھا ہوا لحد کی طرف دیکھ رہا ہے، ربیع نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ آپ کے بھائی محمد بن سماک ہیں مذکّر (واعظ) ہیں، آپ کی ملاقات کے لیے آئے ہیں، اس کے بعد میں اس نوجوان کی طرف بڑھا اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، میں نے بہت کوشش کی کہ اس سے کچھ بات کروں مگر اس کی ہیبت یوں طاری رہی کہ زبان نہ کھل سکی[1]

آپ کی عبادت و ریاضت اور شب بیداری کا بقول امام ابن حبان حال یہ تھا کہ:

كان من عباد اهل البصرة وزهادهم، وكان يشبه بيته ببيت النحل من كثرة التهجد[2]	ربیع بصرہ کے عابدوں اور زاہدوں میں سے تھے، تہجد کی کثرت کی وجہ سے راتوں کو ان کا گھر شہد کی مکھیوں کے چھتہ کی طرح گونجتا تھا!

تواضع وانکساری اور بے نفسی کے سلسلے میں ربیع اپنے شیخ حضرت حسن بصریؒ کا یہ واقعہ بیان کرتے تھے۔

كان الحسن اذا أثني عليه احد	جب کوئی آدمی امام حسن بصری کی تعریف ان کے منہ پر

[1] صفۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۱۲-۱۳، [2] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۷۔

فی وجھہ کراھۃ ذٰلک واذا دعالہ سرّہ ذٰلک[1] | کرتا تو آپ اسے ناپسند کرتے، اور جب آپ کے لیے دعا کرتا تو بہت خوش ہوتے تھے۔

آپ کے بارے میں امام شعبہؒ اور امام عقیلی کا بیان ہے کہ ربیع بصری مسلمانوں کے پیشواؤں میں سے ہیں، امام احمد بن حنبل، یعقوب بن شیبہ، ابو حاتم رازی، ساجی اور خالد بن خداش نے رجل صالح اور عبد صالح کہا ہے، ابو الولید طیالسی نے کہا ہے کہ جو شخص بھی امام ربیع کی ذات میں کلام کرتا ہے وہ اس سے بلند ہیں ان ائمۂ اسلام اور معاصرینِ عظام کے یہ اقوال امام ربیع کے زہد و اتقاء، اور عبادت و صالحیت کے لیے شاہد عدل ہیں، ان شہادتوں کے آئینہ میں ان کی مقدس زندگی کے خد و خال بخوبی نظر آتے ہیں۔

بہادری، جہاد اور اسلامی حمیت دوسرے دینی اور علمی اوصاف و کمالات کی طرح آپ بہادری، جہاد، مرابطت اور اسلامی حمیت میں بھی جوہر فرد تھے، امام شافعیؒ نے فرمایا ہے:-

کان الربیع بن صبیح رجلا غزاءً[2] | ربیع بن صبیح بہت بڑے غازی و مجاہد تھے۔

ابن شاہین نے تاریخ اسماء الثقات میں امام شعبہ کا یہ قول نقل کیا ہے:-

لقد بلغ الربیع بن صبیح فی عصرنا ھذا مالم یبلغہ الاحنف بن قیس[3] | ربیع بن صبیح بہادری اور جوانمردی میں ہمارے زمانہ میں اس مقام پر پہونچ گئے ہیں جہاں احنف بن قیس بھی نہیں پہونچ سکے۔

احنف بن قیس بڑے بہادر تابعی ہیں، ان کی قوم دربار رسالت میں حاضر ہوئی مگر مسلمان نہیں ہوئی، احنف اپنے وطن میں تھے، انہوں نے اپنی قوم کو اسلام کی ترغیب دی تو سب لوگ مسلمان ہو گئے، عہدِ فاروقی میں احنف بصرہ میں آئے اور اپنی قوم کے سردار بن کر رہے، جنگ

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۷ قسم اول ص ۱۲۹ [2] کتاب الجرح والتعدیل ج ا ق ۲ ص ۴۶۵
[3] تاریخ اسماء الثقات اقلمی باب الراء

صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، اور جنگ جمل میں کسی فریق کا ساتھ نہیں دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو خراسان کی جنگ میں بھیجا تھا' ایک رات دشمن کی فوج نے اسلامی لشکر پر شب خون مارا تو سب سے پہلے حضرت احنف ہی گھوڑے پر سوار ہو کر یہ شعر پڑھتے ہوئے آگے بڑھے،

ان علی کل رئیس حقاً ان یخضب الصعدة اوتندقا

ہر سردار کے لیے ضروری ہے کہ جنگ میں آگے بڑھے اور اپنے نیزہ کو دشمن کے خون سے رنگین کرے' یا پھر لڑتے لڑتے نیزہ ہی لوٹ جائے :۔

اور دشمن کی فوج پر حملہ کرکے طبل بردار کا کام تمام کر دیا اور دشمن پسپا ہو گئے یہاں تک کہ خلافتِ عثمانی میں مسلمانوں نے مروالروز کو فتح کر لیا۔[1] اسی قسم کے دوسرے کارناموں کی وجہ سے احنف بن قیس اپنے زمانے کے سب سے بڑے بہادر شمار کئے جاتے تھے' مگر امام شعبہ کے بیان کے مطابق امام ربیع بن صبیح کا شہرہ بہادری اور جوانمردی میں احنف سے بھی بڑھا ہوا تھا۔

آپ نے بصرہ کے قریب عبادان کو اپنی مجاہدانہ اور بہادرانہ سرگرمیوں کا مرکز بنایا' بصرہ کے لوگوں سے رقم وصول کر کے عبادان میں قلعہ بندی اور رضا کار فوج تیار کی اور ان متطوعین و فدائین کو لے کر اسلامی سرحدوں کی حفاظت و مرابطت کی' بلاذری کا بیان ہے :۔

جمع مالاً من اھل البصرة فحصن بہ عبادان ورابط فیھا۔[2]

ربیع نے اہل بصرہ سے مال جمع کر کے عبادان کی قلعہ بندی کی' اور اسی میں مرابطت کا نظام قائم کیا۔

مرابطت اور رباط اسلامی حربی سیاست میں بہت ہی اہم شعبہ ہے' اس کے ذریعہ اسلامی سرحدوں کی حفاظت کی جاتی ہے اور دشمن سے باخبر رہا جاتا ہے' ساتھ ہی اندرونی بدامنی کو فرو کیا جاتا ہے' جہاد کی طرح رباط کے بھی بڑے بڑے فضائل ہیں۔ اور اس میں بڑا اجر و ثواب ہے' اسی لئے عباد و زہاد اور اہل اللہ یہ خدمت اپنے ذمہ لیا کرتے تھے' اور حسبۃً للہ

---

[1] کتاب المعارف ابن قتیبہ ص ۱۸۷ طبع مصر۔ [2] فتوح البلدان ص ۳۶۲۔

دور دراز مقامات پر جاکر ذکر الٰہی کے ساتھ اسلامی سرحدوں کی نگرانی کرتے تھے، بعد میں مرابطت اور رباط کا تصور بزرگوں کی خانقاہوں میں تبدیل ہوگیا۔ افریقہ میں سنوسیوں کی رباطین اور زاویے ایک حد تک اسی قدیم حقیقت پر مبنی تھے جن میں رہ کر وہ عوام کو فرانسیسی جبر و استبداد کے خلاف تیار کرتے تھے مگر عام طور سے اب رباط کا لفظ خانقاہ کے ہم معنی ہوگیا ہے بلکہ سرائوں اور مسافر خانوں پر بھی بولا جانے لگا ہے۔

امام ربیع کی عملی سرگرمی کا مرکز عبادان | آخر عمر میں امام ربیع پر زہد و تقویٰ کا رنگ یوں ابھرا کہ اس میں جہاد کی حرارت تھی اور آپ نے اپنے لیے کسی گوشۂ عافیت کے بجائے عبادان کا قلعہ پسند فرمایا اور جس طرح ان کے شیخ حضرت امام حسن بصری نے علم و زہد کے ساتھ جہاد کی زندگی بسر کی اسی طرح شاگرد جہاد اصغر کے ساتھ جہاد اکبر میں پیش پیش رہے، چونکہ امام ربیع کی اس زندگی کا مرکز عبادان تھا اور آپ نے اسی مقام کو اپنا مستقر بنایا اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عبادان کی مختصر تاریخ اور اس کی اہمیت بیان کردی جائے۔

۱۴ھ میں بصرہ آباد کیا گیا جو دیکھتے ہی دیکھتے بہت بڑا شہر بن گیا، اور اس کے اطراف و جوانب کے علاقے دور دور تک آباد ہوگئے، چونکہ قدیم زمانہ سے عراق کا یہ علاقہ ایرانی شہنشاہیت کے زیر اقتدار تھا اور یہاں ان کی آبادیاں تھیں اس لیے بصرہ کے محلوں اور نواحی بستیوں کے نام میں عجمیت نمایاں رہی، اور جس شخص کے نام پر کوئی بستی یا محلہ آباد ہوا، اس کے نام کے آخر میں الف اور نون بڑھا کر اس بستی اور محلہ کا نام رکھ دیا گیا، مثلاً خیرتان خیرہ بنت حمزہ قشیریہ کے نام پر، جبیران جبیر بن حیّہ کے نام پر، زیادان زیاد مولیٰ بنی ہاشم کے نام پر، نافعان نافع بن حارث ثقفی کے نام پر اور اسی طرح عبادان کا نام عباد بن حصین حنظلی کے نام پر رکھا گیا، پنجاب میں غالباً اسی طرح گوجرانوالہ شیرانوالہ وغیرہ نام ہیں۔

یہ وہی عباد بن حصین ہیں جنہوں نے فتح کابل میں بڑی بہادری دکھائی تھی اور امام حسن بصریؒ نے کہا تھا کہ ان کو دیکھ کر مجھے یقین ہوا کہ ایک شخص ایک ہزار آدمیوں کے برابر ہوسکتا ہے۔

عباد بن حصین بنو تمیم کے مشہور شہسوار تھے، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانۂ خلافت میں بصرہ میں محکمۂ پولیس کے افسرِ اعلیٰ تھے، ہشام بن کلبی کی روایت کے مطابق عباد بن حصین نے سب سے پہلے خود ہی اس مقام میں مرابطت کی اس کے بعد ربیع بن صبیح نے اہلِ بصرہ سے چندہ کر کے عبادان کی قلعہ بندی کی اور یہیں رہ کر رضاکارانہ طور پر اسلامی سرحد کی نگرانی کرنے لگے [۱]

عبادان فوجی اعتبار سے بہت اہم مقام تھا اور دشمن اس کے نواحی سے عراق پر حملہ کر سکتے تھے اس لیے یہاں متطوعین و مرابطین کی جمعیت جو عام طور سے عبّاد و زہّاد اور علماء و صلحاء پر مشتمل ہوتی رہا کرتی تھی، جس کا کام باغی عناصر، خوارج اور بحری ڈاکوؤں کا مقابلہ کر کے ان کو شکست دینا تھا، عبادان کے محلِ وقوع کے بارے میں بشاری مقدسی نے تفصیل سے کام لیا ہے اور بتایا ہے کہ بصرہ سے ابلہ دو برید پر واقع ہے، وہاں سے بیان ایک مرحلہ ہے اور یہاں سے عبادان ایک مرحلہ پر ہے [۲] پھر لکھا ہے کہ عبادان دریائے دجلہ اور نہر خورستان کے دوآبہ میں ساحلِ سمندر پر ایک شہر ہے، اس کے پیچھے نہ کوئی شہر ہے نہ گاؤں، بلکہ سمندر ہے، اس میں مرابطین کے زاویے ہیں، ان میں اکثر عباد اور صلحاء ہیں۔ ان کی اکثریت چھلکے کی چٹائیاں بناتی ہے، یہاں پانی کی بڑی قلت ہے اور اس پر سمندر سوار رہتا ہے [۳]

یہ چوتھی صدی کی بات ہے مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادان بصرہ سے کچھ دور دریائے دجلہ اور دریائے خورستان کے دوآبہ میں معمولی شکل میں ایک گاؤں تھا، جہاں ساحل سمندر ہونے کی وجہ سے آب و ہوا مرطوب تھی اور وبائی امراض کی کثرت تھی، پینے کے لیے پانی کی بڑی قلت تھی، اور مد و جزر کی وجہ سے یہ بستی ہمیشہ معرض خطرہ میں رہا کرتی تھی، معاش و معیشت کا کوئی ذریعہ نہیں تھا مگر یہ ویرانہ علماء و صلحاء اور عباد و زہّاد سے معمور رہا کرتا تھا، یہاں کے باشندے راتوں میں اللہ کے حضور میں روتے گڑگڑاتے اور دنوں میں تیر

[۱] فتوح البلدان ص ۳۶۱ و ص ۳۶۲، [۲] احسن التقاسیم ص ۱۳۲ طبع یورپ، [۳] احسن التقاسیم ص ۱۱۸،

بن کر دشمنوں کے مقابلہ میں گرجتے اور غازی و مجاہد بنے رہتے۔

الغرض پورا شہر عبادان جسے امام ربیع بن صبیح نے مسلمانوں کی رقم سے قلعہ بند کر دیا تھا یہ یک وقت زاویۂ زاہدین اور میدان مجاہدین تھا، حضرت بشر بن حارث کا قول ہے کہ عبادان عبادت کا میدان ہے، جو زہد چاہتا ہے عبادان چلا جائے، میری آرزو ہے کہ کاش! مجھے بھی عبادان کے زاویوں میں سے ایک زاویہ نصیب ہوتا، اور میں اس میں عافیت سے رہتا، امام احمد بن حنبل کا ارشاد ہے کہ عبادان میں ہمیشہ عباد وزہاد آتے رہے ہیں، میں نے ہداب عابد کو وہیں دیکھا ہے۔[۱]

اسلامی شہروں کی طرح عبادان میں ائمۂ حدیث اور علمائے دین حدیث کا درس دیتے تھے اور حدیث کے طالب علم اپنے علمی اسفار میں عبادان کا سفر بھی کرتے تھے امام احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ میں نے ۱۸۶ھ کے اخیر عشرہ میں عبادان کا سفر کیا اور ہداب کو وہیں دیکھا، وہیں ابوالربیع بھی تھے جن سے میں نے حدیث لکھی۔[۲]

عبادان کی حربی اہمیت بہت بعد تک باقی رہی، اور یہاں پر مرابطین کی جماعت رہا کرتی تھی، چوتھی صدی ہجری میں ابن حوقل نے لکھا ہے کہ عبادان چھوٹا سا قلعہ ہے جو سمندر کے کنارے دجلہ کے گرنے کی جگہ پر آباد ہے، یہ در حقیقت رباط ہے جس میں خوارج کے فرقے صفریہ اور قطریہ اور بحری ڈاکوؤں سے جنگ کرنے والے مجاہدین و مرابطین رہا کرتے ہیں یہ لوگ یہاں پر ہمیشہ اسی خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں۔[۳] اسی لیے اس زمانہ تک اسے عبادان المطوعہ کہتے اور لکھتے تھے۔[۴]

آج کل عبادان حکومتِ ایران کے قبضہ میں ہے جہاں باکو کی طرح تیل کا چشمہ نکلا ہے یہاں گذشتہ سالوں تیل کا بہت بڑا فتنہ برپا ہوا تھا، تیل کی وجہ سے جدید طرز کا بہت بڑا شہر بن گیا ہے۔ اور اب عباد وزہاد اور علماء صلحاء کے بجائے یہاں ہر کمپنی کے مزدور اور ملازم رہتے ہیں۔

---

[۱] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۱۷، [۲] مناقب الامام احمد، ابن جوزی ص ۲۶ [۳] کتاب صورالارض ص ۲۴۳ طبع یورپ۔ [۴] احسن التقاسیم ص ۱۱۸۔

حضرت امام ربیع کی غزوۂ باربد (بھاڑبھوت، گجرات) میں شرکت اور ہندوستان میں وفات ۱۶۰ھ

جن دنوں امام ربیع بن صبیح عبادان کی قلعہ بندی کر کے متطوعین اور فدائیوں میں اسلامی حمیت کی روح پھونک رہے تھے، ان ہی دنوں بعہد خلیفہ ابوجعفر منصور مجاہدین اسلام سندھ سے گذر کر ہندوستان میں فتوحات کر رہے تھے، بلاذری نے لکھا ہے کہ امیرالمومنین منصور نے سندھ پر ہشام بن عمرو تغلبی کو مقرر کیا تو انہوں نے ناقابل تسخیر مقامات کو فتح کر کے عمرو بن جمل کو جنگی کشتیوں کے ساتھ باربد کی طرف روانہ کیا[1] اس کے بعد جب خلیفہ مہدی کا زمانہ آیا تھا تو اس نے بذات خود غزوۂ باربد میں دلچسپی لی اور عبدالملک بن شہاب مسمعی کی سرگرمی میں فوج روانہ کی، اسی دوسری مہم میں حضرت ربیع بن صبیح بھی شریک ہوئے اور مظفر و منصور ہو کر واپسی پر ہندوستان میں فوت ہوئے، غزوۂ باربد اور اسی میں حضرت ربیع کی وفات کا تذکرہ ابن سعد، بلاذری، طبری، ابن اثیر، اور ابن خلدون وغیرہ نے معمولی فرق کے ساتھ کیا ہے، ہم یہاں تاریخ طبری سے اس غزوہ کی تفصیل پیش کرتے ہیں، امام طبری نے ۱۵۹ھ کے واقعات وحوادث میں لکھا ہے کہ اس سال خلیفہ مہدی نے عبدالملک بن شہاب مسمعی کو براہ سمندر بلاد ہند روانہ کیا، اور ان کے ہمراہ مندرجہ ذیل فوجوں اور رضا کاروں کو بھیجا۔

۲۰۰۰ دو ہزار بصرہ کی مختلف سرکاری فوج سے،

۱۵۰۰ پندرہ سو عام متطوعین ومرابطین سے جو اپنے طور پر حسبۃً للہ شریک ہوئے،

۷۰۰ سات سو اہل شام سے، ان کے امیر و قائد یزید بن حباب مذحجی شامی تھے؛

۱۰۰۰ ایک ہزار بصرہ کے متطوعین ومرابطین سے، جو اپنے خرچ سے نکلے تھے، اسی فوج میں حضرت ربیع بن صبیح بصری بھی تھے۔

۴۰۰۰ چار ہزار اساورہ اور سیابجہ سے، (ان میں اکثریت ہندوستانی نسل والوں

---

[1] فتوح البلدان ص۴۳۱،

کی تھی) یہ کل نو ہزار دو سو فوج تھی، جس کے امیر عبد الملک بن شہاب مسمعی تھے، خلیفہ مہدی کو اس مہم سے بہت زیادہ دلچسپی تھی، اس نے اس کے انتظامات کے لیئے ابوالقاسم محرز بن ابراہیم کو خاص طور سے مقرر کیا، چنانچہ پورے انتظام واہتمام کے ساتھ یہ فوج روانہ ہوئی یہاں تک ۱۶۰ھ میں بلاد ہند کے مقام باربد میں پہونچ گئی۔[1]

اس کے بعد امام طبری نے ۱۶۰ھ کے واقعات میں اس غزوہ کی تفصیل یوں لکھی ہے کہ اس سال عبد الملک بن شہاب مسمعی مطوعہ وغیرہ افواج کو لے کر شہر باربد پہونچے، اور دو دن کے بعد جنگ شروع کر دی، اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو زبردست فتح دی، اسلامی فوج کے سوار بستی میں ہر طرف پھیل گئے اور دشمن اپنے بتخانہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے، آخر ان کو شکست ہوئی اور ان کے تمام آدمی کام آئے، مسلمانوں میں سے بیس سے کچھ زائد آدمی شہید ہوئے، اس طرح اللہ تعالےٰ نے یہ شہر مسلمانوں کے قبضہ میں دے دیا، مگر جنگ کے بعد سمندر میں طغیانی آگئی اس لیے اسلامی فوج فوراً واپس نہ ہو سکی، اور موسم کے خوشگوار ہونے اور مد و جزر ختم ہونے تک ٹھہر گئی، اسی زمانۂ قیام مجاہدوں میں ایک وبائی بیماری پھیل گئی جسے "حمام قر" کہا جاتا ہے، یہ منہ میں پھوڑے پھنسی کی شکل میں پیدا ہوتی تھی، اس بیماری میں ایک ہزار آدمی کے قریب مر گئے، ان ہی مرنے والوں میں ربیع بن صبیح بھی ہیں، جب حالات سازگار ہوئے تو مسلمان کی فوج وہاں سے روانہ ہوئی۔ اور جب فارس کے ایک ساحل پر پہونچی جسے بحر حمران کہا جاتا ہے تو رات کو نہایت تند و تیز ہوا چلی جس نے تمام جہازوں کو توڑ دیا، اس طوفان کی وجہ سے کچھ آدمی غرق ہو گئے اور کچھ بچ گئے، جو لوگ بچ گئے تھے، انہوں نے یہاں کے قیدیوں کو بصرہ کے گورنر محمد بن سلیمان کی خدمت میں پیش کیا، ان میں باربد کے راجہ کی بیٹی بھی شامل تھی۔[2]

باربد بھاڑ بھوت کی تعریب ہے، جو گجرات کے ضلع بھڑوچ میں ایک قدیم تاریخی

---

[1] تاریخ طبری ج ۶ ص ۱۵۳، [2] تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۶۲،

مقام ہے، یہاں مہاراجگان بلہرا کے ماتحت ایک راجہ حکومت کرتا تھا، نیز یہاں ایک بہت بڑا بت خانہ تھا۔ اب بھی ہر بارہ سال کے بعد یہاں مذہبی میلہ لگتا ہے۔

امام ربیع کی جائے وفات اور مدفن

غزوہ باربد کی تفصیل سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ غزوہ بلاد الہند کے ایک شہر باربد میں ہوا، جو اس زمانہ میں ایک راجہ کی راجدھانی تھا، اور امام ربیع بن صبیح مع دوسرے ایک ہزار مجاہدین اسلام کے اسی جگہ یا اس کے قریب کہیں وبائی مرض میں انتقال کر گئے، اور جائے انتقال ہی پر ان کی تجہیز و تکفین ہوئی، ان حضرات کے ہندوستان میں باربد یا اس کے آس پاس انتقال کرنے کے شواہد یہ ہیں، طبری نے لکھا ہے۔

وفیها وجّہ المھدی عبد الملک بن شہاب المسمعی فی البحر الی بلاد الھند،	۱۵۹ھ میں مہدی نے عبد الملک بن شہاب مسمعی کو بحری راہ سے بلاد ہند کی طرف روانہ کیا۔

پھر آگے چل کر لکھا ہے۔

فمضوا لوجههم حتی أتوا باربد من بلاد الهند [1]	یہ لوگ چلے اور سیدھے بلاد ہند کے شہر باربد میں پہونچ گئے۔

ابن اثیر نے الکامل میں لکھا ہے کہ مہدی نے ۱۵۹ھ میں بحری راہ سے ایک فوجی مہم جس کے امیر عبد الملک بن شہاب مسمعی تھے بلاد ہند کو روانہ کی، اس میں بہت سے فوجی اور مطوعہ کے رضا کار شامل تھے، ان میں ربیع بن صبیح بھی تھے اور یہ لوگ باربد آئے [2]

امام ذہبیؒ نے العبر فی خبر من غبر میں لکھا ہے ۱۶۰ھ میں مسلمانوں نے عبد الملک مسمعی کی زیر قیادت ہندوستان کا ایک بہت بڑا شہر فتح کیا [3]

اسی طرح دوسرے مورخوں نے ہندوستان کے غزوہ باربد کا حال لکھا ہے اور امام ربیع کی وفات اسی سلسلہ میں بتائی ہے۔ مگر ان کے مدفن کی تعیین تاریخی دلائل و شواہد کی

---

[1] تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۵۲/۲۵۳، [2] الکامل ج ۶ ص ۱۱، [3] العبر ج ۱ ص ۱۳۳ طبع کویت۔

روشنی میں نہیں ہوسکی کہ کس مقام میں ان کی وفات ہوئی اور کس جگہ وہ دفن کیے گیے، علامہ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے:۔

خرج غازیاً الی الھند فمات فدفن فی جزیرۃ من الجزائر سنۃ ۱۶۰ فی اول خلافۃ المھدی اخبرنی بذلک شیخ من اھل البصرۃ کان معہ[۱]	ربیع غزوہ کے لیے ہندوستان گئے اور ۱۶۰ھ میں مہدی کے ابتدائی دورِ خلافت میں اسی اثنا میں فوت ہوگئے اور اس کے جزیروں میں سے ایک جزیرہ میں دفن کیے گئے، اس کی خبر مجھے بصرہ کے ایک شیخ نے دی ہے جو ان کے ساتھ تھے۔

ابن سعد کا یہ بیان اس لیے بہت ہی ثقہ اور معتمد ہے کہ اسے انھوں نے بصرہ کے ایک ایسے بزرگ کی زبانی سنا ہے جو خود امام ربیع کے ساتھ جنگ باربد میں شریک تھے، علامہ ابن سعد کی اسی تحقیق اور روایت کو علامہ بلاذری نے فتوح البلدان میں یوں تسلیم کیا ہے،

وکان خرج غازیاً الی الھند فی البحر فمات فدفن فی جزیرۃ من الجزائر سنۃ ستین ومائۃ[۲]	ربیع بحری راہ سے ہندوستان کی طرف جہاد کے لیے نکلے اور اسی اثنا میں ۱۶۰ھ میں فوت ہوئے اور ایک جزیرے میں دفن کیے گیے۔

امام ذہبیؒ نے غزوۂ ہند سے واپسی پر ربیع کے فوت ہونے کی یوں تصریح کی ہے:۔

وتوفی فی غزوۃ الھند فی الرجعۃ بالبحر الربیع بن صبیح صاحب الحسن[۳]	ربیع بن صبیح صاحب الحسن غزوۂ ہند کے بعد براہ سمندر واپسی پر فوت ہوئے۔

اور یہی عبارت علامہ ابن عماد حنبلی نے بھی شذرات الذہب میں ۱۶۰ھ کے واقعات میں لکھی ہے[۴]

ان تمام مورخوں اور تذکرہ نویسوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ربیع کی

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۷ قسم دوم ص ۳۶، [۲] فتوح البلدان ص ۳۶۲،
[۳] العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۲۳۴ [۴] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۴۷

جائے وفات اور مدفن خود بھاڑ بھوت یا اس کے اور سمندر کے درمیان کوئی جزیرہ اور ٹاپو ہے گجرات کے مسلمانوں میں اب تک عام طور سے مشہور ہے کہ بھاڑ بھوت ضلع بھڑوچ اور رانڈیر ضلع سورت میں کسی تابعی کا مزار ہے، بلکہ رانڈیر میں ایک خاص مزار کو تابعی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، مگر یہ محقق نہیں ہے، ظاہر ہے کہ ان ہی دونوں جگہوں میں سے کسی میں یا آس پاس حضرت ربیع بن صبیح اور دوسرے ہزاروں مجاہدین اسلام آسودۂ خواب ہیں، غالب کا گمان ہے کہ یہ مقدس خطہ بھاڑ بھوت، یا اس کے قریب کہیں ہوگا۔

ربیع بن صبیح کے ہندوستان میں فوت ہونے کی ان تمام تصریحات کے علی الرغم امام بخاریؒ نے ان کی جائے وفات سندھ کو بتایا ہے، تاریخ کبیر میں فرماتے ہیں:۔

مات سنة ستين ومائة بارض السند[1]	ربیع ۱۶۰ھ میں سرزمین سندھ میں مرے۔

نیز حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے۔

قال محمد بن المثنی وغیرہٗ مات سنة ۱۶۰ بارض السند۔	محمد بن مثنیٰ وغیرہ نے کہا ہے کہ ربیع سرزمین سندھ میں مرے۔

ہمارے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ تیسری صدی تک سندھ بول کر عرب سیاح وجغرافیہ نویس گجرات تک کے ساحلی علاقوں اور شہروں کو بھی اس میں شمار کرتے تھے جیسا کہ ابن خرداذبہ (موجود ۲۵۰ھ) نے المسالک والممالک میں گجرات کے کئی شہروں کو سندھ ہی میں شمار کیا ہے[2] حالانکہ عام مورخ اور جغرافیہ نویس ہندوستان اور سندھ کو دو الگ الگ ملک تسلیم کرتے تھے، اور سندھ کے بعد قامہل نامی مقام سے ہندوستان کی حد بتاتے تھے جس میں گجرات کے ساحلی علاقے پڑتے تھے۔

اسی طرح ہمارے تمام ہندی تذکرہ نویسوں نے حضرت ربیع کی جائے وفات متفقہ طور سے سندھ میں بتائی ہے، ہمارے علم میں سب سے پہلے علامہ محمد طاہر گجراتیؒ نے المغنی

[1] التاریخ الکبیر ج ۲ قسم اول ص ۲۵۵، [2] المسالک والممالک ص ۵۷۔

ہیں ربیع کے سندھ میں انتقال کی تصریح کی ان کے بعد تمام ہندوستانی تذکرہ نویسوں نے اسی کو سامنے رکھ کر ان کی جائے وفات سندھ لکھ دی، اور کسی نے ابن سعد، بلاذری، طبری، ذہبی، ابن اثیر، ابن خلدون اور ابن عماد حنبلی وغیرہ کی تصریحات پر توجہ نہیں دی، چنانچہ علامہ غلام علی آزاد نے سبحۃ المرجان فی آثار الہندوستان ص ۲۶ میں، مولوی رحمٰن علی نے تذکرہ علمائے ہند ص ۳ میں، اور مولانا عبد الحی نے نزہتہ الخواطر ج ۱ ص ۳۲ میں، امام ربیع کی جائے وفات سندھ ہی میں بتائی ہے، امام بخاریؒ نے اپنے زمانہ کی اصطلاح کے مطابق ہندوستان کے اس علاقہ کو سندھ میں شمار کر کے ربیع کی جائے وفات سندھ بتائی، اگر ان ہندوستانی تذکرہ نویسوں نے ہندوستان میں رہ کر اسے سندھ میں بتایا، اس کی وجہ بظاہر یہ غلط فہمی ہے کہ بلاد ہند سے مراد ان کے نزدیک سندھ ہی کے علاقے تھے اور ان ہی میں کہیں باربد واقع تھا اور دوسری صدی ہجری تک مسلمانوں کی عام سرگرمی کا مرکز صرف سندھ کا علاقہ تھا، حالانکہ عرب مورخ سندھ اور ہند کو الگ الگ ملک شمار کرتے تھے، اور انہوں نے غزوۂ باربد میں جو بار بار بلاد ہند اور ہند لکھا ہے وہ بلا وجہ نہیں ہے نیز ہندوستان کے ساحلی علاقے اس زمانہ میں مسلمانوں کی سرگرمی سے متاثر ہو چکے تھے۔ اور غزوۂ باربد سے پہلے متعدد اقدامات ہوئے تھے۔

امام ربیع کی اولاد و احفاد

آپ کی اولاد عبادان اور دوسرے مقامات پر پھلی پھولی اور ان کی نسل سے علماء و صلحاء پیدا ہوئے، مگر ہمیں ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہ ہو سکیں، البتہ دو صاحبزادوں اور ایک نواسہ کا حال مل سکا ہے، (۱) سلیمان بن ربیع ہندی (۲) عبدہ بن ربیع بن صبیح (۳) اور نواسہ اسحاق بن عباد، سلیمان بن ربیع ہندی کا مختصر حال علامہ محمد طاہر گجراتی نے قانون الموضوعات والضعفاء میں امام سیوطی کی کتاب الوجیز کے حوالے سے بیان کیا ہے، اور ان کی تضعیف میں امام دار قطنی کا قول نقل کیا ہے۔ [1]

[1] قانون الموضوعات ملحق تذکرۃ الموضوعات طبع مصر۔

عبدہ بن ربیع بن صبیح کا حال نہیں مل سکا، البتہ آگے چل کر ان کی نسل میں ایک عالم و محدث ابوبکر احمد بن سلیمان بن ایوب بن اسحاق بن عبدہ بن ربیع بن صبیح عبادانی قرشی ہیں۔ علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اور لکھا ہے کہ ابوبکر احمد بن سلیمان عبادانی قرشی بغداد میں قیام کرتے تھے، علی بن حرب سے حدیث کی روایت کی، اور ان سے مشہور امام حدیث ابوعبد اللہ حاکم اور ابوعلی بن شاذان نے روایت کی، ان دونوں حضرات کے علاوہ بھی ایک جماعت نے آپ سے علم حاصل کیا[۱]۔ امام ربیع بن صبیح کے ایک بھائی منصور بن صبیح ہیں انہوں نے حضرت سیمویہ[رح] سے حدیث کی روایت کی ہے۔ امیر ابن ماکولا نے حضرت سیمویہ[رح] کے ذکر میں لکھا ہے۔ روی عنہ منصور بن صبیح اخو الربیع بن صبیح (ج ۴ ص۵۶) امام منصور کی مرویات کو امام طبرانی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ حافظ ابن عبد البر نے بھی لکھا ہے کہ سیمویہ بلقاوی سے ربیع بن صبیح کے بھائی منصور بن صبیح نے روایت کی ہے (استیعاب ج ۲ ص۱۳۴ برحاشیہ اصابہ)

اسحاق بن عباد امام ربیع کے نواسے ہیں، ابن ابی حاتم رازی نے کتاب الجرح والتعدیل میں ان کو ابن ابنۃ ربیع بن صبیح لکھا ہے، انہوں نے سلمہ بن سعید سے اور ان سے عبد الصمد بن محمد عبادانی نے روایت کی ہے[۲]۔ عبد الصمد بن محمد عبادانی نے امام احمد سے بھی روایت کی ہے، اور امام احمد کے بعض واقعات نقل کئے ہیں[۳]۔

حضرت امام ربیع بن صبیح بصری سعدی ہندی کے حالات ہم نے تاریخ و رجال کی کتابوں سے چھان بین کر کے جمع کئے ہیں، تلاش و تحقیق سے کچھ مزید حالات بھی مل سکتے ہیں۔

امام ربیع کی بعض مرویات

اب ہم تبرک کے طور پر امام ربیع بن صبیح بصری کی بعض مرویات و احادیث کو نقل کرتے ہیں، سنن ترمذی میں ابواب تفسیر القرآن عن رسول اللہ

---

[۱] کتاب الانساب ورق ۳۷۵ طبع یورپ، [۲] کتاب الجرح والتعدیل ج ا ق ۲ ص۲۲۳
[۳] مناقب الامام احمد، لابن جوزی ص۳۴ ۔

صلے اللہ علیہ وسلم میں تفسیر سورہ آل عمران کے سلسلے میں ہے :-

حدثنا ابوکریب، نا وکیع عن ربیع - وھو ابن صبیح - وحماد بن سلمۃ عن ابی غالب، قال رأی ابوامامۃ رؤسا منصوبۃ علی درج دمشق، فقال ابوامامۃ: کلاب النار شر قتلی تحت ادیم السماء خیر قتلی من قتلوہ ثم قرأ یوم تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ الی اٰخر الاٰیۃ قلت لابی امامۃ انت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لولم اسمعہ الا مرۃً او مرتین اوثلاثاً اواربعاً حتی عد سبعا ماحدثتکموہ، ھذا حدیث حسن [۱]

امام ترمذی کہتے ہیں کہ ہم سے ابوکریب نے بیان کیا ہے کہ ہم سے وکیع نے ربیع بن صبیح اور حماد بن سلمہ سے بیان کیا کہ ابوغالب نے کہا کہ ایک مرتبہ حضرت ابوامامہ رضؓ نے باب دمشق کی سیڑھیوں پر خوارج کے کچھ سر دیکھے تو ابوامامہ رضؓ نے کہا کہ یہ جہنم کے کتے ہیں' آسمان کے نیچے بدترین مقتول ہیں' اور جسے انہوں نے قتل کیا ہے' (یعنی حضرت علیؓ) وہ بہترین مقتول ہیں' پھر یہ پوری آیت پڑھی یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ' یہ سن کر میں نے حضرت ابوامامہ سے سوال کیا کہ کیا آپ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے انکے بارے میں یہ سنا ہے' اس پر ابوامامہ نے فرمایا کہ اگر میں نے اسے آپ سے ایک یا دو یا تین یا چار حتی کہ سات بار نہ سنا ہوتا تو تم سے اسے بیان نہ کرتا بلکہ اس سے بھی زیادہ مرتبہ سنا ہے ۔

اس روایت کو امام احمد نے اپنی مسند میں' اور ابن ماجہ نے اپنی سنن میں بھی بیان کیا ہے' البتہ ان دونوں کی روایت کے الفاظ میں کچھ فرق ہے [۲]

امام ربیع کے تلمیذ رشید امام محمد شیبانیؒ نے بھی آپ کی احادیث ومرویات کو اپنی کتابوں میں درج فرمایا ہے' ہم ان کی کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ سے چند احادیث نقل

---

[۱] سنن ترمذی' ابواب تفسیر القرآن [۲] تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی ج ۴ ص ۸۲ ۔

کرتے ہیں، باب الخطأ والنسیان والسہو میں امام محمد نے کہا ہے:۔

اخبرنا الربیع بن صبیح البصری عن الحسن بن ابی الحسن البصری أنہ قال فی رجل تناول فی صلاتہ کوزا من ماء فشرب منہ ناسیاً انہ یعید الصلاۃ[1]۔	ہمیں ربیع بن صبیح بصری نے حسن بصری سے خبر دی کہ انہوں نے فرمایا کہ جو آدمی بھول کر اپنی نماز میں پانی کا کوزہ لے کر پی جائے تو وہ اپنی نماز لوٹائے۔

باب غسل الجمعہ میں ہے:۔

اخبرنا الربیع بن صبیح البصری عن یزید الرقاشی عن انس بن مالک وعن الحسن البصری رضی اللہ عنہما کلاهما یرفعہ إلی النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم۔ انہ قال، من توضأ یوم الجمعۃ فبہا ونعمت، ومن اغتسل فالغسل افضل[2]۔	ہمیں ربیع بن صبیح بصری نے یزید رقاشی سے خبر دی انہوں نے حضرت انس بن مالک سے روایت کی نیز ربیع نے حسن بصری سے روایت کی اور یزید وحسن دونوں مرفوعاً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن وضو کرے تو یہ بھی بہت اچھی بات ہے اور جو شخص غسل کرے تو غسل افضل ہے۔

باب الرجل ینبغی صیام ثلاثۃ ایام فی الحج میں ہے:۔

اخبرنا الربیع بن صبیح عن یزید الرقاشی عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نھی عن صوم خمسۃ ایام، یوم الفطر ویوم النحر وایام التشریق[3]۔	ہمیں ربیع بن صبیح نے یزید رقاشی سے خبر دی انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پانچ دنوں میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے عید الفطر عید الاضحیٰ اور ایام تشریق۔

[1] کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ ج ۱ صفحہ ۲۵۲ طبع حیدر آباد ۱۳۸۵ھ [3] ، صفحہ ۲۸۰ و مؤطا امام محمد صفحہ ۱۳ [2] ، صفحہ ۳۸۹ و صفحہ ۳۹۰ ۔

باب الرجل یاکل اوشرب ناسیا میں ہے۔

اخبرنا الربیع بن صبیح، قال حدثنا الحسن البصری قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: اذا اکل احدکم اوشرب ناسیًا وھو صائم فی شھر رمضان اوغیر رمضان فان اللہ اطعمہ وسقاہ فلیمض فی صومہ[1]

ہمیں ربیع بن صبیح نے خبر دی کہ حسن بصری نے ہم سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم میں سے کوئی آدمی رمضان یا غیر رمضان میں روزہ رکھے اور بھول کر کھاپی لے تو اسے اللہ تعالےٰ نے کھلایا پلایا، اسے چاہیئے کہ اپنا روزہ پورا کرے۔

امام خطیب بغدادیؒ نے الکفایۃ فی علم الروایۃ میں لکھا ہے:۔

یحیی بن بکیر: ثنا الربیع بن صبیح عن الحسن قال: کان یقول: لیس لأھل البدعۃ غیبۃ[2]

یحیٰی ابن بکیر نے بیان کہ ہم سے ربیع بن صبیح نے امام حسن بصری سے روایت کی ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ اہل بدعت کی خرابی بیان کرنا غیبت نہیں ہے

یعنی حدیث کے معاملہ میں اہل بدع و اہواء پر جرح کرنا اور ان کے عیوب کو ظاہر کرنا غیبت نہیں ہے، بلکہ صیانتِ حدیث کا ذریعہ ہے۔

الجوہر النقی میں ہے۔

عن محمد بن القاسم الأسدی عن الربیع بن صبیح عن الحسن عن انس بن مالك قال: أذن بلال فأمرہ النبی صلے اللہ علیہ وسلم أن یعید[3]

محمد بن قاسم وسدی نے روایت کی ربیع بن صبیح سے انہوں نے حسن بصری سے انھوں نے حضرت انس بن مالکؓ سے انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ بلالؓ نے اذان دی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعادہ کرنے کا حکم دیا۔

اسی طرح طحاوی اور حدیث کی دوسری کتابوں میں حضرت ربیع بن صبیح بصریؒ سے احادیث واخبار اور آثار مروی ہیں۔

[1] مؤطا امام محمد ص۱۹۵ [2] الکفایۃ ص۴۳ طبع حیدرآباد [3] الجوہر النقی فی الرد علی البیہقی

(۶)

امام ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری ہندی

حضرت امام حسن بصری متوفی ۱۱۰ھ رحمتہ اللہ علیہ کے تلامذہ میں دو حضرات ان کے خاص الخاص شاگرد ہیں، اور اتفاق سے ان دونوں ہی کا تعلق ہمارے ملک ہندوستان سے اس طرح رہا ہے کہ وہ صاحب الحسن ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی کی نسبت سے مشہور ہوئے، ایک امام ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری ہندی صاحب الحسن محدث و تاجر ہیں، اور دوسرے امام ربیع بن صبیح بصری ہندی صاحب الحسن فقیہ و مجاہد ہیں، ان دونوں بزرگوں کے حالات رجال و تذکرہ اور تاریخ کی کتابوں میں اس قدر کم ملتے ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں، خاص طور سے امام ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری کے حالاتِ زندگی بہت ہی کم ملتے ہیں۔ ان کا تذکرہ سب سے زیادہ تہذیب التہذیب اور میزان الاعتدال میں ہے جو دس بارہ سطروں سے زیادہ نہیں، اور تواریخ و انساب کی دوسری کتابوں میں اس سے بھی کم ہے، تلاش و جستجو کے بعد آپ کے حالات حسب ذیل کتابوں میں ملے ہیں (۱) صحیح بخاری کتاب الصلح اور کتاب الفتن (۲) تاریخ کبیر امام بخاری جلد اول قسم دوم ص ۵۶ (۳) کتاب الجرح و التعدیل، امام ابن ابی حاتم رازیؒ جلد اول قسم اول ص ۳۲ (۴) کتاب الکنی والاسماء دولابیؒ جلد دوم ص ۱۳۳ (۵) کتاب الجمع بین رجال الصحیحین، حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسیؒ جلد اول ص ۳۱ (۶) کتاب الانساب، سمعانی ورق ۵۹۳، (۷) خلاصۂ تہذیب الکمال، خزرجیؒ ص ۳۱، (۸) میزان الاعتدال، ذہبیؒ ص ۹۷ جلد اول (۹) تہذیب التہذیب،

ابن حجرؒ جلد اول صـ۲۶۱، (۱۰) تقریب التہذیب، ابن حجرؒ صـ۳۲ (۱۱) فتح الباری، ابن حجرؒ جلد ۱۳ صـ۱۵۲، اور جلد ۵ صـ۳۳۴ و صـ۳۳۵،

ان ہی مراجع و مصادر سے امام ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری ہندیؒ کے یہ حالات ترتیب دئے گئے ہیں۔ نیز ان کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ (۱۲) کتاب العلل ومعرفۃ الرجال امام احمد بن حنبلؒ (۱۳) تاریخ بغداد، خطیب بغدادی (۱۴) المنتظم ابن جوزیؒ (۱۵) تدریب الراوی، سیوطیؒ (۱۶) عینی شرح بخاری، (۱۷) معجم البلدان یاقوت حمویؒ (۱۸) رجال السند والہند، قاضی اطہر مبارکپوری،

نام ونسب اور وطن اسرائیل نام، باپ کا نام موسیٰ اور کنیت ابوموسیٰ ہے، کتابوں میں سلسلۂ نسب ذکر نہیں ہے، آپ ان علماء میں سے ہیں جن کی کنیت ان کے باپ کے نام پر ہوتی ہے من وافقت کنیتہ اسم ابیہ، خطیب بغدادی نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے، اسماء الرجال میں اس نوع پر خصوصی توجہ ضروری قرار دی گئی ہے کیونکہ ایسے رُواۃ ورجال کی کنیت اور باپ کے نام میں مشابہت سے غلطی کا امکان رہتا ہے، اور اس طرح کے بہت سے رُواۃِ حدیث ہیں مثلاً ابومسلم اغر بن مسلم مدنیؒ، ابوخالد اوس بن خالد بصریؒ ابواسحاق ابراہیم بن اسحاق مدینیؒ، ابواسمٰعیل ادریس بن اسمٰعیل کوفی، ابوزیاد ایوب بن زیاد حمصیؒ، ابوالجواب احوص بن جواب کوفی ضبّی وغیرہ[1]۔ ان ہی حضرات کی طرح ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری بھی ہیں، آپ کا وطن قبۃ الاسلام بصرہ ہے، تمام تذکرہ نگاروں نے اسی نسبت سے آپ کا تذکرہ کیا ہے، البتہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا آبائی وطن کوفہ تھا مگر بعد میں بصرہ کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا تھا، چنانچہ دولابیؒ نے عباس بن محمد کی زبانی امام یحییٰ بن معینؒ کا ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے۔

[1] تدریب الراوی سیوطی صـ۵۳۶ (طبع جدید مصر)

ابوموسیٰ اسرائیل الذی روی عنہ ابن عُیینۃ کوفی نزل البصرۃ[1] — ابوموسیٰ اسرائیل جن سے ابن عیینہ نے روایت کی ہے، وہ کوفی ہیں بصرہ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔

یہاں پر یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ابوموسیٰ کی کنیت سے ایک دوسرے محدث ہیں، جنہوں نے امام وہب بن منبہؒ سے روایت کی ہے اور ان سے امام سفیان ثوریؒ نے روایت کی ہے، یہ یمن کے رہنے والے ہیں اور یمانی کی نسبت سے مشہور ہیں، بعض محدثین کے نزدیک بعض وجوہ کی بنا پر ان دونوں ابوموسیٰ کے درمیان اشتباہ ہو گیا ہے، مگر ابن حبان نے کتاب الثقات میں، امام احمد نے کتاب العلل ومعرفۃ الرجال میں، اور ابن جارود نے کتاب الکنیٰ میں ان کے درمیان فرق بیان کیا ہے امام سعید بن یحییٰ قطان نے ابوموسیٰ یمانی کو شیخ مجہول قرار دیا ہے، جبکہ تمام محدثین اور ائمہ جرح وتعدیل نے ابوموسیٰ بصری کو ثقہ ومعتمد بتایا ہے[2]۔

شیوخ واساتذہ — ابوموسیٰ اسرائیل تبع تابعین میں سے ہیں یعنی انہوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حلقہ نشینوں کی صحبت میں رہ کر اکتسابِ فیض کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے ان کو تقریب التہذیب میں رواۃِ حدیث کے طبقۂ سادسہ میں شمار کیا ہے، یہ طبقہ اور اس کا اگلا پچھلا طبقہ حاملینِ علومِ نبوت سے معمور تھا، اور پورا عالمِ اسلام ان کی علمی اور دینی سرگرمیوں سے آباد تھا، قال اللہ وقال الرسول کی صدا سے اسلامی بلاد وامصار گونج رہے تھے، اساتذہ وتلامذہ کی کثرت سے ہر بستی علم کا مرکز بنی ہوئی تھی، امام ابوموسیٰ اسرائیل نے اسی ماحول میں نشوونما پائی، اور اسی فضا میں اپنے علم وعمل کی دنیا آباد کی، قبۃ الاسلام بصرہ اس وقت دینی اور علمی رجال کا گہوارہ تھا، اور عراق میں کوفہ کے بعد مسلمانوں کے علوم وتمدن کا دوسرا مرکز تھا، اس شہر میں جہاں اور بہت سے اربابِ علم وفضل موجود تھے، وہاں شیخ الکل فی الکل حضرت امام حسن بصریؒ بھی موجود

---

[1] کتاب الکنیٰ والاسماء ص ۱۳۴ ج ۲ (طبع حیدرآباد) [2] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۲۵۲۔

تھے، جامع بصرہ سے لے کر گلی کوچوں تک میں ان کا فیض جاری تھا، اور دنیا کھنچ کھنچ کر ان کی حلقہ نشین بن رہی تھی، امام ابوموسیٰ اسرائیل ان کے دامن سے یوں وابستہ ہوئے کہ صاحب الحسن کے لقب سے مشہور ہوئے، انہوں نے اپنے زمانہ کے دوسرے شیوخ واساتذہ سے بھی علم حاصل کیا، امام ذہبی رحؒ نے میزان الاعتدال میں آپ کے تذکرہ میں تحصیل کے بارے میں عن الحسن وجماعۃ لکھا ہے[1] دوسرے تذکرہ نگاروں نے امام حسن بصری کے ساتھ امام محمد بن سیرینؒ، امام ابوحازم اشجعیؒ اور امام وہب بن منبہ جیسے مشاہیر تابعین کو بھی ان کے اساتذہ کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

ابو موسیٰ اسرائیل کے خصوصی شیخ حضرت امام حسن بصری کا ابتدائی زمانہ صحابۂ کرام کی برکتوں سے معمور تھا، آپ نے جن صحابۂ	امام حسن بصریؒ سے خصوصی تلمذ و تعلق

کرام کا زمانہ پایا اور ان سے اکتسابِ علم وفضل فرمایا، ان کی فہرست طویل ہے جس میں یہ حضرات زیادہ مشہور ہیں حضرات ان بن ابی طالبؓ، عمر بن خطابؓ، اُبی بن کعبؓ سعد بن عبادہؓ، ثوبانؓ، عمار بن یاسرؓ ابوہریرہؓ، عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ، معقل بن سنانؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، ابوبکرہؓ، عمران بن حصینؓ، جندب بجلیؓ، عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ، معاویہ بن ابی سفیانؓ، معقل بن یسارؓ انس بن مالکؓ اور جابر رضی اللہ عنہم، ان میں سے کچھ حضرات کا زمانہ آپ نے نہیں پایا مگر ان سے روایت کی، اور کچھ حضرات کا زمانہ پایا اور ان سے سماع کر کے حدیث کی روایت کی، علماء نے امام حسن بصریؒ کے اساتذہ وشیوخ میں ان صحابۂ کرام کے اسماء لکھنے کے بعد وخلق کثیر من الصحابۃ والتابعین لکھا ہے، ابن حبانؒ نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ آپ نے ایک سو بیس صحابہؓ کو دیکھا ہے[2]

ابو موسیٰ اسرائیل بصری کے شیوخ میں حضرت امام حسن بصری کو بڑی خصوصیت

---

[1] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۹۷ [2] تہذیب التہذیب۔

حاصل ہے، اور اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ صاحب الحسن کے لقب سے مشہور ہیں اور امام حسن بصریؒ کی کئی باتیں علمائے اسلام کو ابو موسی اسرائیل کے ذریعہ معلوم ہوئیں، اور ان میں وہ منفرد تسلیم کئے جاتے ہیں، چنانچہ امام بخاریؒ نے کتاب الصلح میں اسرائیل کی ایک حدیث درج کر کے بتایا ہے کہ اسرائیل کی اسی حدیث کی سند سے ہم کو معلوم ہوا کہ حسن بصری کا حضرت ابو بکرہؓ سے سماع ثابت ہے، ابو موسی اسرائیل نے حضرت حسن سے ایک حدیث روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ:۔

قال الحسن سمعت أبا بکرۃ یقول رأیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم علی المنبر الخ	حسن بصری نے کہا کہ میں نے حضرت ابو بکرہ سے سنا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو منبر پر دیکھا۔

اس روایت میں حسن بصری کے ابو بکرہؓ سے سماع کی تصریح ہے، اس موقع پر امام بخاریؒ نے لکھا ہے:۔

قال لی علی بن عبد اللہ انما صح عندنا سماع الحسن من ابی بکرۃ بھذا الحدیث[1]	علی بن مدینیؒ نے مجھ سے کہا کہ ہمارے نزدیک حسن بصری کا سماع ابو بکرہؓ سے اسی حدیث کی وجہ سے صحیح ثابت ہے۔

اور تاریخ کبیر میں لکھا ہے:۔

وانما ثبت عندنا سماع الحسن من ابی بکرۃ بحدیث اسرائیل[2]	ہمارے نزدیک حسن بصری کا سماع ابو بکرہ سے اسرائیل کی اس حدیث سے ثابت ہے۔

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ فضلائے صحابہ میں سے تھے، بصرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، ان کی اولاد کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور ان سے ان کی اولاد نے روایت کی، زیاد بن ابو سفیان کی ولایت کے زمانے میں بصرہ ہی میں ۵۰ھ یا ۵۱ھ یا ۵۲ھ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلح [2] تاریخ کبیر جلد اول قسم دوم ص ۵۶؎

میں وفات پائی،

ابوموسی اسرائیل کے امام حسن بصری سے اسی خصوصی تعلق کی بنا پر امام صاحب کے بعض اقوال وملفوظات بھی ان ہی کے ذریعہ امت تک پہونچے ہیں، اور وہی تنہا ان کے راوی ہیں، چنانچہ دولابی نے سفیان بن عُیینہ سے روایت کی ہے:۔

عن اسرائیل ابی موسی قال: سمعت الحسن یقول ان: العبد لیذ نب فما یزال بہ کئیبًا حتیٰ ید خل الجنۃ[1]۔

ابوموسیٰ اسرائیل سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حسن بصری کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بندہ گناہ کر کے ہر وقت غمگین رہتا ہے، یہاں تک کہ اسی حزن وغم کے باعث جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

اگرچہ ابوموسی اسرائیل نے اپنے وقت کے کئی شیوخ واساتذہ سے فیض پایا مگر امام حسن بصری کی صحبت نے ان کے جوہر کو چمکایا اور ان کی حلقہ نشینی نے ابوموسی اسرائیل کو صاحب الحسن بنایا۔

امام محمد بن سیرین بصریؒ امام ابوبکر محمد بن سیرین بصری رحمۃ اللہ علیہ حضرت انسؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، بڑے ثقہ تابعی اور محدث وفقیہ ہونے کے ساتھ معبّر بھی تھے، زہد وتقوٰی میں یگانۂ روزگار تھے، امام ابن سیرین نے بہت سے صحابۂ کرام سے روایت کی ہے جن میں حضرات انس بن مالکؓ، زید بن ثابتؓ، رافع بن خدیجؓ، سلیمان بن عامرؓ، سمرۃ بن جندبؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ، عمران بن حصینؓ، کعب بن عجرؓ، معاویہ بن ابی سفیانؓ، ابودرداءؓ، ابوسعید خدریؓ، ابوہریرہؓ، ابوقتادہؓ، ابوبکر ثقفیؓ، ام المومنین عائشہؓ اور ام عطیہ رضی اللہ عنہم قابلِ ذکر ہیں، ان کے علاوہ بہت سے تابعین سے بھی روایت کی ہے شوال ۱۱۰ھ میں فوت ہوئے۔

امام ابوحازم اشجعی کوفی نام سلمان ہے، مگر کنیت سے مشہور ہیں، صحابۂ کرام میں حضرات

---

[1] کتاب الکنیٰ والاسماء ج ۲ ص ۱۳۴۔

حسنؓ، حسینؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے احادیث کی روایت کی ہے، نیز اپنے زمانہ کے تابعین سے تحصیلِ علم کی تمام محدثین آپ کی ثقاہت پر متفق ہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت میں فوت ہوئے۔

امام وہب بن مُنَبِّہ یمانی

امام ابوعبداللہ وہب بن منبہ یمن کے شہر صنعاء کے رہنے والے تھے، آبائی وطن خراسان کا شہر ہرات تھا، آپ کے والد کسریٰ کے زمانہ میں یمن آکر آباد ہو گئے، امام وہب بن منبہ کی ولادت خلافتِ عثمانی میں ۳۴ھ میں ہوئی، صنعاء کے قاضی تھے، اس زمانہ میں بھی ہرات آتے جاتے تھے اور وہاں کے معاملے کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ آپ نے حسب ذیل صحابہ کرام سے روایت کی ہے، حضرات ابوہریرہؓ، ابوسعید خدریؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ، جابرؓ، انسؓ اور عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہم نیز آپ نے ابوخلیفہ ظفری، اور اپنے بھائی ہمام بن منبہ تلمیذ حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ سے روایت کی ہے، ۱۱۰ھ میں فوت ہوئے، حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں تصریح کی ہے کہ امام وہب بن منبہ یمانی ابوموسیٰ اسرائیل کے شیوخ میں سے ہیں آپ کے شاگردوں میں ایک اور ابوموسیٰ یمانی ہیں، بعض لوگوں کو دونوں ابوموسیٰ میں اشتباہ ہو گیا ہے مگر ائمہ نے دونوں میں فرق بیان کیا ہے، "چنانچہ کتاب العلل و معرفۃ الرجال میں امام احمد بن حنبلؒ کے صاحبزادے عبداللہ کا قول ہے:-

حدثنی أبی فی حدیث نعیم: عن سفیان عن ابی موسیٰ عن وھب بن منبہ عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم من سکن البدو جفا" قال ابی: ولیس ھو اسرائیل	میرے والد (امام احمد) نے نعیم سے روایت کی انہوں نے سفیان سے، انہوں نے ابوموسیٰ سے، انہوں نے وہب بن منبہ سے، انہوں نے ابن عباس سے، انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ نے فرمایا ہے من سکن البدو جفا میرے والد نے اس موقع پر

ابوموسی، ھذا ایمانی، یحدث وھب بن منبہ[1]	فرمایا کہ یہ ابوموسی، اسرائیل ابوموسی نہیں ہے، بلکہ یمنی ہیں جو وہب بن منبہ سے روایت کرتے ہیں۔

امام ابوموسی اسرائیل بن موسی کے ان شیوخ اساتذہ نے جن صحابہ کرام سے تحصیلِ علم کی ہے، ان کی فہرست دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جن خوش بختوں نے ان گنج ہائے گراں مایہ سے حصہ پایا ہے وہ کس قدر علم وفضل اور دین و دیانت کی دولت کے مالک ہوئے ہونگے اور ان کے شاگردوں کو اپنے شیوخ کے واسطہ سے علوم نبوت کی وراثت سے کس قدر حصۂ وافر ملا ہوگا، اور خود ابوموسی اسرائیل کو اپنے ان شیوخ سے کیا کیا علمی ودینی فیوض و برکات پہونچے ہوں گے؟

اصحاب وتلامذہ دوسری صدی ہجری کا درمیانی زمانہ جو ابوموسی اسرائیل بن موسیٰ کی زندگی کا بہترین دور تھا۔ اسلامی علوم وفنون اور کتاب وسنت کی بہار سے گلستاں بن رہا تھا، ہر شہر وقریہ، تابعین اور تبعِ تابعین کے علمی فیوض سے دار العلوم بنا ہوا تھا، اس میں ابوموسی اسرائیل کی ذات بھی ایک دار العلم تھی، جس سے بصرہ، کوفہ، مکہ وغیرہ کے طلباء فیض یاب ہوتے تھے، ان مقامات میں آپ درس دیا کرتے تھے، اور یہ دار العلم کبھی کبھی اٹھ کر ہندوستان چلا آتا تھا اور صحابہ وتابعین کے علوم کے دریا بہاتا تھا،

بصرہ آپ کا وطن ہی تھا، جہاں آپ مستقل طور سے درس وتدریس میں مصروف رہا کرتے تھے، کوفہ میں بھی آپ نے حدیث کی روایت کی ہے اور یہیں پر آپ کے شاگرد سفیان بن عیینہ نے امام حسن کے فضائل ومناقب کی حدیث آپ سے سنی ہے، صحیح بخاری میں ہے:۔

حدثنا سفیان، قال حدثنا اسرائیل ابوموسیٰ لقیتہ بالکوفۃ[2]۔	سفیان بن عیینہ نے ہم سے بیان کیا کہ اسرائیل ابوموسیٰ نے ہم سے یہ حدیث بیان کی جب کہ میں نے

[1] صحیح بخاری، کتاب الفتن، [2] کتاب العلل ومعرفۃ الرجال، امام احمد بن حنبل ص۲۹۶ طبع انقرہ ۱۹۶۳ء

کوفہ میں ان سے ملاقات کی ہے

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ کوفہ میں ابوموسیٰ اسرائیل سے ملاقات کا تذکرہ کرنے والے امام سفیان بن عیینہ ہی ہیں۔

اس ملاقات کا تذکرہ کرنے والے سفیان بن عیینہ ہیں	قال ذٰلك سفيان بن عيينة [۱]

اسی طرح ابوموسی اسرائیل نے مکہ مکرمہ میں بھی حدیث کا درس دیا ہے، امام بخاری نے تاریخ کبیر میں علی بن مدینی کا بیان درج کیا ہے کہ حسین بن علی جعفی نے ابوموسیٰ اسرائیل سے مکہ میں ملاقات کی۔

علی بن مدینی نے مجھ سے کہا کہ حسین جعفی نے ابوموسیٰ اسرائیل سے مکہ میں ملاقات کی۔	قال لی علیؓ لقيه حسين الجعفي بمكة [۲]

بلکہ حافظ ابوالفضل محمد بن ظاہر مقدسی نے کتاب الجمع بین رجال الصحیحین میں تصریح کی ہے کہ حسین بن علی جعفی کی طرح سفیان بن عیینہ نے بھی مکہ میں ابوموسی اسرائیل سے ملاقات و سماع کا شرف حاصل کیا، اور دونوں نے ایک ساتھ مل کر ان سے درس لیا، وہ ابوموسیٰ اسرائیل کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

ابوموسیٰ اسرائیل سے سفیان بن عیینہ اور حسین جعفی نے روایت کی ہے، اور دونوں نے ان سے مکہ میں سماع کیا ہے۔	روى عنه ابن عيينة وحسين الجعفي سمعا منه بمكة [۳]

امام سفیان بن عیینہ کا اصلی وطن کوفہ تھا مگر وہ مستقل طور سے مکہ مکرمہ میں مقیم ہو گئے تھے، اور کوفہ بھی آنے جانے تھے، اسلئے ان کو دونوں جگہ ابوموسیٰ اسرائیل سے استفادہ کا موقع ملا
ہندوستان میں ابوموسی اسرائیل کے درسِ حدیث دینے اور ان سے روایت کرنے

---

[۱] فتح الباری ج ۱۳ صـ ۵۲، [۲] تاریخ کبیر ج ۱ ق ۲ صـ ۵۶
[۳] کتاب الجمع بین رجال الصحیحین ج ۱ صـ ۴۳۔

کا پتہ کتابوں سے نہیں چلتا، لیکن ظاہر ہے کہ آپ متحرک درس گاہ تھے، اس لیے جہاں جہاں گئے ہوں گے دینی علوم کی اشاعت کی ہوگی، اس دور کے کبارِ شیوخ اور اکابرِ محدثین کی طرح آپ کے شاگردوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا، اور آپ کے حلقۂ درس سے ایسے باکمال علمار نکلے جو امامت کے درجہ پر پہونچے، اور ان کی ذات پر آج تک امت کو بجا طور پر فخر ہے، ان میں سرِ فہرست یہ نام ملتے ہیں سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، یحیی بن سعید القطان، اور حسین بن علی الجعفی رحمہم اللہ، ان ستاروں کی چمک دمک سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مرکزِ نور سے ان کا تعلق تھا وہ کس قدر روشن و درخشاں تھا،

امام سفیان ثوریؒ ابو عبداللہ سفیان بن سعید بن مسروق ثوری کوفیؒ، آپ نے ابو موسیٰ اسرائیل بصری کے علاوہ بہت سے علمار و محدثین سے استفادہ کیا اور امیر المومنین فی الحدیث کے درجہ پر فائز ہوئے، عبداللہ بن مبارک کا قول ہے کہ میں نے جن گیارہ شیوخِ کبار سے احادیث لکھیں ان سب میں سفیان ثوری سے افضل کسی کو نہیں پایا، وہ اگرچہ تبع تابعین میں سے تھے مگر تابعین کے ہم پلہ مانے جاتے تھے۔ ابن ابی ذئب مدنی کا قول ہے کہ میں نے تبعِ تابعین میں سفیان ثوری کے علاوہ تابعین سے زیادہ قریب کسی کو نہیں پایا، ۱۵۵ھ میں اپنے وطن کوفہ سے نکلے تو پھر واپسی نصیب نہیں ہوئی اور ۱۶۱ھ میں بصرہ ہی میں انتقال فرمایا۔ آپ کے شاگردوں میں امام مالک، امام اوزاعی اور امام عبداللہ بن مبارک جیسے ائمۂ دین ہیں۔

امام سفیان بن عیینہ ابو محمد سفیان بن عیینہ بن ابی عمران میمون ہلالی کوفی ۱۰۷ھ میں پیدا ہوئے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر امام مالک اور امام سفیان بن عیینہ نہ ہوتے تو حجاز سے علمِ دین ختم ہو گیا ہوتا، یحیی بن سعید القطان کا قول ہے کہ میرے استاد امام ابن عیینہ چالیس سال سے پوری دنیائے اسلام میں حدیث کے امام ہیں، وطن کوفہ تھا مگر مکہ مکرمہ میں مستقل قیام رہتا تھا، آپ نے مکہ مکرمہ اور کوفہ دونوں جگہ ابو موسیٰ اسرائیل

سے حدیث کی روایت کی ہے، رجب ۱۹۸ھ میں مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے، آپ کے تلامذہ میں امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، جیسے ائمۂ امت شامل ہیں۔

امام یحیٰ بن سعید القطان ابو سعید یحیٰ بن سعید بن فروخ القطان بصری ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے، علی بن مدینی اور ابراہیم بن محمد تیمی کا قول ہے کہ رجالِ حدیث کی معرفت میں آپ سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں ہے۔ آپ عصر کی نماز کے بعد بصرہ کی جامع مسجد میں درس کے لیے بیٹھتے تھے، اور امام علی بن المدینی، امام احمد بن حنبل، امام عمرو بن علی، اور شاذکوفی کھڑے ہو کر آپ سے احادیث کے بارے میں سوالات کرتے اور ان کے احترام میں نہیں بیٹھتے تھے، ابن عمار کا قول ہے کہ جب میں یحیٰ بن سعید القطان کو دیکھتا تو خیال کرتا کہ ان کو کوئی فن نہیں آتا مگر جب وہ بات کرتے تو فقہا بھی خاموشی کے ساتھ ان کی باتیں سنتے تھے ۱۹۸ھ میں انتقال فرمایا، امام احمد بن حنبل، امام علی بن المدینی، امام یحیٰ بن معین، امام سفیان ثوری اور امام سفیان بن عیینہ جیسے سرآمدگانِ روزگار آپ کے حلقہ نشین تلامذہ میں سے ہیں۔

امام حسین جعفی ابو عبد اللہ یا ابو محمد حسین بن علی بن ولید جعفی کوفی ۱۱۹ھ میں پیدا ہوئے بڑے پایہ کے عالم اور باخدا بزرگ تھے، ان کے علم و عمل سے اسلام کا باغ سدا بہار تھا سفیان بن عیینہ باوجودیکہ عمر میں ان سے بڑے تھے، مگر ان کی شاگردی کی، اور وہ اس پر فخر کیا کرتے تھے، سفیان بن عیینہ جب امام جعفی کی آمد کی خبر سنتے تو دوڑ کر ان کے ہاتھ کا بوسہ دیتے امام جعفی نے ظاہری حسن و جمال سے بھی حصۂ وافر پایا تھا، باطنی جمال کا یہ عالم تھا کہ ابدال میں شمار ہوتے تھے، ۲۰۳ھ میں انتقال کیا، جن خوش بختوں نے آپ کے خرمنِ علم و فضل سے خوشہ چینی کی ہے ان میں امام احمد بن حنبلؓ امام یحیٰ بن معین بھی ہیں۔

امام ابو موسیٰ اسرائیل کے ان چند اصحاب و تلامیذ کے مختصر حالات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے حلقۂ درس سے کیسے کیسے اربابِ علم و فضل اٹھے ہیں اور ان کو کیا

مقام و مرتبہ ملا ہے، اگر پھل سے درخت کا پتہ چلتا ہے تو شاگردوں سے ان کے استاذ کا پتہ بھی چلتا ہے'۔

امام ابوموسیٰ اسرائیل کا علمی اور دینی مقام

امام ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ کا درجہ تمام ائمۂ حدیث اور ماہرین جرح و تعدیل کے نزدیک مسلّم ہے، ان کی ثقاہت و عدالت میں کسی کو کلام نہیں بلکہ سب نے ان کی توثیق و تصدیق کی ہے، ابوحاتم رازی، اور یحییٰ بن معین نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے[1] امام نسائی نے ان کے بارے میں لیس بہ بأس کہا ہے[2]۔ صرف ایک محدث ازدی نے ان کے بارے میں کلام کیا ہے اور ان میں لین (نرمی) بتائی ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

شذّ الازدی فقال فیہ لین[3]	ازدی نے سب سے الگ یہ بات کہی ہے کہ ان میں لین ہے۔

بات یہ ہے کہ ازدی کو ابوموسیٰ بصری اور ابوموسیٰ یمانی میں اشتباہ ہو گیا ہے اور انہوں نے ابوموسیٰ یمانی سمجھ کر ابوموسیٰ بصری میں لین اور نرمی بتادی ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر نے ازدی کی اس رائے کی تضعیف کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

وقال الازدی وحدہ فیہ لین ولیس ھو الذی روی عن وھب بن منبہ، وروی عنہ الثوری ذالک شیخ یمانی، وقد فرّق بینھما غیر واحد[3]	صرف ازدی نے ابوموسیٰ کے بارے میں لین کا اطلاق کیا ہے، یہ وہ ابوموسیٰ بصری نہیں ہیں جنہوں نے وہب بن منبہ سے روایت کی ہے اور ان سے سفیان ثوری نے روایت کی بلکہ ازدی نے جن کی تضعیف کی ہے وہ شیخ یمانی ہیں، اور کئی علماء نے ان دونوں میں فرق بیان کیا ہے۔

[1] کتاب الجرح والتعدیل ج ۲ ق ۱ ص ۳۳۳، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۱، تقریب التہذیب ص ۳۲، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۹۷، خلاصہ تذہیب الکمال ص ۳۱، کتاب الانساب سمعانی ورق ۵۹۳ وغیرہ، [2] میزان الاعتدال ص ۹۷ ج ۱۔ [3] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۱۔

پھر ابو موسیٰ یمانی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ابو موسیٰ شیخ یمانی ہیں، انہوں نے وہب بن منبہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ من اتبع الصید غفل (جو شخص صید و شکار کے پیچھے پڑ جائے گا اس میں غفلت اور لاپرواہی آجائے گی) اور ان سے سفیان ثوری نے روایت کی ہے، یہ مجہول ہیں جیسا کہ ابن قطان نے کہا ہے، اور مزی نے ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری کے تذکرے میں لکھا ہے کہ انہوں نے وہب بن منبہ سے روایت کی ہے۔ اور ان سے سفیان ثوری نے روایت کی ہے، اور حالانکہ ابو موسیٰ بصری وہب بن منبہ تک پہونچے بھی نہیں ہیں، اور یہ ابو موسیٰ (شیخ یمانی) دوسرے ہیں، اور ابن حبان نے کتاب الثقات میں، ابن جارود نے کتاب الکنی میں اور دیگر محدثین کی ایک جماعت نے دونوں میں فرق کیا ہے، [۱]

مزی نے ابو موسیٰ بصری اور ابو موسیٰ یمانی کی تفریق کے سلسلے میں ابو موسیٰ بصری کے وہب بن منبہ سے ملنے کا انکار کیا ہے، حالانکہ حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں ان سے روایت کرنے کی تصریح کی ہے، نیز امام احمد بن حنبل نے دونوں ابو موسیٰ میں فرق بیان کیا ہے، جیسا کہ ان کا یہ قول گذر چکا ہے :۔

قال ابی: ولیس هو اسرائیل ابو موسیٰ هذا یمانی یحدث وهب بن منبه [۲]	من سکن البد وجفا والی حدیث کے راوی ابو موسیٰ اسرائیل ابو موسیٰ نہیں ہیں، بلکہ یہ راوی ابو موسیٰ یمانی ہیں جو وہب بن منبہ سے روایت کرتے ہیں۔

ابو موسیٰ اسرائیل بصری کی عدالت و ثقاہت پر امام احمد کے ایک بیان سے کچھ مخالفانہ زد پڑتی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان نے بعد میں ابو موسیٰ اسرائیل سے روایت کرنی ترک کردی تھی، کتاب العلل میں ہے :۔

حدثنی ابی قال، حدثنا یحییٰ بن سعید	یحییٰ بن سعید نے کہا ہے کہ میں نے ابو موسیٰ سے حدیث کا

[۱] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۲۵۲، [۲] کتاب العلل و معرفۃ الرجال ص ۳۹۶،

سماع کیا ہے، پھر یحیٰ نے بعد میں ان سے روایت ترک کر دی، یحیٰ کا بیان ہے کہ ابوموسیٰ نے کہا ہے کہ میں جس مجلس میں عبداللہ کے ساتھ بیٹھتا ہوں وہ میرے نزدیک ایک سال کے نیک عمل سے بھی زیادہ اہم اور معتبر ہے۔

عن الاعمش قال حدثنا عمرو بن مرة عن ابی عبیدة قال یحیی: سمعت اباموسی ثم ترکہ بعد، فقال: قال ابوموسی: لمقعدٌ کنتُ اقعدہ من عبداللہ اوثق فی نفسی من عمل سنة[1]

یحیٰ بن سعید القطان ابوموسیٰ اسرائیل کے تلامذہ میں سے ہیں جیسا کہ اس بیان میں خود انہوں نے اس کو کہا ہے، مگر امام احمد نے بعد میں ان سے روایت کر دینے کی کوئی وجہ نہیں بتائی ہے جس سے معلوم ہو کہ یحیٰ بن سعید نے ابوموسیٰ میں کیا کمی پائی، اس لیے ان کے ترک سے بھی ابوموسیٰ اسرائیل کی عدالت و ثقاہت پر حرف نہیں آتا، جب جرحِ مبہم غیر معتبر ہے تو ترکِ روایت کا کیا اعتبار ہوگا؟

ابوموسیٰ اسرائیل کی ثقاہت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ائمۂ حدیث نے اپنی کتابوں میں ان سے روایت کی ہے، امام بخاری نے صحیح بخاری میں ان کی ایک روایت چار مختلف مقامات پر بیان کی ہے، علماء نے اسے بڑی اہمیت دی ہے، چنانچہ حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی نے اس وصف کو خصوصیت سے بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

سفیان بن عیینہ اور حسین جعفی نے ابوموسیٰ اسرائیل سے مکہ میں اس حدیث کا سماع کیا جو مناقب حسن، اصلاح، فتن اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے وصف میں ہے اس ایک حدیث کو امام بخاری نے ان مذکورہ ابواب میں ذکر کیا۔

روی عنہ ابن عیینة وحسین الجعفی، سماعاً منہ فی مناقب الحسن والاصلاح والفتن وصفة النبی صلی اللہ علیہ وسلم، وھو حدیث واحد کررہ البخاری فی ھذہ الابواب[2]

اسی طرح سننِ ترمذی، سننِ ابی داؤد، سننِ نسائی، اور مسندِ بزار میں ان سے روایت

[1] کتاب العلل ومعرفة الرجال ص ۷۱ [2] کتاب الجمع بین رجال الصحیحین ج ۱ ص ۲۳۔

موجود ہے [1]

امام حسن بصری کے دونوں تلامذہ ابوموسیٰ اسرائیل کی حق گوئی اور بے باکی

ابوموسیٰ اسرائیل، اور ربیع بن صبیح بصری اپنے شیخ کی زندگی کے ترجمان تھے اور علمی و دینی زندگی کے ساتھ اجتماعی اور سیاسی زندگی بھی بسر کرتے تھے، امام حسن بصریؒ مشاجرات و قضایا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفداروں میں سے تھے، اور نہایت دیانتداری سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برحق جانتے تھے، ابوموسیٰ اسرائیل بھی ان معاملات میں اپنے شیخ کے ہم خیال تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب الصلح میں حضرت معاویہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما کی صلح کے سلسلے میں ان کی روایت سے ان کے شیخ کے واسطہ سے جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس سے ان کا رجحانِ طبع بخوبی معلوم ہوتا ہے، یہاں یہ واقعہ بیان کر دینا برمحل ہے۔ صحیح بخاری کتاب الصلح میں باب قول النبی صلے اللہ علیہ وسلم للحسن بن علی ابن ھذا سیدٌ ولعلّ اللہ أن یصلح بہ بین فئتین عظیمتین وھو قولہ فاصلحوا بینھما کے ماتحت ہے کہ ابوموسیٰ سے مروی ہے کہ میں نے حسن بصری کو بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ خدا کی قسم حضرت حسن بن علی رضؓ نے معاویہ رضؓ پر پہاڑوں کے مانند افواج سے چڑھائی کی، تو عمرو بن عاص رضؓ نے کہا کہ میں ایسی فوجیں دیکھ رہا ہوں کہ جو اپنے بالمقابل پہاڑوں کو قتل کئے بغیر پیچھے نہیں ہٹ سکتی ہیں، یہ سن کر معاویہ رضؓ نے کہا اے عمرو! خدا کی قسم تم دو آدمیوں کا انتخاب کرو، اگر یہ، یہ، یہ مارے گئے تو میرا کون آدمی لوگوں کے معاملات کا ذمہ دار ہوگا، میرا کون آدمی لوگوں کی عورتوں کا ذمہ دار ہوگا، میرا کون آدمی لوگوں کے املاک کا ذمہ دار ہوگا، اس کے بعد معاویہ رضؓ نے بنی عبد شمس کے دو قریشی آدمی عبد الرحمٰن بن سمرہ اور عبد اللہ بن عامر بن کریز حسن رضؓ کے پاس یہ کہہ کر بھیجے کہ تم دونوں ان کے پاس جا کر معاملہ پیش کرو اور ان سے بات چیت کرکے اپنا مطالبہ پیش کرو، چنانچہ ان دونوں حضرات

---

[1] فتح الباری ج ۱۳ ص ۵۶

نے فوراً حضرت حسنؓ کے پاس آکر اپنا مقصد بیان کیا تو ان سے حضرت حسنؓ نے کہا کہ ہم
بنو عبد المطلب نے اس مال سے اپنا حصہ پا یا، اور یہ امت اپنے خون کے بارے میں
سرکشی کر رہی ہے، یہ سن کر دونوں حضرات نے کہا کہ وہ (حضرت معاویہؓ) آپ کے سامنے
یہ یہ باتیں پیش کر کے فلاں فلاں بات کا مطالبہ کرتے ہیں، حسنؓ نے کہا کہ اس کا ذمہ دار
کون ہے، انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے لیے ان کی طرف سے ذمہ دار بنتے ہیں، اس کے بعد
حسنؓ نے جوابی سوال کیا، انہوں نے ذمہ داری لی، اس طرح حضرت حسنؓ نے حضرت
معاویہؓ سے صلح کرلی یہ واقعہ بیان کر کے امام حسن بصری نے کہا کہ میں نے حضرت ابوبکرہؓ
سے سنا ہے، وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو منبر پر اس حال میں دیکھا
ہے کہ حسن بن علیؓ آپ کے پہلو میں بیٹھے تھے، کبھی آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی
حضرت حسن پر توجہ فرماتے، اور کہتے تھے کہ میرا یہ بچہ سردار ہے اور ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ
اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے[1]

امام ابو موسیٰ اسرائیل عباسی عمّال و حکام پر نہایت بے باکانہ تنقید کیا کرتے تھے، اور
حق گوئی میں کسی طاقت کی پروا نہیں کرتے تھے، بسا اوقات یہ بے باکی و حق گوئی دوستوں
اور خیر خواہوں کو ان کی طرف سے تشویش میں ڈال دیتی تھی، چنانچہ آپ کے تلمیذ رشید
سفیان بن عیینہؒ کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ کوفہ میں ابو موسیٰ اسرائیل سے ملاقات
کی، وہ قاضی ابن شبرمہ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے کوفہ کے امیر عیسیٰ بن موسیٰ کے یہاں
لے چلو، میں اس سے پند و نصیحت کی باتیں کروں گا، قاضی ابن شبرمہ کو خطرہ محسوس ہوا،
اس لیے ان کو لے کر امیر کوفہ کے یہاں نہیں گئے۔ ابو موسیٰ اسرائیل کو جب اپنے مقصد
میں ناکامی معلوم ہوئی تو قاضی ابن شبرمہ ہی کو حضرت حسن بصری والی وہ روایت
سناد ی جس میں حضرت حسنؓ کی حضرت معاویہؓ پر فتح کشی کرنے اور معاویہؓ کے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلح۔

صلح کرنے کا واقعہ ہے۔

قاضی ابن شبرمہ کو معلوم تھا کہ ابو موسیٰ اسرائیل اعلانِ حق سے چوکنے والے نہیں ہیں، وہ نہایت تندو تیز لہجہ میں بات کریں گے اور امیر کوفہ جوانی اور حکومت کے نشہ میں ہے، اس لیے کہیں آپ کی شان میں گستاخی نہ کر بیٹھے، اس موقع پر حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

ولعل سبب خوفه عليه انه كان صادعًا بالحق فخشي انه لايتلطف بعيسى فيبطش به لما عنده من غرة الشباب وغرة الملك[1]

قاضی ابن شبرمہ کے ابو موسیٰ اسرائیل کے بارے میں خوف کرنے کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ کھل کر حق بات کہتے تھے، اس لیے ابن شبرمہ ڈرے کہ وہ نرمی نہیں کریں گے تو عیسیٰ آپ پر سختی کرے گا کیونکہ اس کے پاس جوانی اور حکومت کا نشہ ہے۔

امیر کوفہ عیسیٰ بن موسیٰ، خلیفہ ابو جعفر منصور کا بھتیجا تھا، یہ زمانہ مہدی ۱۶۸ھ میں فوت ہوا، اور قاضی عبد اللہ بن شبرمہ ابو جعفر منصور کے دورِ خلافت میں کوفہ کے قاضی تھے اور اسی کی خلافت میں ۱۴۴ھ میں فوت ہوئے، قاضی ابن شبرمہ بہت بڑے عالم و فقیہ اور متقی و ثقہ بزرگ تھے۔

زہد و تقویٰ

امام ابو موسیٰ اسرائیل خیر القرون میں تھے جس میں زہد و تقویٰ اور خشیت و روحانیت کی اتنی فراوانی تھی کہ اس دور کے بہت سے اشرار ہمارے زمانہ کے بہت سے اخیار سے بہتر ہوا کرتے تھے، اور اس زمانہ کا ہر عالم زہد و تقویٰ میں یکتا ہوتا تھا، ابو موسیٰ اسرائیل بھی ان ہی قدوسیوں کی بزم کے ایک فرد تھے انکے روحانی مقام و مرتبہ کا اندازہ ان کے ایک مقولہ سے ہو سکتا ہے، کتاب العلل ومعرفة الرجال میں امام احمد بن حنبل نے لکھا ہے:۔

قَالَ ابو موسى لمقعدُ كُنتُ

ابو موسیٰ کا قول ہے کہ عبد اللہ کی ایک مجلس جس میں

---

[1] فتح الباری ج ۱۳ ص ۵۲

اقعد لا من عبد الله اوثق فی نفسی من عمل سنۃ[1] — ان کے ساتھ بیٹھنا تھا میرے نزدیک ایک سال کے عمل سے زیادہ معتبر و معتمد ہے،

عبد اللہ سے مراد غالباً حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ کی ذاتِ گرامی ہے، جو علم و عمل اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے امت کے لیے اسوۂ حسنہ تھی۔

امام ابو موسیٰ اسرائیل بصری کا ہندوستان سے تجارتی اور علمی تعلق

تقریباً سب ہی تذکرہ نویسوں نے امام ابو موسیٰ اسرائیل کے ہندوستان سے تعلق کی تصریح کی ہے، اور ان کے یہاں پر آنے جانے اور رہنے کو بیان کیا ہے، امام بخاریؒ لکھتے ہیں:۔

اسرائیل ابو موسیٰ، وکان نزل الهند[2] — اسرائیل ابو موسیٰ، ہندوستان آئے تھے۔

امام ابن ابی حاتم رازیؒ لکھتے ہیں:۔

اسرائیل بن موسیٰ کان ینزل الهند[3] — اسرائیل بن موسیٰ ہندوستان آیا کرتے تھے

حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسیؒ لکھتے ہیں:۔

اسرائیل بن موسیٰ ابو موسیٰ البصری نزل الهند[4] — اسرائیل بن موسیٰ ابو موسیٰ، ہندوستان آئے تھے

خزرجی لکھتے ہیں:۔

اسرائیل بن موسیٰ البصری نزیل الهند[5] — اسرائیل بن موسیٰ بصری مقیم ہندوستان۔

حافظ ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں:۔

اسرائیل بن موسیٰ ابو موسیٰ البصری نزیل الهند[6] — اسرائیل بن موسیٰ ابو موسیٰ بصری مقیم ہندوستان

اور تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں:۔

اسرائیل بن موسیٰ ابو موسیٰ البصری نزل الهند[7] — اسرائیل بن موسیٰ ابو موسیٰ بصری، ہندوستان آئے تھے؛

---

[1] کتاب العلل و معرفۃ الرجال ص۱۷۰ [2] تاریخ کبیر جلد اول قسم دوم ص۵۶ [3] کتاب الجرح والتعدیل جلد اول قسم اول ص۳۲۹، [4] کتاب الجمع بین رجال الصحیحین ج ۱ ص۲۳، [5] خلاصۃ تہذیب الکمال ص۳۱ [6] تہذیب التہذیب ج ۱ ص۲۶۱ [7] تقریب التہذیب ص۳۲

علامہ سمعانی کتاب الانساب میں لکھتے ہیں۔

ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ الهندی بصری کان ینزل الهند فنسب الیها۔[1]

ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ ہندی بصرہ کے رہنے والے ہیں، ہندوستان آیا کرتے تھے، اس لیے اس کی طرف منسوب کیے گئے۔

ان تمام تصریحات میں (۱) نزل الهند (۲) کان نزل الهند (۳) کان ینزل الهند (۴) اور نزیل الهند ہے اور ان سب عبارتوں کا مفہوم قریب قریب ایک ہی ہے یعنی یہ کہ امام ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری ہندوستان سے تعلق رکھتے تھے، یہاں آتے جاتے تھے اور اقامت بھی کرتے تھے، البتہ امام ذہبیؒ نے میزان الاعتدال میں ان کو "نزیل السند" لکھا ہے اور ان کا تعلق ہند کے بجائے سندھ سے بتایا ہے۔

اسرائیل بن موسیٰ ابو موسیٰ البصری نزیل السند۔[2]

اسرائیل بن موسیٰ ابو موسیٰ بصری، مقیم سندھ،

ہمارے خیال میں امام ذہبی کا ابو موسیٰ اسرائیل بصری کو نزیل سندھ بتانا عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کی اس قدیم اصطلاح کی رو سے ہے جس میں وہ ملک سندھ کو حدود مکران سے لے کر بھروچ اور کھمبائت تک مانتے تھے، اور اس میں ہند بھی داخل تھا۔

حافظ ابن حجر اور حافظ عینی کی تصریحات

بہر حال مذکورہ بالا تمام اقوال اگرچہ ابو موسیٰ اسرائیل کے ہندوستان سے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں، مگر ان سے اس تعلق کی نوعیت ظاہر نہیں ہوتی، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ ان کا یہ سفر و تعلق تجارتی تھا، وہ بسلسلۂ تجارت ہندوستان آتے جاتے تھے، اور انہوں نے یہاں ایک مدت تک اقامت بھی اختیار کی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

وهو بصری کان یسافر فی التجارۃ الی الهند

وہ بصری ہیں، تجارتی سلسلہ میں ہندوستان کا سفر کیا کرتے تھے، اور انہوں نے وہاں ایک زمانہ

[1] کتاب الانساب ورق ۵۹۳، [2] میزان الاعتدال للامام الذہبی

واقام بھا مدة[1] تک اقامت اختیار کی،

علامہ عینیؒ نے بھی شرح بخاری میں یہی لکھا ہے:۔

واسرائیل ھو ابن موسیٰ، وکنیتہ ابوموسیٰ وھو ممن وافقت کنیتہ اسم ابیہ، وھو بصری کان یسافر فی التجارۃ الی الھند، واقام بھا مدۃ[2]

اسرائیل بن ابو موسیٰ کی کنیت ابو موسیٰ ہے، یہان لوگوں میں سے ہیں، جن کی کنیت ان کے باپ کے نام کے موافق ہے، اسرائیل بصرہ کے رہنے والے تھے سلسلۂ تجارت ہندوستان کا سفر کیا کرتے تھے، اور ایک مدت تک وہا مقیم بھی رہے۔

ہندوستان میں حدیث کا درس

ان دونوں بیانات سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوموسیٰ اسرائیل دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں تجارت کے لیے ہندوستان آتے تھے، اور ایک مدت تک ان کا یہاں قیام رہا، ظاہر ہے کہ انہوں نے یہاں آتے جاتے یا زمانۂ اقامت میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھا ہوگا، اور اس امام کی تمام سرگرمی صرف تجارت ہی تک محدود نہیں رہی ہوگی بلکہ انہوں نے یہاں علم دین کی اشاعت بھی کی ہوگی، اس زمانہ میں سندھ اور ہندوستان کے ساحلی علاقے اسلام اور مسلمانوں کی برکت سے بہرہ یاب تھے، اور یہاں احادیث کی روایت جاری تھی، نیز ہمارے اسلاف کا مشغلہ رہا ہے کہ وہ تجارتی اسفار میں بھی مذہبی اور علمی خدمات بھی انجام دیتے تھے، اور بڑے بڑے علماء و محدثین اور اہلِ علم و فضل غیر ملکی تجارت اور سفر کے ذریعے دین کا کام کرتے تھے، ابن ابی حاتم رازی نے اپنے شیخ محدث ابراہیم بن مالک بزاز بغدادی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ وہ صلحاء میں سے تھے، کھجوروں کے چھوٹے چھوٹے پودے لگاتے تھے، اور جب ایک پودا لگا لیتے تو ایک ختم قرآن پڑھتے تھے، اور اسی کے ساتھ وہ یہ کرتے تھے کہ:۔

وکان حمل النخیل من السند[3]

وہ سندھ سے کھجور کے پودے لے جایا کرتے تھے،

[1] فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۵۔ [2] عینی شرح بخاری ج ۹ ص ۲۰۷۔ [3] کتاب الجرح والتعدیل ج ۱ ق ۱ ص ۱۰۱۔

اسی طرح محدث ابو محمد یعقوب بن صالح سیرانی متوفی ۳۲۲ھ ایران اور ہندوستان کے سوداگران کے دلال اور ایجنٹ تھے، علامہ ابن جوزی کا بیان ہے:۔

کان یبیع لاھل فارس و تجار الھند امتعتھم[1]۔	وہ ایرانی اور ہندوستانی تاجروں کے تجارتی سامان فروخت کیا کرتے تھے۔

بہت سے محدثین اور علمائے اسلام نے تجارت کے بہانے علمی اور دینی اسفار کا سلسلہ ہندوستان سے گزر کر چین تک پھیلا رکھا تھا، چنانچہ محدث ابراہیم بن اسحاق صینی (چینی) کوفہ کے رہنے والے تھے اور چین تک تجارتی سفر کرتے تھے اسی بنا پر صینی یعنی چینی کی نسبت سے مشہور ہوئے[2]۔

مشہور محدث ابوالحسن سعد الخیر بن محمد بن سہل اندلس کے رہنے والے تھے، انہوں نے بھی چین کا سفر کیا، اور وہ اپنے کو صینی (چینی) اس لیے لکھتے تھے کہ انہوں نے مغرب سے چین کا سفر کیا تھا[3]۔

ان علمائے اسلام نے سفر اور تجارت کے ذریعے دنیا میں گھوم گھوم کر علم دین کی تبلیغ و تدریس کی خدمت انجام دی، اور اپنے خریداروں کو صرف متاعِ دنیا نہیں دی بلکہ ان کے دامن دل و دماغ کو علمِ دین کی متاعِ گراں مایہ سے بھر دیا، ان ہی میں حضرت ابو موسیٰ اسرائیل بھی تھے، جنہوں نے تجارت کے بہانے ہندوستان کو بہت کچھ دیا،

امام ابو موسیٰ اسرائیل بصری ہندی کے حالات فی الحال جس قدر مل سکے یہی ہیں، افسوس کہ ان کی ولادت اور وفات کے سنین تک کتابوں میں نہ مل سکے، اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کہاں فوت ہوئے، حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں ان کے رواۃِ حدیث کے طبقہ سادسہ میں ہونے کی تصریح کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی وفات دوسری صدی ہجری میں نصف آخر میں ہوئی ہوگی کیونکہ عام طور سے اس طبقہ کے رجال

---

[1] المنتظم ج ۶ ص ۲۷۵، [2] معجم البلدان ج ۵ ص ۴۰۷، [3] ج ۵ ص ۴۰۸

کی وفات اسی زمانہ میں واقع ہوئی ہے، ان کے ہمعصر امام ربیع بن صبیح بصری ہندی کا وصال ۱۶۰ھ میں ہوا، وہ بھی اسی کے قریب فوت ہوئے ہوں گے۔

امام ابو موسیٰ اسرائیل بصری کے معاصر ہندی علماء و محدثین اور دوسرے افراد

امام ابو موسیٰ اسرائیل جس زمانہ میں ہندوستان آتے جاتے اور یہاں اقامت اختیار کرتے تھے، یہاں کے بہت سے علماء اور ارباب اقتدار و سیاست آپ کے معاصر تھے، نیز ہندوستان کے علاوہ کوفہ اور بصرہ وغیرہ میں ہزاروں ہندوستانی عوام و خواص تجار علماء اور ارباب جاہ و منصب موجود تھے، بصرہ اور اس کے اطراف میں ہندوستان کے جاٹوں کی بہت بڑی آبادی تھی، اور انہوں نے ان اطراف میں بڑا زور پکڑ لیا تھا اور اس زمانہ میں مسلمان فاتح و تاجر ہندوستان کے ساحلی مقامات پر آباد تھے، اور ہند و عرب کے تعلقات ہر وقت تازہ رہا کرتے تھے۔

ہندوستان کے یہ علماء محدثین امام ابو موسیٰ اسرائیل کے معاصر تھے۔

ابو معشر نجیح بن عبد الرحمٰن سندھی مدنی، صاحب المغازی والمفسر

ابو معشر یحیٰ سندھی مولیٰ ام ہاشم

نصر بن سندھی بن شاہک، مولیٰ ابو جعفر منصور اخباری و محدث

عبد الرحیم بن حماد سندھی بصری تلمیذ امام اعمشؒ

سندی بن شماس بصری، تلمیذ عطاء بن سیرینؒ

عبد الرحمٰن بن سندھی، عراک بن خالد بن زید دمشقی سے روایت کی ہے۔

سندی ابو بکر خواتیمی، امام احمد بن حنبل کے استاذ تھے۔

شعراء، ادباء اور اہل فن یہ ہندوستانی افراد تھے۔

سندھی بن علی الوراق بغدادی، ادیب و مغنی اور وراق (کتب فروش)

سندھی بن صدقہ، شاعر و کاتب،

ابو الصلح سندھی، شاعر

ابراہیم بن سندی بن شاہک، خطیب و ادیب اور فلسفی و شاعر

ابو العطا، سندھی، مشہور حماسی شاعر۔

محمد بن سندھی مکی، شاعر و مغنی۔

خلافت عباسیہ کے کلیدی عہدوں پر فائز اور سیاسی معاملات پر اثر انداز ہندوستان کے یہ لوگ تھے۔

سندھی بن شاہک، اس کا نام محمد ہے، ابو جعفر منصور کا آزاد کردہ غلام، اور عباسی خلافت میں بڑا دخیل تھا، ابو طوطہ ابراہیم بن عبد السلام سندھی بغدادی، سندی بن شاہک کا بھتیجا اور خلافت کے اہم منصب کا مالک تھا، ابراہیم بن عبد اللہ سندھی، یہ بھی سندی بن شاہک کا بھتیجا اور سرکاری افسر تھا۔

ابو حارثہ ہندی، مہدی کے زمانہ میں خلافت کے خزانہ کا کلید بردار اور مالیات کا بڑا ماہر تھا۔

سماق زطی بصری، یہ جاٹ نسل سے تھا اور بصرہ میں آباد ہندوستانی مسلمانوں کا سربراہ تھا۔[1]

امام ابو موسیٰ اسرائیل بصری ہندی کی بعض مرویات

جیسا کہ پہلے معلوم ہوا امام موسیٰ اسرائیل کی روایات و احادیث، صحیح بخاری، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی کی سنن اور مسند بزار وغیرہ میں موجود ہیں، اور ان کی ایک روایت جو حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے فضائل و مناقب میں ہے صحیح بخاری میں چار ابواب میں مختلف طرق و الفاظ سے مروی ہے۔

بخاری کی کتاب الصلح میں یوں ہے۔

[1] یہ سب نام رجال السند والہند کے مختلف مقامات سے لیے گئے ہیں انکے حالات کتاب مذکور میں موجود ہیں

(۱) حدثنا عبد اللہ بن محمد، ثنا سفیان عن ابی موسیٰ قال سمعت الحسن یقول استقبل واللہ۔ الحسن بن علی الخ...... قال الحسن ولقد سمعتُ ابا بکرۃ یقول رأیتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المنبر والحسن بن علی الیٰ جنبہ، وھو یقبل علی الناس مرۃً وعلیہ اُخریٰ، ویقول ان ابنی ھذا سیدٌ ولعل اللہ ان یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین قال ابو عبد اللہ قال لی علی بن عبد اللہ إنما ثبت عندنا سماع الحسن من ابی بکرۃ بھٰذا الحدیث۔

سفیان بن عُیینہ نے ابو موسیٰ اسرائیل سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حسن بصری کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت حسن بن علی فوج لے کر نکلے (اسکے بعد پورا واقعہ بیان کیا) حسن بصری کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابوبکرہ سے سنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو منبر پر اس حال میں دیکھا ہے کہ حضرت حسن آپ کے پہلو میں تھے، اور آپ کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی حسن کی طرف توجہ فرماتے، اور فرماتے کہ یہ میرا بیٹا سردار ہے، اللہ تعالےٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا، مدینی نے کہا ہے کہ ہمارے نزدیک حسن بصری کا حضرت ابوبکرہ سے سماع کا ثبوت اسی حدیث سے ہے

(۲) مناقب الحسن والحسین" یوں روایت ہے۔

حدثنا صدقۃ، انا ابن عُیینۃ، ثنا ابو موسیٰ عن الحسن انہ سمع ابا بکرۃ الخ

سفیان بن عیینہ نے خبر دی ہے کہ ہم سے ابو موسیٰ اسرائیل نے حسن بصری سے روایت کی کہ انہوں نے حضرت ابوبکرہ سے سنا (پھر یہی حدیث بیان کی)

(۳) کتاب الفتن، باب قول النبی للحسن بن علی ان ابنی ھذا سیدٌ الخ میں یوں ہے۔

حدثنا علی بن عبد اللہ، قال حدثنا سفیان، قال حدثنا اسرائیل

سفیان بن عُیینہ نے کہا کہ ہم سے اسرائیل ابو موسیٰ نے حدیث بیان کی جب کہ میں نے ان سے کوفہ

ابوموسیٰ، ولقیتہ الخ — میں ملاقات کی تھی (اس کے بعد مذکورہ بالا حدیث بیان کی)۔

(۴)، باب علامات النبوۃ میں یوں ہے :۔

حدثنا عبد اللہ بن محمد، حدثنا یحییٰ بن آدم — حسین جعفی نے ابوموسیٰ اسرائیل سے روایت کی ہے

حدثنا حسین الجعفی عن ابی موسیٰ عن — انہوں نے حسن بصری سے، انہوں نے ابوبکرہؓ

الحسن عن ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ الخ — رضی اللہ عنہ سے الخ

امام بخاری نے اوپر کے تین ابواب میں یہ حدیث سفیان بن عُیینہؒ سے روایت کی، مگر چوتھے باب علامات النبوۃ میں حسین جعفی سے روایت کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کو ابوموسیٰ اسرائیل سے سفیان اور حسین دونوں حضرات نے روایت کیا، مگر امام بزار نے اپنی مسند میں یہ حدیث سفیان بن عیینہ سے اس سند کے ساتھ روایت کی ہے : عن خلف بن خلیفۃ عن سفیان بن عُیَینہ پھر لکھا ہے :۔

لا نعلم رواہ عن اسرائیل — ہمارے علم میں اسرائیل سے اس کی روایت
غیر سفیان۔ — صرف سفیان نے کی ہے۔

مغلطائی نے بزار کا تعاقب کرتے ہوئے ان کے قول کو رد کیا ہے اور دلیل دی ہے کہ امام بخاری نے ابوموسیٰ اسرائیل کی یہی حدیث باب علامات النبوۃ میں حسین بن علی جعفی سے روایت کی ہے، اس لیے یہ بھی اس کے راوی ہیں، حافظ ابن حجر نے بزار پر مغلطائی کا تعاقب نقل کر کے لکھا ہے کہ وھو تعقبٌ جیدٌ البتہ حسین جعفی کی روایت میں اسرائیل کے قاضی ابن شبرمہ کے پاس جانے کا واقعہ نہیں ہے بلکہ صرف حدیث مرفوع کے الفاظ ہی ہیں[۱]

حضرت حسنؓ کے فضائل میں ابوموسیٰ اسرائیل کی ایک اور حدیث امام ذہبیؒ نے

---

[۱] فتح الباری ج ۱۳ ص ۵۶

میزان الاعتدال میں اپنی سند سے بیان کی ہے اور سفیان بن عیینہ کے واسطہ سے یوں روایت ہے :-

عن ابی موسیٰ یعنی اسرائیل عن ابی حازم عن ابی هریرة رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یمص لعاب الحسن والحسین کما یمص الرجل التمرة، ھذا احدیث غریب جداً[1]

ابو موسیٰ اسرائیل نے ابو حازم سے انہوں نے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ میں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ حضرات حسن اور حسین کے لعابِ دہن کو چوستے تھے جس طرح آدمی کھجور کو چوستا ہے، یہ حدیث بہت ہی غریب ہے

حضراتِ محدثین کی اصطلاح میں غریب اس حدیث کو کہتے ہیں جسے صرف ایک عادل وضابط راوی نے روایت کیا ہو، اور اگر اسے ایسے دو یا تین راویوں نے روایت کیا ہو تو اسے عزیز کہتے ہیں اور ایسی ایک جماعت نے روایت کیا ہو تو اسے مشہور کہتے ہیں

[1] میزان الاعتدال ج ا ص۹۷، ایک قلمی نسخہ میں التمرۃ کے بجائے الثمرۃ ہے۔

(۷)

ہند و عرب کے قدیم سیاسی و ثقافتی تعلقات

شروع شعبان ۱۳۷۹ھ (فروری ۱۹۶۰ء) میں ایک علم دوست عرب صحافی کے ذریعہ سے پانچویں صدی کے ایک عالم و مورخ قاضی رشید بن زبیر کی کتاب الذخائر والتحف ہاتھ لگی، جسے دولتِ کویت کے دائرۃ النشر والمطبوعات نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے، عجب کیا ہے کہ جو نسخہ ہمارے پیش نظر ہے وہ ہندوستان میں اس کتاب کا پہلا نسخہ ہو، اس کتاب کو محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب حیدر آبادی فرنساوی کی تصحیح و ترتیب کا شرف حاصل ہے، اور اس کے مقدمہ نگار ڈاکٹر صلاح الدین المنجد ہیں، یہ کتاب شروع کے ۵۲ صفحات کے علاوہ جن میں مقدمات وغیرہ شامل ہیں بڑے سائز کے ۳۶۸ صفحات پر مشتمل ہے، ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے مقدمہ میں قاضی رشید بن زبیر کے حالات تحریر کئے ہیں، چونکہ ڈاکٹر صاحب کو ان کا مفصل حال کہیں نہیں مل سکا اس لئے کتاب الذخائر والتحف ہی کے مختلف مقامات سے مصنف کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے، جو نہایت مختصر اور نامکمل ہے، چند دن ہوئے راقم الحروف کی ملاقات پروفیسر مولانا عبد العزیز یمنی راجکوٹی سے ہوئی تھی، اس ملاقات میں اس کتاب اور اس کے مصنف کا تذکرہ آیا تو موصوف نے فرمایا کہ قاضی رشید بن زبیر کے مفصل حالات کتابوں میں موجود ہیں، اور اس کے علاوہ ان کی اور بھی کئی تصنیفات ہیں، کتاب الذخائر والتحف کا صرف ایک قلمی نسخہ ترکی میں افیون قرہ حصار کے کتب خانہ میں موجود تھا، جس میں اصل کتاب کے ساتھ

امیر شہاب الدین احمد بن عبداللہ بن حسن اوحدی مصری شافعی متوفی ۸۱۱ھ کے مختارات وزیادات بھی شامل ہیں، اصل کتاب کا قلمی نسخہ صرف ۵۰ اوراق میں ہے۔

اس کتاب میں مسلمانوں کے اقوام عالم سے سیاسی، علمی، اور تہذیبی وثقافتی تعلقات، مکاتیب ورسائل، مواثیق ومعاہدات، ان کی تقریبات واجتماعات، دعوت ولیمۂ ختنہ، زفاف، ختم قرآن، اور دوسری رسموں کی دعوتوں، کھانوں کی قسمیں، اور ذاتی املاک، قومی اور سرکاری مالیات، تحفے، ہدایا، ترکے، دفینے اور خزانے تفصیل سے مذکور ہیں، ساتھ ہی بہت سے تمدنی وثقافتی الفاظ ومحاورات، اصطلاحات، چیزوں کے نام، اور ان کے استعمال کے طریقوں کا بیان ہے، نیز معرب اور دخیل الفاظ کا ایک خزانہ اس کتاب میں موجود ہے۔

قاضی رشید بن زبیر کے تعلقات مسلم حکمرانوں سے تھے، اور بعض کے یہاں اچھے منصب پر فائز تھے اس لیے انہوں نے اس کتاب میں بہت سے چشم دید واقعات اور ثقہ راویوں کے زبانی بیانات درج کئے ہیں، اور شاہی کاغذات وتمسکات اور فرامین سے بھی استفادہ کیا ہے، اور اعداد وشمار میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے، پرانے واقعات اور اعداد وشمار میں قدماء کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے چنانچہ صفحہ ۱۶۶ پر واقدی متوفی ۲۰۷ھ کی کتاب اخبار فتوح بلد السند کے حوالے سے سندھ کا ایک واقعہ درج کیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ سندھ کی اسلامی تاریخ پر واقدی نے یہ کتاب لکھی تھی، حالانکہ ابن ندیم وغیرہ نے واقدی کی تصنیفات میں اس کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے، قاضی رشید کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ کتاب پانچویں صدی تک موجود تھی۔

اس طرح کتاب الذخائر والتحف قبل از اسلام سے لے کر ۴۶۱ھ تک کے خاص خاص واقعات وحالات کے لیے ایک نادر ونایاب دستاویز ہے جس میں عہد رسالت سے لے کر خلیفہ مستنصر باللہ تک مسلمانوں کے تمدنی، تہذیبی اور ثقافتی معاملات وقضایا

کی تفصیلات، اور ہزاروں صفحات میں بکھری ہوئی معلومات یکجا مل جاتی ہیں، اس مضمون میں ہم اسی نادر و موثق کتاب سے عرب و ہند کے درمیان قدیم دینی، علمی، اور ثقافتی تعلقات کے واقعات چن کر پیش کرتے ہیں، اس کتاب سے عرب و ہند کے درمیان قدیم تعلقات کے بہت سے مخفی گوشوں پر روشنی پڑتی ہے جن کا علم ہمیں پہلی بار ہوا ہے۔

حضرت معاویہ رضؓ کی خدمت میں شاہ چین کا خط اسلام فہمی کی درخواست اور علمی ہدیہ

قاضی رشید بن زبیر کتاب الذخائر والتحف میں لکھتے ہیں کہ چین کے بادشاہ نے حضرت معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے نام حسب ذیل مکتوب روانہ کیا:

"اس شہنشاہ کی طرف سے کہ ایک ہزار بادشاہوں کی بیٹیاں جس کی خادمہ ہیں، جس کا محل سونے کی اینٹوں سے بنایا گیا ہے، جس کے اصطبل میں ایک ہزار ہاتھی ہیں، جس کے ملک میں دو دریا عود اور کافور کو سیراب کرتے ہیں، جس کی خوشبو بیس میل دور سے پائی جاتی ہے، عرب کے بادشاہ کے نام جو اللہ کی عبادت کرتا ہے اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراتا، اس کے بعد معلوم ہو کہ میں آپ کی خدمت میں ہدیہ روانہ کر رہا ہوں، یہ ہدیہ نہیں بلکہ تحفہ ہے، آپ میرے پاس اپنے نبیؐ کے لائے ہوئے حرام و حلال کی تفصیل روانہ کیجئے اور کوئی ایسا آدمی بھیجئے جو اسے میرے سامنے بیان کرے، والسلام"

یہ ہدیہ اور تحفہ ایک کتاب کی شکل میں تھا جس میں اہلِ چین کے علمی اسرار و حِکَم کا بیان تھا، کہا جاتا ہے کہ بعد میں یہ کتاب خالد بن یزید بن معاویہ کے ہاتھ لگی جس سے وہ کیمیا گری کے بڑے بڑے کام لیتا تھا (صفحہ ۱۰)

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان سے گزر کر عرب اور چین کے علمی و دینی تعلقات حضرت معاویہ رضؓ کے زمانہ ہی میں استوار ہو گئے تھے اور علمی کتابوں اور دینی معلومات کے بارے میں افادہ و استفادہ شروع ہو گیا تھا مسلمانوں سے اس قسم کے تعلقات پیدا

کرنے کی تحریک اور خواہش خود بادشاہ چین کی طرف سے ہوئی، اور اس نے مسلمانوں کے خلیفہ کو مُوَحِّد اور خدا پرست کی صفت سے یاد کیا، اور خود اپنی صفات میں اس زمانہ کی رسم کے مطابق ذاتی اور خاندانی مَفَاخِر و محاسن کو شمار کرایا، اس خط سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ چینی زبان کی کتاب کا ترجمہ حضرت معاویہ کے زمانہ میں ہوا اور چین میں عربی زبان جاننے والا کوئی ماہر موجود تھا؛

حضرت معاویہؓ کی خدمت میں گیگان کے راجہ کا آئینۂ جہاں نما

واقدی نے اخبار فتوح بلد السند میں ذکر کیا ہے کہ سندھ میں معاویہ بن ابو سفیانؓ کے والی عبد اللہ بن سوّار عبدیؒ نے قیقان (گیگان علاقہ قلات) پر چڑھائی کی اور فتحیاب ہونے پر وہاں سے بہت سا مالِ غنیمت پایا۔ اور قیقان کے راجہ نے فدیہ ادا کر کے قیدیوں کو چھڑایا، نیز اس نے عبد اللہ بن سوّار عبدی کے پاس ہدیہ میں سندھ اور ہند کے ایسے ایسے عجائب اور عمدہ عمدہ سامان بھیجے کہ ان کی مثال دیکھنے میں نہیں آئی، ان ہی میں ایک آئینہ کا ٹکڑا تھا جس کے بارے میں اہلِ علم کہتے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد بہت زیادہ ہو کر زمین میں پھیل گئی تو اس کو اللہ تعالےٰ نے اتارا، حضرت آدم اس آئینہ میں جس اولاد کو دیکھنا چاہتے تھے وہ جس اچھے بُرے حال میں ہوتی دیکھ لیا کرتے تھے، اس کو عبد اللہ بن سوّار عبدی نے حضرت معاویہؓ کی خدمت میں روانہ کر دیا، جو ان کی زندگی تک ان کے پاس رہا اور جب بنو امیہ کا دور آیا تو ان کے خزانہ میں رہا، پھر بنو عباس کے دور میں ان کی ملکیت میں آگیا (صفحہ ۱۶۶ ، ۱۶۷)

حضرت عبد اللہ بن سوار عبدیؒ ۳۸ھ میں مکران کے والی بنائے گئے، پھر دوسری بار ۴۵ھ میں یہاں کے والی بنائے گئے، اس بار انہوں نے قیقان میں جہاد کر کے فتح پائی اور بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ آیا اس کے بعد حضرت معاویہؓ کی خدمت میں یہاں سے بہت ہدایا و تحائف لے کر گئے جن میں قیقان کے گھوڑے بھی تھے، غالباً اسی دوران میں

انھوں نے قیقان کے راجہ کا یہ ہدیہ بھی حضرت معاویہ کی خدمت میں پیش کیا، اس کے بعد ۴۲ھ میں حضرت عبداللہ بن سوار عبدی یہاں جہاد کے لیے آئے اور غزوہ قیقان میں دوسرے بہت سے مجاہدینِ اسلام کے ساتھ شہید ہو گئے۔

خلیفہ ہشام کی خدمت میں ہندوستان کے ایک راجہ کا طلسمی تحفہ

مدائنی نے ذکر کیا ہے کہ ہشام بن عبدالملک کے دورِ خلافت میں سندھ کے والی جنید بن عبدالرحمٰن مُرّی کے پاس ہندوستان کے ایک راجہ نے جواہر سے مرصّع ایک اونٹنی بھیجی، اس کے تھن میں موتی اور گردن میں یاقوتِ سرخ بھرے ہوئے تھے، یہ اونٹنی چاندی کی ایک گاڑی پر تھی، جب وہ زمین پر رکھ دی جاتی تھی تو خود بخود حرکت کرنے لگتی تھی، جنید نے یہ تحفہ ہشام کی خدمت میں بھیج دیا جسے اس نے بہت پسند کیا، جو آدمی اس کو لے کر آیا تھا اس نے اس کے تھن میں سوراخ کیا تو اس کے اندر کے تمام موتی سونے کے ایک ڈبے میں گر گئے، یہ ڈبہ بھی وہ آدمی اپنے ساتھ لایا تھا، اور جب اس کی گردن توڑی گئی تو خون کی طرح یاقوت سرخ نکلنے لگا، یہ تماشا دیکھ کر ہشام اور تمام حاضرینِ مجلس سخت متعجب ہوئے، یہ اونٹنی بنو امیہ کے خزانے میں رہی یہاں تک کہ جب بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی تو ان کے پاس پہنچی (صفحہ ۱۴ و ۱۵)

عہدِ خلیفہ منصور میں گندھار امیں تبع حمیری کے مینار کی دریافت

خلیفہ منصور عباسی کے عہد میں ۱۵۱ھ میں ہشام بن عمرو تغلبی نے ہندوستان پر حملہ کیا اور سندھ کو عبور کر کے قندھار (گندھارا ضلع بھڑوچ واقع گجرات) پر یلغار کی تو انھوں نے یہاں لوہے کا ایک بہت موٹا مینار پایا جو ایک ستر ہاتھ لمبا تھا، ہشام نے مقامی لوگوں سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ آبنائے فارس کی اس زمانہ کی تلواریں ہیں جب انہوں نے تبع حمیری کے ساتھ حملہ کر کے ہمارا ملک فتح کیا تھا، قندھار فتح کرنے کے بعد انھوں نے اپنی تلواریں اکٹھا کر کے توڑ ڈالی تھیں، ان ہی ٹوٹی ہوئی

تلواروں سے یہ مینار بنایا گیا ہے"۔ اہل یمن کا خیال ہے کہ تبع نے اسی موقع پر یہ شعر کہا تھا:

ولو نعرت بقندھار نعرۃ ؛ خرت صوامعھا وکل عمود (ص ۱۷۵، ۱۷۶)

خلیفہ ہارون رشید کی خدمت میں ایک ہندوستانی راجہ کے تحفے اور زمرد کی چھڑی کی کہانی

ہندوستان کے ایک راجہ نے خلیفہ ہارون رشید کے پاس بہت سے ہدایا و تحائف بھیجے تھے، ان میں زمرد کی ایک چھڑی ایک گز سے لمبی تھی، اس کے سرے پر یاقوتِ سرخ کی ایک چڑیا بنی ہوئی تھی، جو بے حد لطیف و نازک تھی، ہارون رشید نے یہ چھڑی اپنی زوجہ ام جعفر زبیدہ بنت جعفر کو دے دی جو وراثت میں منتقل ہو کر امین کے پاس آئی، پھر اسکے بھائی مامون کو ملی، اور ان دونوں کے بعد معتصم باللہ کے قبضہ میں آئی، ایک مرتبہ خلیفہ معتصم اپنی مجلس خاص میں ندیموں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، معتصم نے بات کرتے کرتے اپنے ہاتھ کی چھڑی ندیموں کے سامنے ڈال دی، اور پوچھا کہ تم لوگوں میں سے کیا کوئی اس چھڑی کو پہچانتا ہے؟ سب نے باری باری دیکھ کر اپنی لاعلمی ظاہر کی اور جب عبداللہ بن محمد المخلوع کی باری آئی تو اس نے کہا کہ امیر المومنین! اس چھڑی کو ہندوستان کے راجہ نے دوسرے ہدایا و تحائف کے ساتھ ہارون رشید کی خدمت میں بھیجا تھا، رشید نے اسے زبیدہ کو دیدیا تھا اور زبیدہ نے میرے والد کو اس وقت یہ چھڑی دی تھی جب وہ بچے تھے، اور وہ اس سے کھیلا کرتے تھے، اس کے سرے پر یاقوت سرخ کی ایک چڑیا بنی ہوئی تھی جس کی قیمت ایک لاکھ دینار تھی۔ وہ چڑیا مجھے نظر نہیں آرہی ہے، یہ سن کر معتصم نے اس کے تلاش کرنے کا حکم دیا، اور خزانہ کے محافظوں کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے وہ چڑیا فوراً حاضر نہ کی تو ان کو قتل کر دیا جائے گا، چنانچہ اسی وقت وہ چڑیا تلاش کی گئی، اور اس چھڑی کے سرے پر لگا کر معتصم کی خدمت میں پیش کی گئی (صفحہ ۲۰، ۲۱)

خلیفہ ہارون رشید کے خزانہ میں عود ہندی کی ایک ہزار ٹوکریاں

فضل بن ربیع کا بیان ہے کہ ۱۹۳ھ میں جب ہارون رشید کے بعد امین خلیفہ ہوا تو اس نے

سرکاری خزانوں کے جملہ سامانوں کو شمار کرنے کا حکم دیا میں نے خزانچیوں اور منشیوں کو بلا کر چار ماہ تک خزانوں کی چھان بین کی، اور ایک ایک چیز کی تعداد اور مقدار الگ الگ لکھوائی تو اس میں عود ہندی کی ایک ہزار ٹوکریاں بھی تھیں (صفحہ ۲۱۵)

خلیفہ مامون کی خدمت میں بنگال کے راجہ رہمی کا نیاز مندانہ خط اور گراں قدر تحائف و ہدایا	ہندوستان (بنگال) کے راجہ دہمی (رہمی) نے خلیفہ مامون کی خدمت

میں یہ خط اور اس کے ساتھ گراں قدر ہدیے اور تحفے بھیجے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہندوستان کے راجہ (دہمی رہمی) کی طرف سے جو مشرق کا زبردست حکمران ہے، اس کے پاس سونے کا محل، یاقوت کے ستون اور موتیوں کے فرش ہیں، اس کا محل ایسے تر و تازہ عود سے بنایا گیا ہے کہ جب اس پر مہر کی جاتی ہے تو وہ موم کی طرح نقش قبول کر لیتا ہے، اس کے محل کی خوشبو دس فرسنگ سے محسوس ہوتی ہے، اس کے خزانے میں جواہر کے ہزاروں تاج ہیں جو اس کے خاندان کے ہزاروں بادشاہوں کے ہیں، سب سے بڑے بت کا پجاری اس کے سامنے سجدہ کرتا ہے، اس بت کا وزن ایک لاکھ مثقال سونے کے برابر ہے، اور اس میں ایک ہزار یاقوت سرخ اور موتی جڑے ہوئے ہیں، اور جب وہ سعادت و برکت کے دن سوار ہو کر نکلتا ہے تو اس کے سر پر تاج اور اس کے جلوس میں ایک ہزار دستے ہوتے ہیں، جن کی سواری کا جانور موتیوں سے سجایا ہوتا ہے اور ہر سواری کے جلو میں ایک ہزار گھڑ سوار ہوتے ہیں جو ریشم اور سونے سے مرصع و مزین ہوتے ہیں، اس کے اصطبل میں ایک ہزار سفید ہاتھی ہیں جن کے چھلّے سونے کی رسیوں کے ہیں، وہ جواہر کی رکابیوں میں موتیوں کے دستر خوان پر کھانا کھاتا ہے، وہ اللہ سے شرم کرتا ہے کہ اللہ اسے رعایا کے

بارے میں خائن دیکھے، اور اس کو اہل مملکت پر امانت وریاست دینے کے بعد نا اہل پائیے۔

اس کے بعد اے بھائی! ہم بھی اس بات سے واقف ہیں کہ ہم نے اوپر اپنی جو توصیف و تعریف کی ہے، وہ زائل ہونے والی اور بے سود ہے اور ہمیں چاہیئے تھا کہ ہم اس خط کو اللہ تعالےٰ کے نام سے شروع کرتے مگر ہم عبادت اور دعا کے علاوہ اس کے ذکر سے کسی خط وغیرہ کی ابتداء کرنے کو بہت بڑی جسارت سمجھتے ہیں، اسی لیے ہم نے اس کے نام سے یہ خط شروع نہیں کیا، ہمارے پاس آپ کی علمی برتری کی خبریں آتی رہتی ہیں، آپ جیسے کسی دوسرے حکمران میں ہم نے یہ علمی فضیلت نہیں پائی، ہم بھی دوستی اور تعلقات میں آپ کے شریک ہیں، اور ہم نے اپنی طرف سے خط و کتابت اور استفادہ کا دروازہ اس طرح کھولا ہے کہ ایک کتاب کا ترجمہ بنام "صفوۃ الاذہان" آپ کی خدمت میں بھیج رہے ہیں اس کتاب کو دیکھ کر معلوم ہو جائے گا کہ اس کا یہ نام بالکل صحیح اور برمحل ہے، اس کے علاوہ اور بھی عمدہ عمدہ چیزیں جو ہم کو مناسب اور بہتر نظر آئیں آپ کی خدمت میں روانہ کی ہیں، یہ چیزیں اگرچہ آپ کے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے بہت معمولی ہیں مگر اے برادر! ان چیزوں کے قبول کرنے اور تقصیر کی معذرت قبول کرنے کے ہم امیدوار ہیں۔"

یہ خط کاذی نامی درخت کی چھال پر لکھا ہوا تھا، جو ہندوستان میں اگتا ہے، اس کی چھال کاغذ سے بہتر ہوتی ہے، اس کا رنگ زردی مائل ہوتا ہے، یہ خط لاجوردی رنگ کی روشنائی سے لکھا گیا تھا اور سونے کے پانی کے کام سے مزین تھا۔

راجہ نے اس خط کے ساتھ مامون کی خدمت میں جو تحفے تحائف بھیجے تھے، ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ یاقوت سرخ کا ایک جام جو ایک بالشت چوڑا، ایک انگل دبیز، اور موتیوں سے بھرا ہوا تھا، ہر موتی کا وزن ایک مثقال تھا اور کل موتیوں کی تعداد ایک سو تھی۔

۲۔ ایک فرش ایسے سانپ کے چمڑے کا جو وادیٔ مہراج میں پایا جاتا ہے، اور ہاتھی کو نگل جاتا ہے، اس فرش کی خاصیت یہ ہے کہ جو شخص اس پر بیٹھتا ہے اسے سِل کی بیماری کا ڈر نہیں رہتا، اور اگر سِل کا مریض سات دن تک اس پر بیٹھے تو اس کا مرض زائل ہو جاتا ہے۔

۳۔ چھینٹ کے کپڑے جن میں بہترین چھینٹ وہ تھی جس میں درہم کے برابر گول گول بوٹیاں تھیں، اور ان کے بیچ میں سفید زردوزی کا کام تھا جس میں موتی ٹکے ہوئے تھے۔

۴۔ تین مصلے، جن کے ساتھ گاؤ تکیے بھی تھے یہ گاؤ تکیے سمندل نامی چڑیا کے پر سے بنے ہوئے تھے، اسکے پر کی خصوصیت یہ ہے کہ آگ میں ڈالنے سے بھی وہ نہیں جلتے۔

۵۔ تازہ عود ایک لاکھ مثقال، جو اس قدر نرم تھی کہ جب اس پر مہر لگائی جاتی تھی تو اس پر مہر کا نشان پڑ جاتا تھا۔

۶۔ تینتیس سیر کافور کی ڈلیاں، ہر ڈلی پستہ کی وضع کی اور بادام سے بڑی تھی۔

۷۔ ایک سندھی نامی باندی جس کا قد سات ذراع کا تھا، جب وہ چلتی تھی تو سر کے بال زمین پر گھسٹتے تھے اور بڑی حسین وجمیل تھی۔ اس کے چار چوٹیاں تھیں، دو سر کے اوپر تاج کی طرح رہتی تھیں اور دو پیچھے کی جانب زمین تک لٹکتی تھیں، بھویں ایک انگل لمبی تھیں، دانتوں کی سپیدی سے گویا بجلی چمکتی تھی، (صفحہ ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵)

فاضل محقق نے اس خط میں ہر جگہ راجہ کا نام دھمی درج کیا ہے اور اس پر حاشیہ بھی لکھا ہے مگر اس کے بارے میں خود کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے حالانکہ دوسروں کی چند رائیں نقل کی ہیں، دراصل یہ دہمی "نہیں" رھمی" یا "رہمی" ہے جیسا کہ سلیمان تاجر، ابن خرداذبہ، اور مسعودی وغیرہ نے تصریح کی ہے، اور یہ راجہ بنگال کا تھا جیسا کہ

ان ہی سیاحوں اور مورخوں کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے، اور اس کا علاقہ وادی مہراج کے سانپ کے فرش کی وجہ سے سماترایا سندھی باندی کی وجہ سے سندھ بیان کرنا خلافِ تصریح اور بے محل ہے۔

بنگال کے راجہ رہمی کے نام خلیفہ مامون کا خط اور ہدایا و تحائف

راجہ رہمی کے اس خط اور اس کے ان تحفے تحائف کے جواب میں مامون نے بھی خط اور تحفے بھیجے، خط حسب ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

" امیر المومنین عبداللہ المامون کی طرف سے جس کی ذات کو اور جس کے آباء و اجداد کو اللہ تعالےٰ نے اس کے چچازاد بھائی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور کتاب اللہ کی تصدیق کرنے کی وجہ سے عزت و شرافت بخشی ہے، ہندوستان کے راجہ دھمی (رہمی) کے نام جو ہندوستان اور مشرق کے ماتحت راجوں میں سب سے بڑا ہے، تم پر امن و سلامتی ہو، میں تمہارے سامنے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہوں جو وحدہٗ لاشریک ہے، اور اللہ تعالےٰ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ اپنے بندے اور اپنے رسول محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر رحمت نازل فرمائے، تمہارا خط ملا جن نعمتوں کا تم نے تذکرہ کیا ہے میں ان سے بہت خوش ہوا، اور قبولیت کی جس نیت سے تم نے ہمیں ہدیہ و تحفہ بھیجا تھا اسی کے مطابق ہم نے اس کو قبول کیا، تم نے اچھی چیز کی ابتدا کی اس وجہ سے تم قابلِ تعریف ہو، اس کا شکر ادا کرنا اور اسے یاد رکھنا ہمارے لیے ضروری ہے، ہمارا طریقہ یہ ہے کہ جو شخص ہماری شریعت کو قبول نہیں کرتا اور اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہم اس کی تعظیم و تکریم کے لیے شرعی الفاظ و محاورات استعمال نہیں کرتے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم تمہاری تعظیم و تکریم

میں کمی نہ کرتے، اور یہ عذر کرنا بھی ہماری طرف سے تمہاری ایک قسم کی تعظیم ہے اور تم اس کے مستحق ہو، ہم تمہارے پاس اپنی محبت کا ہدیہ بھیج رہے ہیں۔ جو دو دوستوں کے درمیان سب سے بڑا تحفہ ہے، ہم تمہارے پاس ایک کتاب عربی زبان سے ترجمہ کرا کے بھیج رہے ہیں جس کا نام دیوان الالباب وبستان نوادر العقول ہے، اس ترجمہ کے مطالعہ کے بعد تم کو اس اہم نعمت کی قدر و قیمت معلوم ہو جائے گی۔ نیز معلوم ہوگا کہ یہ نام بالکل برمحل اور صحیح ہے، اور ہم نے محبت و تعلق کا سرنامہ عمدہ عمدہ چیزوں کا ہدیہ بنایا ہے، جو ہمارے نزدیک تمہاری شان سے کمتر درجہ کی ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ اگر سلاطین اپنی اپنی حیثیت کے مطابق آپس میں تحفہ و ہدیہ کا معاملہ کریں تو اس کے لئے ان کے خزانہ کافی نہیں ہوں گے، اس لیے یہ چیزیں ہدیہ میں اسی قدر ہوتی ہیں، جس سے باہمی تعلق اور جانبین کا حسن نیت ظاہر ہو جائے، اور اللہ ہی کی طرف سے توفیق ہے۔"

مامون کا یہ خط ایک لمبے صحیفہ میں دونوں جانب لکھا گیا تھا اور اس کا خط ایک انگل جلی تھا، اس خط کے ہمراہ جو ہدیہ بھیجا تھا اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ ایک گھوڑا مع شہسوار اور سامان سواری کے جو عقیق سے بنایا گیا تھا، ایک روایت کے مطابق گھوڑا اشہب شہری کا تھا۔

۲۔ سیاہ و سپید مونگے کا ایک خوان (کھانے کی چوکی) جس کی زمین سفید تھی، اور اس میں سیاہ، سرخ، اور سبز رنگ کی دھاریاں تھیں، یہ خوان تین بالشت چوڑا اور دو انگل موٹا تھا، اس کے پائے سونے کے تھے، یہ خوان ان نوادر میں سے تھا جو بنو عباس کو مروان بن محمد جعدی کے خزانے سے ملے تھے۔

۳۔ کپڑوں کی پانچ قسمیں (گانٹھیں) ہر قسم میں مندرجہ ذیل سو سو تھان تھے، مصر کے

سفید کپڑے، سوس کے ریشمی کپڑے، یمن اور سکندریہ کی چھینٹیں، ملحم خراسانی، دیباج خراسانی فرش قرمزی، فرش طبری، فرش سوسنجری، حیرہ کے ایک سو ریشمی گدے مع تکیوں کے، اور سوس کے ریشمی فرش۔

۴۔ فرعونی شیشہ کا ایک جام، جو ایک انگل دبیز، اور ڈیڑھ بالشت چوڑا تھا، اس کے وسط میں ایک شیر دانت نکالے ہوئے تھا، جس کے سامنے ایک آدمی گھٹنوں کے بل بیٹھا تیر کمان سے شیر کی طرف نشانہ لگائے ہوئے تھا، یہ جام بھی خوان کی طرح ان ہی چیزوں میں ملا تھا جو مروان بن محمد کے خزانے میں پائی گئی تھیں۔ (صفحہ ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸)

قاضی رشید بن زبیر نے آگے چل کر اس خوان اور جام کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ دونوں چیزیں مصر میں مروان بن محمد کے خزانے سے ملی تھیں، اور بنی عباس کے خزانے میں محفوظ تھیں، یہاں تک کہ خلیفہ مامون نے ان کو اور ان کے علاوہ دوسری چیزوں کو ہندوستان کے راجہ کے پاس ہدیۃً بھیج دیا، یہ خوان مشتری ستارہ کی شکل پر بنایا گیا تھا، اس کی خاصیت یہ تھی کہ جو شخص اس پر کھانا کھاتا تھا اس کی بھوک نہیں مرتی تھی (صفحہ ۱۷۹)

خلیفہ مامون اور بوران بنت حسن بن سہل کے زفاف کے موقع پر ہندوستان کے راجہ کا تحفہ

۲۱۰ھ میں خلیفہ مامون کے ساتھ بوران بنت حسن کی تقریب زفاف بڑی دھوم دھام سے منائی گئی، اس موقع پر ہندوستان کے راجہ نے حسن بن سہل کے پاس بہت سے قیمتی ہدایا روانہ کئے، جن میں بے مثال عود کی ایک لکڑی تھی۔

علی بن منجم کا بیان ہے کہ ایک رات ہم لوگ خلیفہ متوکل کے یہاں موجود تھے، ہمارے ساتھ حسن بن سہل کا لڑکا عبید اللہ بھی تھا، وہ ظریف الطبع آدمی تھا، علمی اور ادبی مجالس دیکھ چکا تھا اور دربار کی صحبت اٹھا چکا تھا، اس دن متوکل نے پچھنا لگوا کر خون نکلوایا تھا، جس سے اس کی نقاہت بہت بڑھ گئی تھی، اور اطبا نے عود کی دھونی لینے کا مشورہ دیا تھا، جب دھونی دی جانے لگی تو حاضرین مجلس نے کہا کہ واللہ ہم نے

آج تک اس عود جیسی خوشبو نہیں سونگھی تھی، یہ سن کر عبید اللہ بن حسن بن سہل نے کہا یہ وہی عود ہے جسے ہندوستان کے ایک راجہ نے میرے والد کے پاس میری بہن بوران کے زفاف کے موقع پر بھیجی تھی، متوکل نے عبید اللہ کو جھٹلایا اور ٹوکری منگائی جس سے عود کا ٹکڑا نکالا گیا تھا تو اس میں یہ عود ایک اوقیہ سے بھی کم مقدار میں رہ گئی تھی، اور ایک رقعہ ملا جس میں لکھا تھا ھذا العود ھدیۃ ملک الھند إلی الحسن بن سہل لزفاف بوران إلی المامون " یہ پرزہ دیکھ کر متوکل بہت شرمندہ ہوا اور عبید اللہ کے لیے انعام و اکرام کا حکم دیا، نیز اسی وقت اپنے وزیر عبید اللہ بن یحییٰ بن خاقان کو حکم دیا کہ کسی معتبر آدمی کو ایک ہزار دینار سفر خرچ دو اور دس ہزار دینار کے ایسے ہدایا و تحائف اس کے حوالے کرو جو ہندوستان میں نہیں پائے جاتے، وہ انہیں لے جا کر ہندوستان کے راجہ کی خدمت میں پیش کرے، اور اس کے بدلے وہ عود طلب کرے جو اس کے یہاں محفوظ ہے، چنانچہ وزیر مذکور نے ایک قاصد ہندوستان روانہ کیا، مگر وہ ہندوستان سے بغداد متوکل کے قتل کی رات میں پہونچا اور اس نے ہندوستان کی عود اپنے قبضہ میں رکھا، یہاں تک کہ خلیفہ معتمد علی اللہ تخت نشین ہوا، قاصد کا بیان ہے کہ اس وقت میں وزیر عبید اللہ کے پاس گیا، اس نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا کہ تم ہی قاصد بن کر ہندوستان کے راجہ کے یہاں گئے تھے؟ میں نے کہا ہاں آپ کے حکم کی تعمیل میں نے ہی کی تھی، میں نے راجہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پہلے ہدایا و تحائف پیش کیے جن سے وہ بہت خوش ہوا، اور جب میں نے اس سے عود کا سوال کیا تو کہا کہ یہ عود میرے خزانہ میں صرف ایک سو سیر رہ گئی ہے، اس میں سے نصف تم لے لو، اور نصف میرے لیے چھوڑ دو، میں اسے پھسلاتا رہا یہاں تک کہ ڈیڑھ سو رطل (پچھتر سیر) دینے پر راضی ہو گیا، اسی دوران میں ایک دن راجہ نے مجھے کھانے پر بلایا، کھانا کھانے کے بعد نارجیل کی نبیذ (غالباً نارجیل کا پانی) لائی گئی تو میں نے اس کے پینے سے انکار کیا اور اپنی قطربلی کی شراب نکالی جسے بغداد سے ساتھ لے گیا تھا، راجہ نے پوچھا یہ کیا

چیز ہے ۔میں نے کہا یہ انگور کا پانی ہے، پھر میں نے ایک سو خماسی (ایک وزن) قطربلی شراب اس کو دیدی، اور اس کے بدلے اس نے مجھے ایک لاکھ درہم بہت سے کپڑے اور خوشبو دینے کا حکم دیا، میں یہ تمام چیزیں لے کر وہاں سے رخصت ہوا اور بغداد کا رخ کیا، جس رات سُرَّ مَن رَأی پہونچا اسی رات متوکل کے قتل کا حادثہ پیش آیا، یہ قاصد نے واقعہ بیان کر کے وہ عود وزیر عبید اللہ کے سامنے رکھ دی، عبید اللہ نے کہا کہ عود کے علاوہ جو کچھ تحفے تحائف تھے اور تم نے ان کو رکھ لیا تم کو مبارک ہوں، اور یہ عود بعینہٖ کل میرے حوالہ کر دینا، چنانچہ میں نے دوسرے دن ساری عود اس کے حوالہ کر دی، عبید اللہ ہمیشہ یہی عود استعمال کرتا تھا اور اس کے مقابلہ میں کوئی دوسری قسم کی عود پسند نہیں کرتا تھا۔

(صفحہ ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵)

عیش وعشرت اور شراب وشباب کی ان ہی حرکتوں نے مسلم قوم کو تباہ و برباد کیا، آخری دور میں خلفاء نے اسلامی خزانوں کو اپنی ملکیت سمجھ کر بے دریغ عیش وعشرت پر خرچ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زوال وادبار کا منہ دیکھنا پڑا!

سندھ میں عمران بن موسیٰ برمکی کا قتل اور اس کی متروکات کی تفصیل

خلیفہ واثق باللہ کے زمانہ میں ذوالحجہ ۲۲۷ھ میں عمران بن موسیٰ بن یحییٰ بن خالد برمکی کو سندھ میں قتل کر دیا گیا، جب اس کی خبر واثق کو ملی تو اس نے عمران بن موسیٰ کی دولت پر قبضہ کرنے کے لیے بغداد، بصرہ اور سیراف میں آدمی روانہ کیے، انہوں نے عمران کے بیٹے محمد اور اس کی ایک بہن کو گرفتار کیا۔ اور دو سال تک قید میں رہنے کے بعد ان کی رہائی ہوئی، عمران کے کارندوں اور وکیلوں کو بھی گرفتار کر کے سُرَّ مَن رَأی لایا گیا، انہوں نے عمران کی تمام دولت جو ان کے پاس تھی حکومت کے حوالہ کر دی، جس کی مجموعی قیمت پانچ کروڑ تھی، اس کے علاوہ تقریباً دو ہزار اگر کی لکڑیاں ہیں اور جو سامان لاپتہ ہو گیا اس کا کوئی شمار نہیں، مقبوضہ سامان میں زیادہ تر سونا تھا۔ واثق نے اسی سونے سے وہ مشہور

ہندی خوان بنوایا تھا جس کی پلیٹیں اور دوسرے سامان سونے کے تھے۔

عمران نے اپنی سندھ میں حکومت کے زمانہ میں واثق کے پاس بہت سے گراں قدر ہدیے، سندھی سامان، مشک، عنبر، عود ہندی، سونے چاندی کے برتن، ہندی تلواریں، عود کے تخت، کرسیاں، خالص چاندی کی اتنی مقدار بھیجی تھی کہ سب کی مجموعی قیمت دو کرور سے زیادہ تھی، اس کے علاوہ بغاث، شیر ببر، اور دوسرے وحشی جانور اور خوبصورت پرندے بھیجے جو بغداد میں نہیں پائے جاتے تھے، اور واثق نے ان تحائف کو پاکر بڑی خوشی ظاہر کی، عمران کے قتل کے بعد اس کا جو سامان ملا تھا اس میں جنگی اسلحہ کی بھی کافی تعداد تھی، مثلاً (۱) سات سو پرانے ہندی نیزے، جن پر روغن پھیرا ہوا تھا (۲) سابری زرہیں، (۳) بلند طرخوینہ (۴) تبتی زرہیں، (۵) تبتی حدیدہ (۶) آہنی بازوبند (۷) پیر کی آہنی پٹی (۸) خود (۹) گھوڑے کے برگستواں، اور اسی طرح کے دوسرے جنگی سامان اتنی تعداد میں تھے کہ ان کا شمار مشکل تھا (صفحہ ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷)

خلیفہ مستنصر کے خزانے میں ہندوستان کی گراں قدر اشیاء

خلیفہ مستنصر باللہ کے محل کے خزانے سنہ ۴۶۰ھ اور سنہ ۴۶۱ھ میں بڑی بے دردی سے لوٹے گئے اور باغیوں نے قیمتی نوادر کو بری طرح برباد کیا، جو قیمتی اشیاء شاہی خزانہ میں پائی گئیں ان میں سے کئی ایک کا تعلق ہندوستان سے تھا مثلاً (۱) کئی صندوق مختلف قسم کی چھوٹی بڑی چوکور اور گول دواتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ دواتیں صندل اور عود کی لکڑی کی بنی ہوئی تھیں (۲) کئی صندوق طرح طرح کے قلموں سے بھرے ہوئے تھے، ان میں ہندوستان کے خاص درخت فلفل کی لکڑی کے قلم بھی تھے (۳) تبت کے مشک بھرے ہوئے کئی ظروف، (۴) عودِ اخضر کے درخت اور اس کے ٹکڑے (۵) عودِ ہندی کے پانچ بادبان جن میں سے ایک کا طول نوسے دس ہاتھ تک کا تھا (۶) رومال کا ایک ٹکڑا جو سمندل چڑیا کے پروں سے بنا ہوا تھا، سمندل ایک مشہور ہندوستانی پرندہ ہے اس کے پروں سے منہ

صاف کرنے کے لیے رومال بُنے جاتے تھے جو آگ میں نہیں جلتے تھے، یہ رومال نو بالشت لمبا تھا، محل کے جملہ سامانوں میں یہ رومال بھی فروخت کیا گیا اور کسی مسافر تاجر نے اس کو نہایت معمولی قیمت میں خرید لیا، اور جب اس کی اہمیت معلوم ہوئی اور تاجر کو تلاش کیا گیا تو کسی کا پتہ نہ چلا (صفحہ ۲۵۵ تا ۲۵۹ ملخص)

مسلمان امرار و خلفار کے مابین ہندوستانی اشیار کے تحفے تحائف

یعقوب بن لیث صفار نے ایک سال خلیفہ معتمد کی خدمت میں بہت سے ہدایا نہ تحائف بھیجے جن میں دیگر عجائب و نفائس کے ساتھ ایک سو سیر عود ہندی بھی تھی، (صفحہ ۳۹) ۲۸۱ھ میں جو ہدایا بھیجے ان میں بھی ایک سو سیر عود تھی، (صفحہ ۴۲) اور ۲۸۳ھ کے ہدایا میں پچاس سیر عود تھی (صفحہ ۴۳)، ۲۶۲ھ میں جب یعقوب بن لیث صفار نے خلیفہ معتمد اور اس کے بھائی موفق کے مقابلہ میں شکست کھائی اور طسوج جازر (عراق) میں جاکر پناہ لی تو اس کے خزانہ سے خلیفہ کو دیگر اشیار کے ساتھ سندھ، ہندوستان چین اور فرغانہ کے عمدہ عمدہ سامان، عودِ ہندی، مشک تبتی اور نقد و دولت کے بے شمار صندوق ملے، ان سامانوں کی لطافت و نزاکت تعریف سے بالاتر تھی (صفحہ ۶۱)

صاحب یمن اسحاق بن زیاد نے ۳۵۹ھ میں عزالدولہ ابو منصور کو جو ہدیہ بھیجا تھا اس میں منجملہ دیگر اشیار کے عود قماری کے بادبان کا ڈانڈا تھا جس کا طول دس ہاتھ اور وزن تیس سیر تھا (صفحہ ۶۶)، سلطان مغرب معز بن بادیس بن منصور نے فاطمی خلیفہ الظاہر کے پاس ہدیہ بھیجا، اس کے جواب میں الظاہر نے جو ہدایا بھیجے تھے، ان میں ہندوستان، چین، اور خراسان کی خوشبوئیں اور جواہر کی تمام قسمیں موجود تھیں (صفحہ ۶۸، ۶۹، ۷۰)، امیر ناصر الدولہ ابوعلی حسن بن حمدون نے ۳۶۳ھ میں شاہ روم ارمانوس المعروف بہ دیو جانس کے پاس جو ہدایا بھیجے تھے ان میں عود ہندی کے بادبان کے ڈانڈے بھی تھے، ایک ڈانڈا کا طول بارہ ہاتھ تھا اور چوڑائی تین بالشت تھی، اور وزن چالیس

سیر تھا (صفحہ ۸۵)

سلطان محمود غزنوی کے یہاں ہندوستان کے یاقوت، ہاتھی، اور تیس ہزار پیل وان	سلطان محمود بن سبکتگین کے پاس آئینہ کے مانند یاقوت سرخ کی

ایک عجیب چیز تھی، جو اپنی نفاست و غرابت کے اعتبار سے انمول تھی جب سلطان محمود نے ۴۰۹ھ میں ہندوستان پر حملہ کیا تو متھرا کے ایک بت خانہ میں یہ چیز ملی تھی، اس بت خانہ میں سونے کے پانچ سو بُت تھے جن میں سے ہر ایک کا وزن گیارہ رطل تھا، اور قیمت ایک لاکھ دینار تھی، ان بتوں کے ہاتھوں پر طرح طرح کے جواہر اور یاقوت جڑے تھے، اس بت خانہ کے جملہ سامان میں آسمانی رنگ اور سُرخ رنگ کے یاقوت کے کچھ ٹکڑے تھے جن کا مجموعی وزن چھ سو مثقال تھا، (صفحہ ۱۹۲)

ابو العباس طوسی کا بیان ہے کہ خلیفہ القادر باللہ نے الغالب باللہ کی ولیعہدی کی دعوت کے سلسلے میں مجھے سلطان محمود بن سبکتگین کے پاس غزنہ میں سفیر بنا کر بھیجا، وہاں میں نے بہترین ساز و سامان کے ساتھ اتنی زیادہ فوجیں دیکھیں کہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں، پھر جب میں دربار کے قریب پہونچا تو دیکھا کہ ہاتھیوں کا ایک انبوہ کثیر ہے، جسے ہندوستان کے تیس ہزار آدمی (فیل بان) گھیرے ہوئے تھے، دوسرے عجائب دیکھتے ہوئے میں نے محل میں جا کر سلطان محمود کو خلیفہ القادر باللہ کا خط دیا، اس کے بعد سلطان محل سے باہر چلا، میں بھی ساتھ ساتھ تھا جب دروازہ کے باہر پہونچا تو یہ عجیب منظر دیکھا کہ ان لوگوں میں (فیل بانوں میں) ایک شور برپا تھا، تمام ہاتھی سجدہ میں گر گئے، اور گھوڑے ہنہنانے لگے، اس وقت قیامت کا منظر معلوم ہوتا تھا، اور میں نے محسوس کیا کہ زمین لرز رہی ہے، اس واقعہ کو قاضی رشید نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، ہم نے صرف ہندوستان سے متعلق حصّہ کو اختصار کے ساتھ لکھا ہے (صفحہ ۱۵۱ و ۱۵۲)

(۸)

راجہ رہمی اور ہندوستان کے دوسرے چند راجے

راقم نے اپریل اور مئی ۱۹۶۰ء کے مجلہ "معارف" میں قاضی رشید بن زبیر کی کتاب الذخائر و التحف کا جسے محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (پیرس) کی تحقیق و تعلیق کا فخر حاصل ہے، تعارف کرایا تھا اور اس کے اقتباس پیش کئے تھے، اس مقالہ میں قاضی رشید بن زبیر کے حالات پر بھی مختصر بحث کی گئی تھی، اور کتاب میں مذکور ہندوستان کے راجہ رہمی کے نام و مقام کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی تھی، اور ڈاکٹر صاحب کے احتمالات کے علی الرغم اس کا قطعی فیصلہ کیا تھا،

ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں امور کے بارہ میں اپنے ایک مکتوب (مندرجہ معارف دسمبر ۱۹۶۰ء) کے ذریعہ راقم الحروف کو اس کی مزید تحقیق کی جانب توجہ دلائی ہے اور لکھا کہ "رسالہ معارف کی جلد ۸۵ میں فاضل محترم اظہر مبارک پوری نے مسلسل دو قسطوں میں "عرب و ہند کے قدیم علمی و ثقافتی تعلقات" کے عنوان سے جدید دریافت شدہ نادر کتاب الذخائر و التحف للقاضی الرشید بن الزبیر پر تبصرہ فرمایا اور اقتباسات کا ترجمہ کیا ہے، فاضل مقالہ نگار کی دو چیزوں پر کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

وہ لکھتے ہیں کہ القاضی الرشید نامعروف نہیں ہے بلکہ محترم پروفیسر عبد العزیز میمنی صاحب نے اس کا حال کئی کتابوں میں پایا ہے، قصہ یہ ہے کہ ابن خلکان، اور یاقوت نے جس القاضی الرشید کا ذکر کیا ہے اس کی وفات ۵۶۱ھ یا ۵۶۲ھ میں

ہوئی ہے، اور ہماری کتاب کی اندرونی شہادت یہ ہے کہ اس کا مؤلف اس سے تقریبًا ایک صدی قبل فوت ہو چکا ہے، ابن خلکان میں القاضی الرشید بن القاضی الرشید بن القاضی الرشید کا ذکر ہے میرا گمان ہے کہ ہماری کتاب پوتے کی نہیں بلکہ دادا کی ہے لیکن دادا کے حالات نہیں ملتے، کتاب میں میرے دیباچے کے الفاظ کا یہی منشا ہے۔

اسی طرح وہ راجہ دھمی یا رہمی پر قطعی فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ اسے کیا پڑھنا چاہیئے اور وہ کون ہے؛ میں نے بہ کثرت تحقیقی مقالوں کے حوالے دیئے ہیں کہ وہ فضلا ر بھی کسی نتیجے پر نہیں پہونچ سکے، اور نہیں بتا سکے کہ اس معرّب لفظ کی اصل کیا ہے، اور اس کا کس تاریخی شخصیت پر اطلاق ہونا چاہیئے، اگر محترم مبارک پوری صاحب ان سارے مقالوں کو پڑھکر اور ان کے دلائل کی تنقید کر کے کوئی فیصلہ صادر فرمائیں تو علم کی بڑی خدمت ہوگی، اور ایک دیرینہ بحث ختم ہو سکے گی، ظاہر ہے کہ محض دعوی کافی نہیں، دلائل کی ضرورت ہے"۔ (مکتوب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پیرس مندرجہ معارف دسمبر ۶۵ء)

حسن اتفاق میں نے قاضی رشید بن زبیر کے بارے میں اپنی تحقیق اپنی بساط کے مطابق لکھ کر اس مکتوب کی اشاعت سے پہلے ہی مدیر معارف کی خدمت میں روانہ کر دی تھی۔ اور ڈاکٹر صاحب کے مکتوب کے ساتھ اس کی بھی اشاعت ہو گئی۔ اب ڈاکٹر صاحب کے دوسرے ارشاد کی تعمیل میں ذیل کا مقالہ حاضر خدمت ہے۔

خیال ہوا کہ اس بہانہ سے جنوبی ہندوستان کے ان چند راجاؤں کا تذکرہ بھی مرتب ہو جائے جن کو مسلمان مورخوں اور سیاحوں نے ذکر کیا ہے تو زیادہ مناسب ہوگا، اسلیے راجہ رہمی کے ساتھ دوسرے بعض راجوں کا مختصر تذکرہ بھی آگیا ہے، اور اس طرح اس مقالہ کی مستقل حیثیت ہو گئی ہے، جو انشاء اللہ ہندوستان کے ساتھ مسلمانوں کے قدیم تعلقات کے سلسلے میں مفید ثابت ہوگا۔

ہندوستان قدیم	ہندوستان میں طوائف الملوکی اور راجاؤں کے امتیازی القاب

زمانہ سے جس طرح طلسمات، شعبدہ بازی اور علوم وفنون کی سرزمین رہا ہے، اسی طرح راجوں مہاراجوں کا دیس بھی رہا ہے۔ طوائف الملوکی یہاں کی قدیم خصوصیت ہے، علامہ مسعودیؒ نے یہ داستان مختصر الفاظ میں یوں لکھی ہے:-

ولما هلك هذا الملك (كورش) اختلفت | کورش کے مرنے پر ہندوستانیوں میں اختلاف
الهند فی آرائها فتحزبت وتحیلت | رائے ہو گیا اور یہاں کے لوگ گروہ در گروہ بٹ
الاجیال وتفرد کل رئیس بناحیة فملك ارض | گئے، اور ہر علاقہ پر ایک حکمراں قابض ہو گیا، چنانچہ
السند ملك، وملك علی ارض القنوج ملك | سرزمینِ سندھ کا الگ راجہ ہوا، سرزمینِ قنوج
وتملك علی ارض قشمیر ملك، وتملك علی | کا الگ راجہ، کشمیر پر الگ راجہ قابض و دخیل ہوا،
مدینة المانكیر وهی الحوزة الكبری ملك | اور شہر مانکیر (منگرور گجرات)، پر جو کہ بہت بڑا علاقہ
یسمی بالبلهری[1] | ہے بلہرا نامی راجہ حکمراں بن گیا۔

بعد کے زمانہ میں یہ طوائف الملوکی یہاں کے مختلف خاندانوں میں اس طرح ورثہ کے طور پر چلی کہ مختلف علاقوں کے حکمراں خاندانوں نے اپنے لیے مخصوص لقب اختیار کر لیا جو حکومت ہی کی طرح ورثہ میں منتقل ہوا کرتا تھا، اور ہر خاندان کا حکمراں اپنے نام کے بجائے عام طور سے آبائی لقب سے پکارا جاتا تھا، چنانچہ عرب جغرافیین میں ہندوستان کا سب سے قدیم جغرافیہ نویس ابن خرداذبہ (سنہ ۲۵۰ھ) نے اپنی کتاب المسالک والممالک میں "القاب ملوک الارض" کے ذیل میں ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے القاب اس طرح لکھا ہے:-

ملك الهند الاكبر بلهرا ای ملك	ہندوستان کا سب سے بڑا راجہ بلہرا ہے، یعنی راجوں
الملوك، ومن ملوك الهند جابة، وملك	کا راجہ، نیز ہندوستان کے راجوں میں جابہ،
الطافن وملك الجزر، وغابة ورهمی	طافن، جزر، غابہ، رہمی، قامرون لقب کے راجہ

[1] مروج الذہب ج ۱ ص ۸۲۔

وملك قامرون، وملك الزابج الفتحب، وملك جزائر البحر الشرقی المهراج۔[1]	ہیں، زابج کا راجہ فتحب اور مشرقی سمندر میں واقع جزائر کا راجہ مہراج کہلاتا ہے۔

ہندوستان کے سب سے پہلے عرب سیاح سلیمان تاجر نے اپنا سفر نامہ ۲۳۷ھ میں لکھا ہے جس میں یہاں کے چار مشہور خاندانی مہاراجوں بلہرا، جزر، طافن اور رہمی کا ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے:۔

وبلهرا اسم لكل ملك منهم ككسرى ونحوه وليس باسم لازم۔[2]	بلہرا اس زمانہ کے راجاؤں میں سے ہر ایک کو کہتے ہیں جیسے کسریٰ اور یہ کسی خاص راجہ کا نام نہیں ہے

اسی بلہرا کے بارے میں علامہ مسعودی نے ۳۳۲ھ میں مروج الذہب میں تصریح کی ہے کہ:

وهذا اول ملك سمی من ملوكهم بالبلهرای فصارت سمة لمن طرأ بعده من الملوك لهذه الحوزة الی دقتنا هذا، وهو سنة اثنتين وثلثين وثلثمائة۔[3]	یہ پہلا راجہ ہے جو ہندوستان کے راجاؤں میں اس لقب سے پکارا گیا اور یہ لفظ اس علاقہ کے ہر حکمراں کے لیے نشانی بن گیا، اس کا سلسلہ ہمارے زمانہ ۳۳۲ھ تک جاری ہے

کشمیر کے راجہ کے بارے میں مسعودی نے لکھا ہے:۔

وملك قشمیر یعرف بالرائی هذا الاسم الاعم لسائر ملوكهم۔[4]	کشمیر کا راجہ رائے کے لقب سے مشہور ہے یہ نام اس خاندان کے ہر راجہ کا ہوتا ہے۔

اسی طرح مسعودی نے اپنی کتاب التنبیہ والاشراف میں زابج کے سمندر میں واقع بڑے بڑے جزیروں کے بیان میں وہاں کے راجہ مہاراج کے متعلق لکھا ہے:۔

والمهراج سمة لكل من ملكها۔[5]	مہراج کا لفظ یہاں کے ہر حکمراں کے لیے بطور علامت ہے۔

[1] المسالک والممالک ص ۱۶ و ۱۷، [2] رحلۃ سلیمان التاجر [3] مروج الذہب ج ۱ ص ۸۲
[4] ایضاً [5] کتاب التنبیہ والاشراف ص ۵۲ مطبوعہ مصر ۱۳۵۷ھ

ابن الفقیہ ہمدانی (۲۹۰ھ) نے کتاب البلدان میں رہمی کو خاندانی لقب کے بجائے اسے ہندوستان کی ایک مملکت کا نام بتایا ہے جس پر ابن الفقیہ کے زمانہ میں ایک عورت حکومت کرتی تھی، اس کا بیان ہے:۔

وفی بلاد الھند مملکۃ یقال لھا رھمی علی ساحل البحر وملکتھم امرأۃ الخ۔[1]	ہندوستان میں ایک مملکت رہمی نامی ہے جو سمندر کے ساحلی علاقہ میں ہے، یہاں ایک عورت حکمراں ہے۔

ان تصریحات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عرب سیاحوں، مورخوں اور جغرافیہ نویسوں نے اپنی کتابوں میں اپنی محدود معلومات کے مطابق ہندوستان کے جن راجوں مہاراجوں کا تذکرہ کیا ہے، انہوں نے ان کے ذاتی نام نہیں لکھے ہیں، بلکہ قدیم خاندانی لقب کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے، اور بلہرا، جابہ، طافن، جزر، غابہ، رہمی اور مہراج وغیرہ، راجوں کے ذاتی نام نہیں بلکہ یہ ان کے خاندانی القاب ہیں، جس طرح کسریٰ، قیصر وغیرہ ذاتی نامی نہیں، بلکہ حکمراں خاندانوں کے القاب ہیں، اسی طرح یہ نام یہاں کے مختلف علاقوں اور خطوں کے بھی نہیں ہیں کہ ہم ملک جزر کو گجرات کا راجہ اور ملک طافن کو دکھن کا راجہ تسلیم کریں، البتہ بعض علاقوں پر ان خاندانی القاب کے اطلاق کا پتہ ضرور چلتا ہے جیسا کہ ابن فقیہہ ہمدانی نے رہمی کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ہندوستان کی ایک مملکت کا نام ہے اور اسی سے اس کو موسوم کرتے ہیں، مگر یہ بات عام نہیں ہے، بلکہ عام طور سے یہ القاب حکمراں خاندانوں ہی کے لیے بولے جاتے ہیں، اور عرب مورخوں نے ان کے شخصی نام کے بجائے ان ہی القاب سے ان کا تذکرہ کیا ہے۔

جنوبی ہند کا پہلا مغربی راجہ بلہرا اور آخری مشرقی راجہ مہراج	چوتھی صدی ہجری کے وسط تک مسلمان مورخوں نے ہندوستان کے بے شمار راجوں مہاراجوں

[1] کتاب البلدان ص ۱۵۔

میں سے اپنی محدود معلومات کے مطابق صرف چند کا تذکرہ ان کے القاب سے کیا ہے، جن سے وہ بحری اور تجارتی سفروں کے سلسلہ میں واقف ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ جب وہ سندھ کے بعد ہندوستان کے راجوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو عام طور سے مغربی جنوبی، مشرقی سواحل اور ان کے آس پاس کے خاندانی حکمرانوں کا تذکرہ کرتے ہیں، وسطی یا شمالی ہندوستان کے حکمرانوں میں راجہ قنوج اور راجہ کشمیر کے علاوہ کسی کا ذکر نہیں کرتے، البتہ اسی صدی کے آخر میں ابوریحان بیرونی نے پورے ہندوستان سے واقفیت حاصل کر کے یہاں کا مفصل حال کتاب الہند میں لکھا ہے۔ ان مورخوں نے ہندوستان کے مغربی ساحلی علاقہ کا پہلا حکمراں راجہ بلہرا (ولبھی رائے) کو بتایا ہے، پھر ساحلی حدود کے مہاراجوں کا ذکر مہراج پر ختم کیا، جو مشرق میں ہندوستان اور چین کے درمیان ہندوستانی علاقہ تھا۔ چنانچہ مسعودی نے اس حصہ کا تذکرہ یوں کیا ہے:۔

وارض الهند ارض واسعة في البر والبحر والجبال، وملكهم متصل بملك الزابج، وهي دار المملكة المهراج ملك الجزائر، وهذه المملكة قدر بين مملكة الهند والصين۔[1]	ہندوستان کا ملک خشکی، سمندر اور پہاڑوں میں دور تک پھیلا ہوا ہے، ان کا ملک زابج کے راجہ سے ملا ہوا ہے جو جزائر کے راجہ مہراج کا دارالسلطنت ہے اور یہ مملکت ہندوستان اور چین کے درمیان مانی جاتی ہے۔

ابن الفقیہ ہمدانی نے بھی ہندوستان کی آخری مشرقی مملکت مہاراج کے ملک زابج کو بتایا ہے، اور اس کو ہندوستان کا آخری علاقہ قرار دیا ہے، چنانچہ راجہ رہمی کے تذکرہ کے بعد لکھتا ہے:۔

ثم تصير الى بلاد الزابج فالملك الكبير يقال له المهراج	پھر تم بحری راستہ سے بلاد زابج کی طرف چلو، یہاں کے بڑے راجہ کو مہراج کہتے ہیں، جس کا

[1] مروج الذہب ج ۱ ص ۸۲

مطلب راجوں کا راجہ ہے، اس کے بعد کوئی راجہ نہیں ہے، کیونکہ یہ بحر کند کے آخر جزائر میں واقع ہے۔	تفسیرہ ملک الملوك، ولیس بعدہ احد لانہ فی آخر الجزائر[1]

ان تصریحات کی بنا پر یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مہاراج خاندان کی حکومت جزائر زابج مشرقی ہندوستان میں واقع تھی، جس کو سماٹرا اور انڈونیشیا سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ سلیمان تاجر کی تصریح سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہند کی مشہور بندرگاہ کلا بھی مہاراج خاندان کے قلمرو میں شامل تھی، چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ عمان سے ہندوستان اور ہندوستان سے چین جاتے ہوئے لوکم بلی (ٹراونکور) پڑتا ہے، اس کے بعد جہازوں کا رخ کلاہ بار کی طرف ہو جاتا ہے جو مملکتِ زابج میں شامل ہے۔

پھر جہاز مملکت کلاہ بار کا رخ کرتے ہیں اور ساحل کو بار (پار) کہتے ہیں، یہ مقام زابج کی مملکت میں ہے جو بلاد ہند کے دائیں جانب واقع ہے، ان سب پر ایک راجہ حکومت کرتا ہے۔	ثم تخطف المراکب الی موضع یقال لہ کلاہ بار المملکۃ والساحل کل یقال لہ بار، وھی مملکۃ الزابج متیامنۃ عن بلاد الھند یجمعھم ملک[2]

ان تمہیدی تنقیحات کے بعد ہم مسلمان مورخوں اور سیاحوں کے بیانات کی روشنی میں یہاں کے چند مہاراجوں کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں، اس کے بعد راجہ رہمی کے بارے میں تفصیل سے کام لیں گے کہ اس مقالہ کا اصل سبب اسی کی تحقیق ہے۔

راجوں کے ذکر کی ترتیب کا الجھاؤ سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جن عرب مورخوں اور جغرافیہ نویسوں نے یہاں کے مہاراجوں کا ذکر کیا ہے انہوں نے عام طور سے مغربی سواحل اور اس کے آس پاس کے مہاراجوں کا پہلے ذکر کیا ہے پھر ترتیب

[1] کتاب البلدان ص۱۵ [2] رحلۃ سلیمان التاجر

کے ساتھ جنوبی اور مشرقی علاقوں کے مہاراجوں کا ذکر کیا ہے۔ مگر یہ ترتیب مکانی نہیں ہے، یعنی ان راجاؤں کی یہ حکومتیں اس ترتیب سے نہ تھیں بلکہ ماحولی ہے جس سے آس پاس کے راجوں کا پتہ چلتا ہے، سلیمان تاجر نے بلہرا کے ذکر میں لکھا ہے۔

وحوله ملوك كثيرة يقاتلونه غير انه يظهر عليهم فمنهم ملك يدعى ملك الجزر۔

اس کے اردگرد بہت سے راجے ہیں جو اس سے برسرپیکار رہا کرتے ہیں مگر یہ سب پر فتحیاب ہوتا ہے، ان ہی میں سے ایک راجہ ہے جسے جزر کہتے ہیں۔

اس کے بعد لکھا ہے:۔

والی جانبه ملك الطافن

اور اس کے پہلو میں راجہ طافن ہے۔

پھر راجہ رہمی کا یوں تذکرہ کیا ہے:۔

ویلی هؤلاء ملك يقال له رهمی[1]

ان راجوں سے متصل ایک راجہ ہے، جسے رہمی کہا جاتا ہے۔

بہر حال سب سے پہلے ابن خرداذبہ نے سرکاری کاغذات اور دوسرے معلومات کی بنا پر یہاں کے مہاراجوں کی جو ترتیب بیان کی ہے وہ یہ ہے: (۱) بلہرا (۲) جابہ (۳) طافن (۴) جزر (۵) غابہ (۶) رُہمی (۷) قامرون (۸) فنجب (۹) مہراج[2]

اس کے بعد سلیمان تاجر نے ذاتی معلومات اور علم و تحقیق کی بنا پر ۲۳۷ھ میں ترتیب وار یہ نام لکھے ہیں (۱) بلہرا (۲) جزر (۳) طافن (۴) رہمی (۵) کاشبین (۶) فیرنج (یہ لفظ شاید پیلانگ کا معرّب ہو)[3]

مسعودی نے ۳۳۲ھ میں اپنی تحقیق کی بنا پر ان کے یہ نام لکھے ہیں: (۱) بلہرا (۲) جزر (۳) طافن (۴) رہمی[4]

---

[1] رحلة سلیمان التاجر [2] المسالک الممالک ص ۱۶ [3] رحلة سلیمان التاجر [4] مروج الذہب ج ۱ ص ۸۱

ابن الفقیہ ہمدانی (حدود ۲۹۰ھ) نے کتاب البلدان میں صرف آخر کے دو مشرقی مہاراجوں کا تذکرہ کیا ہے، یعنی (۱) رہمی (۲) اور مہراج[1]

ابو علی احمد بن عمر بن رستہ نے عام جغرافیہ نویسوں اور مورخوں کے برخلاف ہندوستان کے مہاراجوں کا ذکر مشرق سے شروع کیا ہے، پھر جنوبی اور مغربی مہاراجوں کا ذکر کر کے انتہائے مشرق میں واقع جزائرِ زانج کے راجہ مہاراج کا ذکر کیا ہے، چنانچہ الاعلاق النفیسہ کی ساتویں جلد میں دو سیاحوں کی زبانی پہلے ملک قمار (کماری) کا پھر دوسرے مہاراجوں کا تذکرہ کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) ملکِ قمار (۲) عابدی (یا قائدی ملک رتیلا) (۳) عارطی (یا فاریطہ یا فارطی) (۴) صلیمان (۵) رابیہ (اورنسین کی حکمراں عورت) (۶) بلہرا، اس کے اطراف و جوانب میں کئی راجے ہیں (۷) طافن (۸) نجابہ (جابہ) (۹) جزر، اس کے بعد ملتان اور اس کے بتخانہ کا تفصیلی ذکر کر کے لکھا ہے:۔

(۱۰) اور اس کے بعد بھی کئی راجے ہیں اور ان کا سلسلہ بلاد زانج تک چلا گیا ہے، پھر بڑا راجہ آتا ہے جسے مہراج کہتے ہیں۔	ومن ورائہ ملوك حتی تنتھی الی بلاد الزابج فالملك الكبير يقال له المهراج[2]۔

ابن رستہ کے اس بیان میں بعض راجوں کے خاندانی القاب اور بعض کے ذاتی نام ہیں جن کا صحیح تلفظ اور اس کی تحقیق مشکل ہے۔

ان مورخوں اور جغرافیہ نویسوں میں ہمارے نزدیک سلیمان تاجر اور مسعودی کی تصریحات زیادہ اہم اور صحیح معلومات پر مبنی ہیں، سلیمان تاجر نے بحری سفر کر کے ہند و چین کے حالات خود معلوم کیے تھے، اور ان ذاتی معلومات اور تحقیقات کو ۲۳۷ھ میں سفرنامہ کی شکل میں مرتب کیا، اسی طرح سلیمان تاجر کے تقریباً ایک صدی بعد مسعودی نے

---

[1] کتاب البلدان صفحہ ۱۵ [2] الاعلاق النفیسہ۔ابن رستہ ملخص صفحہ ۱۳۲ تا ۱۳۹

چوتھی صدی کے بالکل ابتدا میں سندھ اور ہندوستان کی سیاحت کی اور ان کے حالات
بچشم خود مشاہدہ کرکے ۳۳۲ھ میں ان کو مروج الذہب میں ذکر کیا اس نے اپنی دوسری
کتاب اخبار الزمان میں ہندوستان کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں جس کا
ایک حصہ حال ہی میں مصر سے شائع ہوا ہے، اسی طرح کتاب التنبیہ والاشراف میں بعض
مقامات پر ہندوستان کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات ہیں۔

یہ دونوں سیاح سو برس کے آگے پیچھے گذرے ہیں اور دونوں نے ہندوستان کے
ان چار مہاراجوں کے حالات اس ترتیب سے لکھے ہیں، بلہرا، جزر، طافن اور رہمی، یہ
ظاہر ہے کہ سو برس تک یہ چاروں حکمراں زندہ نہیں رہے ہوں گے کہ ان دونوں نے
ان کے ذاتی ناموں سے ان کا ذکر کیا ہے، بلکہ یہ ان کے خاندانی القاب ہیں، کیونکہ
سو برس پہلے وہ جن القاب سے مشہور تھے سو برس بعد بھی ان ہی سے مشہور تھے، راجہ رہمی کے تفصیلی ذکر سے
پہلے مختصر طور پر اس سے پہلے کہ تین مہاراجوں کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

راجہ بلہرا (دلبھی رائے گجرات)

سلیمان تاجر کا بیان ہے کہ اہل ہند وچین کے نزدیک
متفقہ طور پر پوری دنیا میں صرف چار بڑے بڑے بادشاہ ہیں، جن میں پہلا نمبر عرب کے
بادشاہ (خلیفۃ المسلمین) کا ہے، یہ ان کے نزدیک سب سے بڑا، سب سے مالدار
اور سب سے حسین وجمیل ہے، اور یہ بہت بڑے دین (اسلام) کا بادشاہ ہے، جس کی
طاقت کے مقابلہ میں کوئی طاقت نہیں ہے۔ دوسرا نمبر چین کے بادشاہ کا ہے، پھر شاہ
روم کا اور اس کے بعد بلہرا کا ہے، اس خاندان کے بادشاہوں کے کان چھدے ہوتے ہیں،

یہ بلہرا ہندوستان کے تمام راجوں مہاراجوں میں معزز و محترم ہے، اور سب
اس کی تعظیم کرتے ہیں، چنانچہ وہ تمام راجے مہاراجے جو اپنے اپنے علاقوں کے آزاد
حکمراں ہیں، بلہرا کی عظمت کے معترف ہیں اور جب بلہرا کے قاصد ان کے یہاں
جاتے ہیں تو یہ ان کی تعظیم وتکریم کے لیے ان کو سجدہ کرتے ہیں، یہ راجہ عربوں کی

طرح اپنی فوج کو وظیفہ دیتا ہے، اس کے پاس ہاتھی گھوڑے اور دولت بہت زیادہ ہے
اس کے یہاں طاطریہ نام کے سکوں کا رواج ہے، سرکاری ٹکسال کے ہر سکہ کا وزن
عام سکوں سے ڈیوڑھا ہوتا ہے، اس کا اپنا سنہ اور تاریخ ہے جو سابق حکمران کے
عہد سے چلتا ہے۔ مسلمانوں کی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے سنہ کا شمار
نہیں ہے۔ بلکہ مہاراجوں کے زمانہ سے اس کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اس خاندان کے
راجوں کی عمریں لمبی ہوتی ہیں، بسا اوقات ایک ایک راجہ پچاس پچاس سال تک
راج کرتا ہے۔ بلہرا کی مملکت کے لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے راجوں کی عمر اور حکمرانی کی
مدت اس لیے اتنی طویل ہوتی ہے کہ وہ عرب مسلمانوں سے محبت کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ
بلہرا خاندان اور اس کے اہلِ مملکت جس قدر عربوں سے محبت کرتے ہیں کوئی دوسرا راجہ
نہیں کرتا، اس خاندان کے ہر حکمران کو بلہرا کہتے ہیں جیسے کسریٰ وغیرہ، یہ لفظ بلہرا کسی راجہ
کا خاص نام نہیں ہے، بلہرا کا ملک اور اس کی سرزمین سمندر کے ساحل پر واقع ہے، جیسے
بلاد کم کم (دکن) کہتے ہیں، یہ علاقہ چین کی حدود سے متصل ہے۔

اس کے اطراف و جوانب میں بہت سے راجے ہیں، جو اس سے جنگ کیا کرتے ہیں،
مگر کامیابی اسی کو ہوتی ہے، چنانچہ ان ہی میں سے ایک راجہ جزر ہے [1]

سلیمان تاجر ہی کے دور میں ابن خردازیہ نے بلہرا کا تذکرہ یوں کیا ہے کہ "ہندوستان
کا سب سے بڑا حکمران بلہرا ہے، اس لفظ کے معنی شہنشاہ کے ہیں، اس کی انگشتری کا
نقش یہ ہے "جو آدمی تم سے کسی غرض کی وجہ سے دوستی کرے گا وہ غرض پوری ہونے
کے بعد جدا ہو جائے گا۔" یہ راجہ کم کم (دکن) میں رہتا ہے، جو ساگوان کا دیس ہے
اس کے بعد طافن کا راجہ ہے [2]

ابن رستہ نے الاعلاق النفیسہ میں لکھا ہے:۔

---

[1] رحلۃ سلیمان تاجر [2] المسالک والممالک ص ۶۷۔

بلہرا کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے راجوں میں سب سے بڑا راجہ ہے، اس کے ملک کو کم کم کہا جاتا ہے، یہ ہندی، نام ہے، اس ملک میں ساگوان ہوتا ہے جو وہاں سے باہر بھیجا جاتا ہے، اس راجہ کا ملک وسیع ہے، اور اس کی فوج بہت زیادہ ہے، اس کے آس پاس جتنے راجے ہیں سب اس کو سجدہ کرتے ہیں، اور جب اس کا کوئی قاصد ان اطراف کے راجوں کے یہاں آتا ہے تو سب اس کو راجہ کی تعظیم کی وجہ سے سجدہ کرتے ہیں[1]

مسعودی نے ۳۳۲ھ میں بلہرا کے بارے میں یوں لکھا ہے:۔

ہندوستان میں طوائف الملوکی کے بعد یہاں کے ہر علاقہ پر ایک راجہ نے قبضہ کر لیا چنانچہ مانکیر (مہانگر گجرات) شہر پر جو ایک لمبا چوڑا علاقہ ہے ..... بلہرا نامی راجہ نے قبضہ کر لیا، یہ پہلا راجہ ہے جو ہندوستان کے راجوں میں بلہرا کے نام سے موسوم کیا گیا، اور بعد میں یہ لفظ ہر اس راجہ کے لیے علامت بن گیا جو ہمارے زمانہ ۳۳۲ھ تک اس علاقہ کا حکمراں ہوتا ہے، ہمارے زمانہ میں ہندوستان کا سب سے بڑا حکمراں یہی بلہرا ہے، ہندوستان کے اکثر راجہ اس سے تعلق رکھنے کے خواہشمند رہتے ہیں، اور جب اس کے قاصد ان کے یہاں جاتے ہیں تو وہ ان کو سجدہ کرتے ہیں۔

بلہرا کی مملکت سے ملی ہوئی ہندوستان کی بہت سی مملکتیں ہیں، بعض راجے ایسے ہیں جن کی مملکت میں صرف پہاڑ ہیں، کوئی سمندر نہیں ہے، جیسے راتے، کشمیر کا راجہ اور راجہ طافن وغیرہ بعض کے ملک میں خشکی وتری دونوں ہیں، بلہرا کی مملکت اور سمندر کے درمیان سندھی فرسنگ کے حساب سے ۸۰ فرسنگ کا فاصلہ ہے، سندھی فرسنگ آٹھ میل کا ہوتا ہے، اس کے یہاں بے شمار فوج اور ہاتھی ہیں، اس کی فوج کا بڑا حصہ پیدل ہے، کیونکہ اس کا ملک پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔

---

[1] الاعلاق النفیسہ ص ۱۳۵۔

بلہرا کے علاوہ سندھ اور ہندوستان کے راجوں میں کوئی بھی مسلمانوں کی تعظیم و تکریم نہیں کرتا لیکن اس کی مملکت میں اسلام معزز اور محفوظ ہے، مسلمانوں کی باقاعدہ مسجدیں ہیں اور جامع مسجدیں نمازیوں سے معمور رہتی ہیں، اس خاندان کا ایک ایک راجہ چالیس اور پچاس سال تک بلکہ اس سے بھی زیادہ حکمرانی کرتا ہے۔ اہل مملکت کا خیال ہے کہ ان کے راجوں کی عمر اس لیے لمبی ہوتی ہے کہ وہ عدل و انصاف اور مسلمانوں کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، یہ راجہ سرکاری خزانہ سے فوجیوں کو وظیفہ دیتا ہے جس طرح مسلمان اپنے فوجیوں کو بیت المال سے وظیفہ دیتے ہیں، اس کے یہاں طاطریہ نامی سکہ کا رواج ہے، جو وزن میں عام سکوں سے ڈیوڑھا ہوتا ہے، اس کے یہاں سنہ اور تاریخ کا رواج راجوں کی ابتدا سے ہوتا ہے[1]

راجہ جزر (گوجر) سلیمان تاجر کا بیان ہے کہ راجہ بلہرا کے آس پاس جو اس کے حریف راجے ہیں اور جن کے مقابلہ میں اس کو فتح ہوتی ہے ان میں سے ایک راجہ ہے، جسے جزر کہتے ہیں، اس کے پاس فوج بہت زیادہ ہے۔ اس کے جیسے گھوڑے کسی ہندوستانی راجہ کے پاس نہیں ہیں، وہ عربوں کا دشمن ہے (حالانکہ اسے بھی اقرار ہے کہ عرب کا بادشاہ (خلیفہ) سب سے بڑا بادشاہ ہے، ہندوستان کے راجوں میں اس سے بڑا کوئی بھی اسلام کا دشمن نہیں ہے، وہ زمین کے ایک ساحلی قطعہ پر حکمراں ہے، یہاں کے لوگوں میں دولت بہت زیادہ ہے، ان کے یہاں اونٹ اور مویشی بہت ہیں۔ یہ لوگ چاندی سے خالص سونا خریدتے ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے یہاں کانیں بھی ہیں، ہندوستان کی کوئی مملکت اس سے زیادہ چوری سے محفوظ نہیں ہے[2]

ابن خرداذبہ نے بلہرا کے بعد راجہ طافن، اس کے بعد راجہ جابہ کا نام لیا ہے اس کے بعد راجہ جزر کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ اس کے یہاں طاطریہ سکے چلتے ہیں[3]

[1] مروج الذہب ج ۱ ص ۱۷۰ [2] رحلۃ سلیمان التاجر [3] المسالک والممالک ص ۶۷

ابن رستہ نے الاعلاق النفیسہ میں لکھا ہے کہ ان راجوں سے متصل ایک راجہ ہے جسے جزر کہا جاتا ہے، عدل و انصاف اس کی مملکت میں پانی کی طرح بہتا ہے۔ اس کے انصاف کا حال یہ ہے کہ اگر بیچ راستہ میں سونا بھی پھینک دیا جائے تو اس کے اٹھا لینے کا ڈر نہیں ہے، اس راجہ کا ملک وسیع ہے، عرب تاجر جب اس کے ملک میں تجارت کے سلسلے میں جاتے ہیں تو وہ ان کے ساتھ بہت بہتر سلوک کرتا ہے، اور ان سے سامان خریدتا ہے، ان کے یہاں لین دین سونے کے ٹکڑوں اور طاطری سکوں سے ہوتا ہے، اس سکہ پر راجہ کی تصویر ہوتی ہے، اس کا وزن ایک مثقال کے برابر ہوتا ہے، عرب تاجر جب وہاں کے لوگوں سے سودا کرنے کے بعد راجہ سے کہتے ہیں کہ کسی ایسے آدمی کو ان کے ساتھ کر دیا جائے جو ان کو اور ان کے تجارتی سامان کو بحفاظت ملک کے باہر پہنچا دے تو راجہ ان سے کہتا ہے کہ میرے ملک میں چور نہیں ہیں، آپ لوگ تنہا جائیے، اگر مال پر کوئی آفت آئی تو اس کے تاوان کا میں ذمہ دار ہوں، راجہ جسم کے اعتبار سے بھی بھاری بھر کم ہے، اس کے اطراف میں کوئی راجہ اس سے زیادہ بہادر نہیں ہے، وہ لڑائی کے داؤں پیچ سے خوب واقف ہے، اور بلہرا، اور طافن اور رنجابہ (جابہ) کے راجوں سے برسر پیکار رہا کرتا ہے[1]

اس راجہ کے بارے میں سلیمان تاجر اور ابن رستہ کے بیان میں تضاد پایا جاتا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خاندان جزر کا راجہ سلیمان کے زمانہ میں اور تھا اور ابن رستہ کے زمانہ میں کوئی دوسرا تھا، مگر دونوں نے ان کو ان کے خاندانی لقب سے یاد کیا ہے۔

مسعودی نے راجہ جزر کے بارے میں لکھا ہے کہ بلہرا کے راجاؤں سے برسر پیکار رہتا ہے، اور اس کی مملکت کی ایک سمت دونوں میں برابر جھڑپ ہوتی رہتی ہے، اس راجہ کے یہاں گھوڑے، اونٹ، اور فوج بہت زیادہ ہے، اس کا خیال ہے کہ اقلیم بابل یعنی اقلیم ربع

---

[1] الاعلاق النفیسہ ص ۱۳۶۔

کے بادشاہ کے علاوہ اس سے بڑا کوئی بادشاہ نہیں ہے (غالباً اس سے مراد بغداد کا بادشاہ یعنی خلیفہ ہے)، یہ راجہ بڑا مغرور ہے اور دوسرے راجوں پر حملہ کرتا رہتا ہے مسلمانوں سے بھی بغض رکھتا ہے، اس کے پاس ہاتھی بہت زیادہ ہیں، اس کا ملک زمین کی ایک پٹی میں واقع ہے، اور اس میں سونے چاندی کی کانیں ہیں، یہاں کے لوگ ان ہی معادن سے لین دین کرتے ہیں[1]

مسعودی نے راجہ جزر کی مسلمانوں سے دشمنی کی کہانی مختصر بیان کی ہے، مگر اس کی نخوت وغرور کو اس نے بھی ذکر کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، یہ خاندان ہی نخوت پسند تھا اور اس کے اکثر حکمراں اس مرض میں مبتلا تھے۔

راجہ طافن (دکن) سلیمان تاجر کا بیان ہے کہ راجہ جزر کے ایک طرف راجہ طافن ہے، اس کی مملکت بہت چھوٹی ہے، یہاں کی عورتیں گوری اور ہندوستانی عورتوں میں سب سے زیادہ حسین ہوتی ہیں، یہ راجہ فوج کی کمی کی وجہ سے اپنے اطراف کے راجوں سے صلح و مصالحت کی پالیسی پر عمل کرتا ہے، یہ بھی عربوں سے اسی طرح شدید محبت کرتا ہے جس طرح راجہ بلہرا کرتا ہے[2]

ابن خرداذبہ نے بلہرا کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ اس کے بعد طافن کا راجہ ہے[3] اسی طرح ابن رستہ نے بلہرا کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ بلہرا سے متصل کئی راجے ہیں، ان میں سے ایک کو راجہ طافن کہتے ہیں، اس کی مملکت چھوٹی ہے، مگر اس کے یہاں مال زیادہ اور ملک آباد ہے، اس کی مملکت کے عوام صاف گندمی رنگ کے ہوتے ہیں، یہاں حسن و جمال عام ہے، اس کے اطراف وجوانب کا کوئی ملک حسن وخوبصورتی میں اس کا ہمسر نہیں ہے[4]

مسعودی نے لکھا ہے کہ راجہ جزر کے متصل راجہ طافن ہے، یہ اطراف وجوانب

---

[1] مروج الذہب [2] رحلۃ سلیمان التاجر [3] المسالک والممالک ص۶۷ [4] الاعلاق النفیسہ ص۱۳۵

کے راجوں سے صلح رکھتا ہے، اور مسلمانوں کی تعظیم و تکریم کرتا ہے، اس کی فوج مذکورۂ بالا راجوں کی افواج کی طرح نہیں ہے۔ یہاں کی عورتوں سے زیادہ حسین ہندوستان بھر میں عورتیں نہیں ہیں، ان کا حسن اور صباحت سب سے اعلیٰ ہے، ان میں بہت سی عورتیں خلوت کے لیے مشہور ہیں، اس لیے بحری سیاح اور مسافر و تاجر بڑے شوق سے ان کو خریدتے ہیں، ان کو "طافنیات" کہا جاتا ہے[1]

علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں۔

لفظ طافن کی اصلیت میں یورپین محققوں کا اختلاف ہے، یہ لفظ طافن کے بجائے طاقن بھی نسخوں میں ملا ہے، اس کو بعضوں نے موجودہ اورنگ آباد دکن کے قریب بتایا ہے، بعض اس کو کشمیر کے پاس لے گئے ہیں، لیکن میرے نزدیک یہ طاقن لفظ ہے اور یہ دکھن کی خرابی ہے"[2]

یقیناً یہ مہاراشٹر ہی کے کسی علاقہ کا راجہ تھا، ابن بطوطہ نے بھی اس اطراف کی عورتوں کے حسن و جمال اور ان کی خصوصیات کو اسی انداز میں بیان کیا ہے جس انداز میں مسعودی نے بیان کیا ہے۔

راجہ جابہ اور راجہ غابہ ان تین بڑے بڑے راجاؤں کے درمیان دو اور راجوں کا تذکرہ عرب مورخوں کی کتابوں میں ملتا ہے، لیکن وہ ان تینوں کے جیسے بلند مرتبہ نہیں تھے اس لیے ان کا تفصیلی حال نہیں ملتا، ان میں ایک جابہ ہے اور دوسرا غابہ، ابن خرداذبہ نے حکمراں خاندانوں کے القاب کے تذکرے میں بلہرا کے بعد جابہ، اس کے بعد طافن اس کے بعد جزر، اس کے بعد غابہ اور اس کے بعد رہمی کا نام لکھا ہے،[3] پھر آگے چل کر ملوکِ ہند کے تفصیلی بیان میں بلہرا کے بعد طافن، اس کے بعد جابہ، اس کے بعد جزر،

[1] مروج الذہب ج ا صـ۱۷۰ [2] ہند و عرب کے تعلقات صـ۲۹ [3] المسالک و الممالک صـ۱۶

اس کے بعد غابہ اور اس کے بعد ریمی کا ذکر کیا ہے[1]، اور ہندوستان کے ساحلی مقام بلین سے چین کے بحری سفر کی راہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے مسافروں کو چاہیئے کہ سرندیپ کو اپنے بائیں طرف کریں، اس صورت میں سرندیپ سے جزیرہ لنکبالوس دس سے پندرہ دن کی راہ ہے، وہاں سے جزیرہ کلہ تک چھ دن کا سفر ہے۔

وھی مملکۃ جابۃ الھند . اور کلہ جابہ ہند کی مملکت میں سے ہے،

ان میں رانگے کی کان ہے اور بانسوں کے جنگل ہیں، اس کے بائیں جانب جزیرہ مالوس دو دن کی راہ پر ہے، یہاں لوگ انسانوں کو کھا جاتے ہیں، یہاں بہترین کافور، کیلہ، نارجیل، گنا اور چاول ہوتا ہے؛

ومنھا الی جزیرۃ جابۃ ومثلا ھط اور کلہ سے جزیرہ جابہ، مثلا ہط اور ہرج دو دو وھی لج فرسخان وھی عظیمۃ فرسنگ پر واقع ہیں، یہ بہت بڑی مملکت ہے وملکھا یلبس حلیۃ الذھب و یہاں کا راجہ سونے کے زیورات اور سونے کی قلنسوۃ الذھب ویعبد البد دۃ۔ ٹوپی استعمال کرتا ہے اور بت پرست ہے۔

یہاں بھی نارجیل، کیلہ اور گنے کی پیداوار ہوتی ہے، اور مثلا ہط میں صندل، سنبل قرنفل کی پیداوار ہے اور جابہ میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر سو ہاتھ کے گھیرے میں ایک نیزے کے برابر آگ جلتی رہتی ہے جو دن میں دھواں اور رات میں آگ معلوم ہوتی ہے، اس کے بعد پندرہ دن کی مسافت پر عطر کی پیداوار کی جگہ آتی ہے اور جابہ اور سابط کے درمیان بہت قربت ہے[2]

اس بیان سے راجہ جابہ کے مقام کی تعیین کی شکل نکل سکتی ہے۔

ابن رستہ نے راجہ قمار (کماری) کے بعد اور دو ایک راجاؤں کا ذکر کیا ہے، چنانچہ ہاتھیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجھے خبر ملی ہے کہ بلاد اغباب (ایک نسخہ میں اعتاب

[1] المسالک والممالک ص۶۸ [2] المسالک والممالک ص۶۶

ہے) میں کچھ علاقے ہیں جن کو اورنسین (ایک نسخہ میں ورنشبین ہے)، کہتے ہیں یہاں ایک عورت حکمراں ہے، جس کا نام رابیہ ہے، اس کی مملکت میں ایک جگہ ہے جسے براز کہتے ہیں، اس رانی کے یہاں دس ہاتھ سے گیارہ ہاتھ تک قد کے ہاتھی ہوتے ہیں،[1]

ابن رستہ کے اس بیان میں ہوسکتا ہے کہ اغہاب غابہ ہو، اور براز بہار کا علاقہ ہو، اور یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اگر اسے تسلیم کرلیا جائے تو خاندان غابہ علاقہ براکا حکمراں تھا، جس میں گدی کی وراثت مردوں کی طرح عورتوں کو بھی ملتی تھی۔

اسی ابن رستہ نے طافن سے متصل ایک راجہ کا حال لکھا ہے کہ طافن کے بعد ایک راجہ ہے جس کو نجابہ (ایک نسخہ میں جابہ ہے)، کہتے ہیں، یہ اپنے ملک میں شریف مانا جاتا ہے، راجہ بلہرا یہاں کے راجگان کے یہاں شادی بیاہ کرتا ہے، اس خاندان کے راجہ سلوقی، ہوتے ہیں، اور عزت و شرافت کے خیال سے صرف اپنے ہی خاندان میں شادی بیاہ کرتے ہیں، اور جو سلوقی کہے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ وہ ان ہی دیس سے آتے ہیں۔ ان کے جنگلوں، جھاڑیوں اور شہروں میں صندل سرخ ہوتا ہے[2]

ہمارا خیال ہے کہ یہ نجابہ نہیں بلکہ جابہ صحیح ہے، اور مذکورہ بالا بیان راجگان جابہ ہی سے متعلق ہے، بلہرا کے خاندان کے ساتھ ان کی رشتہ داری سے خیال ہوتا ہے کہ یہ علاقہ گجرات کے آس پاس دکن میں کہیں تھا، مگر یہاں کے شہروں اور جنگلوں میں صندل سرخ کی پیداوار سے خیال ہوتا ہے کہ جنوبی سواحل کے آس پاس اس نام کا کوئی علاقہ تھا، بہت ممکن ہے کہ موجودہ علاقہ میسور جابہ کے نام سے مشہور رہا ہو، جہاں آج بھی صندل کی پیداوار تمام ہندوستان سے زیادہ ہوتی ہے۔

راجہ رہمی (بنگال) جیسا کہ پہلے ہم ابن خرداذبہ وغیرہ کے بیان سے بتا چکے ہیں، رہمی کسی خاص راجہ کا ذاتی نام نہیں ہے، بلکہ یہ حکمراں خاندان کا آبائی لقب ہے، جس سے

---

[1] الاعلاق النفیسہ ص ۱۳۳ [2] ایضاً ایضاً۔

اس کا ہر راجہ پکارا جاتا تھا، اور اس میں مرد، عورت کا فرق بھی نہیں تھا، چنانچہ ابن الفقیہ ہمدانی ۲۹۰ھ نے لکھا ہے:۔

وفی بلاد الھند مملکۃ یقال لھا رھمی علی ساحل البحر وملکتھم امرأۃ[۱]	ہندوستان میں ساحل سمندر پر ایک مملکت ہے جسے رہمی کہتے ہیں، اور اس پر ایک عورت حکومت کرتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری کے آخر میں رہمی لقب کی عورت یہاں کی حکمراں تھی۔

تمام قدماء نے رہمی بالراء کی تصریح کی ہے، سلیمان تاجر (ص ۳۷) ابن خرداذبہ (ص ٦٦ و ٦۷) ابن الفقیہ ہمدانی (ص ۱۵) اور مسعودی (ص) نے اس لفظ کو باربار اسی طرح لکھا ہے، اور ان کی کتابوں میں تکرار کے باوجود اس کے سوا کوئی اشارہ تک نہیں پایا جاتا، اس لیے ان قدیم و ثقہ مورخوں، سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں پر اعتماد کرکے اسے رہمی ہی سمجھنا چاہیے۔ باقی رہا قاضی رشید بن زبیر ۵٦۳ھ کی کتاب الذخائر والتحف میں صفحہ ۲۱، ۲۲ اور ۹، پر دہمی بالدال ہونا تو یہ قدماء کی تصریحات کے مقابلہ میں معتبر نہیں ہو سکتا، اور اسے نسخ و کتابت کی غلطی پر محمول کیا جائے گا۔

راجہ رہمی کا تذکرہ سلیمان تاجر نے ذاتی معلومات کی بناء پر تفصیل سے کیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

ویلی ھؤلاء ملک یقال لہ رھمی یقاتلہ ملک الجزر، ولیس لہ شرف فی الملک وھو ایضاً یقاتل بلھرا کما یقاتل ملک الجزر	ان راجوں سے متصل ایک راجہ ہے جسے رہمی کہتے ہیں، اس سے راجہ جزر برسرپیکار رہا کرتا ہے، ملک میں اس کی قدر و منزلت نہیں ہے، راجہ رہمی بھی راجہ بلھرا سے جنگ کرتا ہے جس طرح راجہ جزر سے جنگ

[۱] کتاب البلدان ص ۱۵۔

ورهمي هذا اكثر جيشًا من ملك
بلهرا، ومن ملك الجزر ومن
الطافن ويقال انه اذا خرج
الى القتال يخرج في نحو من خمسين
الف فيل ولا يخرج الا في الشتاء
لان الفيلة لا تصبر على العطش
فليس يسعه الا الخروج في الشتاء
ويقال ان قصارى عسكره نحو من
عشر الف الى خمس عشر الفا
وفي بلاده الثياب التي ليس
لاحد مثلها، يدخل الثوب منها
في حلقة خاتم دقة وحسنا
وهو من قطن، وقد رأينا
بعضها والذي ينفق في بلاده الودع
وهو عين البلاد يعني مالها وفي بلاده
الذهب والفضة والعود، والثياب
الصمر الذي يتخذ منه المداب و
في بلاده البشان المعلم وهو الكركدن[1]

کرتا ہے، اور یہ راجہ رہمی فوج کی کثرت میں بلہرا،
جزر، اور طافن سے بڑھا ہوا ہے، بیان کیا جاتا
ہے کہ جب یہ جنگ کے لیے نکلتا ہے تو تقریباً
پچاس ہزار ہاتھیوں کو لے کر نکلتا ہے اور صرف
جاڑے کے موسم میں نکلتا ہے، کیونکہ ہاتھی پیاس
کی شدت برداشت نہیں کر سکتا۔ اسلیے جاڑے
کے علاوہ دوسرے موسم میں جنگ کے لیے نکلنا
اس کے بس میں نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کم سے کم
اس کے پاس دس سے پندرہ ہزار تک فوج ہے،
اس کے ملک میں ایسے کپڑے ہوتے ہیں جن کی مثال
کہیں نہیں ملتی، جن کی باریکی اور نزاکت کا یہ حال ہے
کہ پورا تھان انگوٹھی کے حلقہ میں سما جاتا ہے، یہ
کپڑا روئی کا ہوتا ہے، ہم نے بچشم خود ایسے بعض کپڑے
دیکھے ہیں، اس کے ملک میں لین دین میں کوڑی کا
رواج بھی ہے یہی کوڑی اس ملک کی دولت ہے،
اور یہاں سونا، چاندی عود اور ایک خاص قسم کا
کپڑا ہوتا ہے جس سے مداب بنتا ہے، رہمی کے ملک
میں بشان معلم یعنی گینڈا ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ بشان نشان ہے، یا پھر ہندی کا لفظ پہچان ہے، جس کی تفسیر سلیمان تاجر نے المعلم (نشان) سے کرکے اس کا عربی نام کرکدن بتایا ہے، راجہ رہمی کے ملک میں

[1] رحلۃ سلیمان التاجر۔

لوگ گینڈے کو نشان کہتے تھے کیونکہ اس کی سینگ میں آدمی، مور، مچھلی اور دوسرے جانوروں کی شکلیں پائی جاتی تھیں، چنانچہ سلیمان تاجر اس کی شکل وصورت بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ بسا اوقات اس کی سینگ میں آدمی، طاؤس، مچھلی اور دوسرے حیوانات کی شکلیں ہوتی ہیں، چین کے لوگ اس کا پٹکا بناتے ہیں، اور چین کے شہروں میں اس کا ایک ایک پٹکا دو ہزار اور اس سے بھی زیادہ دینار میں بکتا ہے، اس کی شکل و صورت جس قدر حسین ہوتی ہے اسی قدر قیمت زیادہ ہوتی ہے۔

وھذا کلہ یشتری من بلاد دھمی بالودع وھو عین البلاد[1]	اور یہ چھلکے رہمی کے ملک سے کوڑی کے ذریعہ خریدے جاتے ہیں، یہ کوڑی اس ملک کی دولت اور سکہ ہے۔

ابن خرداذبہ نے راجہ رہمی کا ذکر ان الفاظ میں مختصر طور سے کیا ہے:۔

وبعدہ دھمی وبینہ وبین ھؤلاء مسیرۃ سنۃ، وذکروا ان لہ خمسین الف فیل ولہ الثیاب القطنیۃ المخملۃ والعود الھندی[2]	راجہ غابہ کے بعد راجہ رہمی ہے، رہمی اور ان راجوں کی مملکت کے درمیان ایک سال کی مسافت ہے، لوگوں کا بیان ہے کہ اس کے پاس پچاس ہزار ہاتھی ہیں، اور اس کے ملک میں سوتی مخملی کپڑوں کی اور عود ہندی کی پیداوار ہے۔

ابن خرداذبہ نے رہمی کے بعد راجہ قامرون (کامروپ) کا ذکر کیا ہے، اور بتایا ہے کہ اس کے ملک میں سونا بہت ہوتا ہے اور گینڈا پایا جاتا ہے، گینڈے کے ذکر میں تقریبًا وہی باتیں لکھی ہیں جن کو سلیمان تاجر نے راجہ رہمی کے بیان میں لکھا ہے۔

راجہ رہمی کے بارے میں یہ دونوں بیان تیسری صدی کے وسط سے تعلق رکھتے ہیں،

---

[1] رحلۃ سلیمان التاجر۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ سلیمان نے تین مرتبہ اس راجہ کا نام رہمی بالراء بتایا ہے۔ [2] المسالک والممالک ص۶۷

اس کے تقریباً ایک سو سال بعد مسعودی نے ۳۳۲ھ میں راجہ رہمی کا تذکرہ نہایت مختصر طور سے کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اس خاندان پر زوال آگیا تھا، اور اسے کوئی قابل ذکر حیثیت حاصل نہیں تھی، چنانچہ اس نے راجہ طافن کے بعد لکھا ہے:-

ثم یلی هذا الملك مملکة رهمی[1] | اس راجہ سے متصل رہمی کی مملکت ہے۔

اس میں نہ گینڈے کا ذکر ہے، نہ وہاں کے کپڑوں کا تذکرہ ہے اور نہ ہاتھیوں اور سونے چاندی کی کانوں کا بیان ہے۔

اس خاندان کے ایک راجہ نے خلیفہ مامون (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ) کے پاس ہدایا و تحائف اور خط روانہ کیا تھا، جس کے جواب میں مامون نے بھی اسے اپنی خوشنودی اور ہدایا و تحائف سے نوازا تھا۔ اس کی تفصیل قاضی رشید بن زبیر (۵۶۳ھ) نے اپنی کتاب الذخائر والتحف میں بیان کی ہے، جس سے اس راجہ کی شان و شوکت، مال و دولت، علم و فضل اور خلیفۂ اسلام سے اس کی محبت و الفت کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے خلیفہ مامون کے نام جو خط لکھا ہے، اس میں اپنا مفصل تعارف کرایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کا یہ راجہ مشرق کے مہاراجوں میں سب سے بڑا ہے، اس کا محل ایسی عمدہ اور نرم عود کی لکڑی سے بنا ہے جس پر مہر کرنے سے موم کی طرح نشان پڑ جاتا ہے اس کے خزانے میں اس کے آباد اجداد کے تاج رکھے ہوئے ہیں۔ یعنی یہ حکومت بہت قدیم ہے، جب اس کی سواری نکلتی ہے تو ہزاروں ہاتھیوں کا جلوس ہوتا ہے۔ اس کے اصطبل میں ایک ہزار صرف سفید ہاتھی ہیں، جن کی رسیاں وغیرہ سونے کی ہیں، وہ اپنی رعایا کے بارے میں اللہ سے بہت ڈرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ[2]۔

قاضی رشید بن زبیر نے راجہ رہمی کے ہدایا کی تفصیل یوں بیان کی ہے

---

[1] مروج الذہب ج ۱ ص ۱۷۱ [2] الذخائر والتحف ص ۳۲

وكانت الهدية جام ياقوت احمر
فتحه شبر في غلظ الاصبع مملوءً دررا،
وزن كل درة مثقال والعدة مائة درة
وفرشاً في جلد حية تكون في وادي المهراج
تبتلع الفيل، ووشي جيد هادارات
سود على قدر الدرهم وفي وسطها
نقط بيض مغروزة بالدرر لا يتخوف
من جلس عليها السل ومن كان
به السل وجلس عليها سبعة
ايام ذهب عنه، ومصليات ثلاثة
بوسائدها من ريش طائر يقال (٢٤)
له السمندل اذا طرحت في النار لم
تحترق وفرادزها درو ياقوت احمر
ووزن مائة الف مثقال عود رطبًا
اذا ختم عليه قبل الصورة وثلاثة
وثلاثين منّا كافوراً محببا، كل حبة
منه مثل الفستقة واكبر من اللوزة
مع جارية سندية طولها سبعة
اذرع تسحب شعرها حسنة البشرة
لها اربع ذوائب تعقد ضفيرتين
على راسها تاجا وضفيرتان

ہدیہ کی تفصیل یہ ہے، ایک جام یاقوت سرخ کا جس کی
چوڑائی ایک بالشت اور دبازت ایک انگل تھی،
موتیوں سے بھرا ہوا تھا، ہر موتی کا وزن ایک مثقال
تھا، ان موتیوں کی تعداد ایک سو تھی، ایک فرش
اژدہے کی کھال کا جو وادئ مہراج میں پایا جاتا ہے،
یہ اژدہا اتنا بڑا ہوتا ہے کہ ہاتھی کو نگل جاتا ہے
کارچوبی کپڑے اس میں درہم کے برابر کالی بوٹیاں
تھیں، ان کے بیچ میں سفید مینا تھا، اور موتیوں کے
کام سے تیار ہوا تھا، اژدہے کی کھال کی خاصیت
یہ تھی کہ جو اس پر بیٹھتا سل کی بیماری سے محفوظ
رہتا، اگر سل کا مریض سات دن تک اس پر بیٹھتا
تو مرض جاتا رہتا، تین مصلے مع گاؤتکیہ کے جو
سمندل نامی پرند کے پر سے بنے ہوئے تھے، اس پر
کی خاصیت یہ ہے کہ آگ میں ڈالنے سے نہیں
جلتا، ان کی جھالر اور کنارے موتی اور یاقوت
سرخ کے تھے، اور ایک ہزار سیر تازہ عود جس پر
مہر کرنے سے نشان پڑ جاتا تھا۔ تینتیس سیر کافور
کی ڈلیاں، ہر ڈلی بادام سے بڑی تھی، ایک سندی
باندی، جس کا قد سات فٹ تھا، بال اتنے لمبے
تھے کہ چلنے میں زمین پر لوٹتے تھے۔ نہایت
حسین وجمیل تھی سر میں چار چوٹیاں تھیں، جن میں

لتبلغان الارض من خلفها وطول كل شفر من اشفار عينها اصبع، يبلغ اذا اطرقت الى نصف خدها، وكان بين شفتيها لمعان البرق من بياض اسنانها، لها نهدان وثماني عكن، وكان الكتاب فى لحاء شجرة تنبت بالهند يقال لها الكاذى[1] الخ	دُو کو اپنے سر پر تاج کی طرح لپیٹ لیتی تھی، اور دو چوٹیاں زمین پر لٹکتی تھیں، پلکیں ایک انگل لمبی تھیں، جب سر جھکاتی تو پلکیں نصف رخسار تک آجاتیں، دانتوں کی چمک سے دونوں ہونٹوں کے درمیان بجلی چمکتی معلوم ہوتی، فربہی سے اس کے شکم میں آٹھ سلوٹیں پڑتی تھیں، اس ہدیہ کے ساتھ جو خط تھا وہ ایک درخت کی چھال پر تحریر تھا، جو ہندوستان میں ہوتا ہے، اسے کاذی کہتے ہیں۔

ہمارے خیال میں اس عبارت میں وفرشا فی جلد حیة کے بجائے وفرشا من جلد حیة ہونا چاہیے، اور اس جملہ میں عبارت خلط ملط ہوگئی ہے، اور تبتلع الفیل کے بعد لایخوف من جلس علیها ہونا چاہیے، درمیان میں ووشی سے مغروزة بالدر تک عبارت بعد میں آنی چاہیے، ورنہ مطلب بالکل بے جوڑ ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں مسعودی نے اخبار الزمان میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کی دلیل بن سکتا ہے وہ بحر ہرکند (جنوبی ہند کا سمندر) کے جزائر کا تذکرہ کرتے ہوئے اس سانپ اور اس چمڑے کی خاصیت کو یوں بیان کرتے ہیں:۔

وفيه حية يقال الملكة لا تظهر الا مرة واحدة وربما احتال فيها ملوك الزنج فاخذوها وتطبخ حتى يخرج	اس میں ملکہ نامی ایک قسم کا اژدہا پایا جاتا ہے جو صرف ایک مرتبہ ظاہر ہوتا ہے، زنج کے راجہ اسے حکمت عملی سے حاصل کرتے ہیں، اسے پکایا جاتا ہے، اور اس کی چربی سے راجہ کے مالش کی جاتی ہے، جس

[1] الذخائر والتحف ص۲۴ و ۲۵۔

ود کھاویں ھن بہ الملك فتزید فی قوتہ و نشاطہ ویستعمل من جلود ھذہ الحیۃ وھی منمرۃ فرش اذا جلس علیھا صاحب السل ذھب عنہ السل ومن جلس علیہ امن السل ان یصیبہ ابداً[1]

سے اس کی قوت اور امنگ میں اضافہ ہوتا ہے، اور اس سانپ کی کھال چیتے کی کھال کی طرح ہوتی ہے اس کا فرش بنایا جاتا ہے، جب اس پر سل کا مریض بیٹھتا ہے تو اس کی بیماری ختم ہو جاتی ہے۔ اور جب تندرست آدمی اس پر بیٹھتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اس مرض سے مامون ہوتا ہے۔

خلیفہ مامون نے بھی راجہ رہمی کے اس خط اور ہدیہ کے جواب میں خط اور ہدیہ بھیجا، اور چونکہ اس راجہ کے ملک میں نہایت اعلیٰ قسم کی کپڑے ہوتے تھے، اس لیے مامون نے بھی اپنے ہدیہ میں خاص طور سے طرح طرح کے عمدہ کپڑے بھیجے۔

قاضی رشید بن زبیر نے خلیفہ کے ہدایا کی فہرست میں کپڑوں کی یہ تفصیل لکھی ہے:۔

وخمسۃ اصناف من الکسوۃ من کل صنف مائۃ ثوب من بیاض مصر، وخز السوس ووشی الیمن، والاسکندریۃ وملحم خراسان، ودیباج خراسانی وفرش قرمز، وفرش طبری وفرش سوسنجری، ومائۃ طنفسۃ حریریۃ بوسائدھا کل ذٰلك خز، وفرش خز سوسی الخ[2]

کپڑے پانچ اقسام کے تھے اور ہر قسم کے سو سو کپڑے ان کی تفصیل یہ ہے۔ مصر کا سفید کپڑا (لٹھا)، سوس کا ریشمی کپڑا، یمن اور اسکندریہ کی چھینٹ، خراسان کا ملحم، دیبا خراسانی، فرش قرمزی، فرش طبری، فرش سوسنجری، ان کے علاوہ ایک سو گدے مع تکیوں کے یہ سب چیزیں ریشم کی بنی ہوئی تھیں، اور سوسی ریشم کا فرش۔

بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ راجگانِ رہمی قدیم زمانہ سے غیر ملکی بادشاہوں

---

[1] اخبار الزمان ص۲۲ [2] الذخائر والتحف ص۲۷۔

سے تعلقات رکھتے تھے اور اپنے زمانہ کے بڑے بڑے حکمرانوں کے پاس تحائف و ہدایا بھیجنے میں اپنی ایک خاص روایت کے پابند تھے، چنانچہ قاضی رشید بن زبیر ہی نے اپنی کتاب کے شروع میں هدیة ملك الهند ایضاً کے ذیل میں کسریٰ کے پاس ایک ہندی راجہ کے ہدایا کا ذکر کیا ہے، اور ان کی تفصیل میں تقریباً وہی چیزیں لکھی ہیں جو راجہ رہمی نے مامون کو بھیجی تھیں، جیسا کہ عبارت ذیل سے ظاہر ہوتا ہے:۔

هدیة ملك الهند ایضاً واهدی الیه الف مناً من العود الهندی یذوب فی النار کالشمع ویختم علیه فتتبین الکتابة، وجام یاقوت احمر فتحه شبر فی شبر مملوءاً دراً، وعشرة امنان کافور کالفستق واکبر وجاریة طولها سبعة اذرع، تضرب اشفار عینیها خدیها وکان یتبین لمعان البرق من بیاض مبسمها، مقرونة الحواجب لها ضفائر شعر تجرّها، وفرشا من جلود الحیات الین من الحریر واحسن من الوشی وکتابه کان بالدر والذهب[1]

کسریٰ کے پاس ہندوستان کے راجہ کا ہدیہ، اس نے کسریٰ کے پاس یہ چیزیں ہدیہ میں بھیجیں ایک ہزار سیر عود ہندی جو آگ میں موم کی طرح پگھل جاتی ہے اور اس پر مہر لگانے سے اس کے حروف ظاہر ہو جاتے ہیں، یاقوت سرخ کا ایک جام جس کے دہانے کا قطر ایک بالشت تھا، یہ موتیوں سے بھرا ہوا تھا، اور دس سیر کافور پستہ کے مانند اور اس سے بھی بڑا، ایک باندی جس کا قد سات ہاتھ تھا، اس کی پلکیں اس کے رخسار پر آتی جاتی تھیں، اس کے دانت کی سفیدی سے بجلی کی سی چمک پیدا ہوتی تھی، بھویں ملی ہوئی تھیں، بالوں کی چوٹیوں کو گھسیٹتی ہوئی چلتی تھی، سانپوں کی کھال کا ایک فرش جو ریشم سے زیادہ نرم اور چھینٹ سے زیادہ خوبصورت تھا، اس ہدیہ کے ساتھ جو خط تھا اس کی کتابت زرد جواہر سے کی ہوئی کاذی نامی درخت

[1] الذخائر والتحف ص ۴ و ۵۔

فی لحاء شجر الکاذی۔	کی چھال پر تھی۔

اس میں صرف ملک الھند کا لفظ ہے، راجہ رہمی کے نام کی تصریح نہیں ہے، مگر چونکہ اس میں عود، جام، کافور، باندی، سانپ کا فرش، کپڑا، اور خط کے کاغذ کا ذکر بعینہ وہی ہے جو نامون کے ہدیہ میں بیان کیا گیا ہے، اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ کسریٰ کے دربار میں یہ ہدایا رہمی خاندان کے کسی راجہ کے یہاں سے گئے ہوں گے، اور معاصر سلاطین کے پاس ہدیہ بھیجنا اس خاندان کے دستور میں شامل رہا ہوگا۔

راجگانِ رہمی کا ملک راجہ رہمی کے بارے میں سلیمان تاجر، ابن خرداذبہ، ابن الفقیہ ہمدانی، مسعودی، قاضی رشید بن زبیر کے جو تفصیلی بیانات صفحاتِ بالا میں درج کیے گئے ہیں، ان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا ملک ہندوستان کے مشرق میں تھا، اس کے بعد مشرق میں مہراج کا ملک تھا، جہاں سے ہندوستان کی سرحد ختم ہو جاتی تھی، اور چین کی سرحد شروع ہوتی تھی۔

سلیمان تاجر مغربی جنوبی ہندوستان کے راجگان بلہرا، جزر اور طافن کا ذکر کر کے لکھتا ہے:۔

ویلی ھؤلاء ملك یقال له رھمی[1]	اور ان سے متصل ایک راجہ ہے جسے رہمی کہا جاتا ہے۔

ابن خرداذبہ بھی اسی طرح ان راجوں کا ذکر کر کے راجہ غابہ کے بعد راجہ رہمی کا ذکر کرتا اور مشرق کی طرف اس کی مسافت ایک سال کی راہ بتاتا ہے۔

وبعد ہٰذا رھمی، وبینه وبین ھؤلاء مسیرة سنة[2]	غابہ کے بعد راجہ رہمی ہے۔ اس میں اور ان راجوں کے درمیان ایک سال کی راہ کا فاصلہ ہے۔

---

[1] رحلتہ سلیمان التاجر [2] المسالک والممالک ص ۶۷۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رہمی کا ملک ہندوستان کے انتہائی مشرقی حصہ میں واقع تھا؛

ابن الفقیہ ہمدانی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمندر کے کنارے تھا، اور وبائی امراض اس کثرت سے ہوتے تھے کہ لوگ وہاں جانا پسند نہیں کرتے تھے، مگر یہ ملک اس قدر خوشحال اور دولتمند تھا کہ مختلف ملکوں کے تاجر اور سوداگر یہاں برابر آتے جاتے تھے، وہ لکھتا ہے:۔

وفی بلاد الھند مملکۃ یقال لھا رھمی علی ساحل البحر و ملکتھا امرأۃ وبلادھا وبیۃ ومن دخل الیھا من سائر الھند مات فالتجار یدخلون لکثرۃ ارباحھا[1]	بلاد ہند میں ایک مملکت ہے جسے رہمی کہا جاتا ہے، یہ ساحل سمندر پر واقع ہے اور یہاں پر ایک عورت حکومت کرتی ہے، اس کا ملک وبائی امراض کا علاقہ ہے، پورے ہندوستان سے جو شخص یہاں جاتا ہے اس بیماری کی وجہ سے مر جاتا ہے مگر سوداگر یہاں کے کثیر منافع کی وجہ سے جاتے ہیں۔

ابن بطوطہ نے بنگال کے بیان میں اسی طرح وہاں کے وبائی امراض کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہاں کی بیماری اور رفاہیت دو متضاد باتوں کی وجہ سے بنگال دوزخ بہشت کہا جاتا ہے۔

خود راجہ رہمی نے خلیفہ مامون کے نام جو خط لکھا ہے اس میں سب سے پہلے اپنا تعارف مشرقی ہندوستان کے عظیم الشان حکمراں کے لفظ سے کرایا ہے:۔

من دھمی (رھمی)، ملك الھند و	ہندوستان کے راجہ اور مشرق کے

[1] کتاب البلدان ص ۱۵۔

حکمرانوں میں عظیم حکمراں رہمی کی طرف ۔	وعظیم ارکان المشرق[1]

خلیفہ مامون نے اس کے جواب میں جو خط بھیجا تھا اس میں بھی اس نے راجہ رہمی کو مشرق کا مہاراجہ ظاہر کر کے اس کی اس حیثیت کا اعتراف کیا ہے ۔

ہندوستان کے راجہ رہمی کے نام جو اپنے ماتحت راجوں اور مشرق کے حکمرانوں میں سب سے بڑا ہے ۔	الی دھمی (رھمی) ملك الھند و عظیم من تحت یدہ من اداکنۃ الھند، وارکان المشرق[2] ۔

ان شہادتوں کے بعد راجہ رہمی کی مملکت کی جائے وقوع کسی طرح مشتبہ نہیں رہ جاتی اور یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ ملک بلہرا، جزر، اور طافن وغیرہ کے علاقوں اور مغربی جنوبی ہندوستان سے بڑی طویل مسافت کی دوری پر مشرق میں سمندر سے ملحق تھا، اور آب وہوا کے مرطوب ہونے کی وجہ سے وہاں طرح طرح کے وبائی امراض تھے، یہ تمام باتیں ہندوستان میں بنگال ہی پر صادق آتی ہیں، پھر سوت کے باریک اور مخملی کپڑے جن کی عینی شہادت سلیمان تاجر نے دی ہے اور جن کا تذکرہ ابن خرداذبہ نے بھی کیا ہے، اور راجہ نے ان کی بہترین قسمیں خلیفہ مامون کے پاس بھیجیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہی کپڑے ہیں جن کی کہانی ڈھاکہ کے ململ پر ختم ہوتی ہے' اور قدیم زمانہ سے بنگال کی بہترین صنعت میں ان کا شمار ہوتا ہے' ۔

اس کے علاوہ کوڑی، گینڈا، ہاتھی، سونا، چاندی، عود کافور وغیرہ کا تعلق ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں بنگال میں زیادہ ہے' اور یہ چیزیں بنگال کی خاص پیداوار ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ راجگانِ رہمی جن کے ملک میں یہ چیزیں ہوتی تھیں وہ بنگال ہی کے حکمراں تھے ۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے سلیمان تاجر کے بیان پر راجہ رہمی کے بارے میں رائے

---

[1] الذخائر والتحف ص ۲۲ ۔ [2] الذخائر والتحف ص ۲۶ ۔

ظاہر کی ہے کہ کپڑوں کی تعریف کی بنا پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ ڈھاکہ کے قریب کسی راما نام راجہ کی حکومت تھی[1]

راجگانِ رہمی کی مملکت کی حدود کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سلیمان تاجر نے اس کے بعد کاشبین نامی ایک راجہ کا تذکرہ کیا ہے، جو ملک کے اندرونی علاقہ میں واقع ہے، مگر اس کا تعلق سمندر سے بھی ہے، یہاں کے لوگ گورے اور خوبصورت ہوتے ہیں، اور اس میں میدان اور پہاڑ دونوں واقع ہیں۔

و بعدہ ملك داخل له بحر يقال له ملك الكاشبين و هو قوم بيض مخزموا الآذان، و لهم جمال، وهم اصحاب بدو وجبال[2]	رہمی کے بعد اندرونی علاقہ میں ایک راجہ ہے جو سمندر کا بھی مالک ہے، اسے راجہ کاشبین کہتے ہیں، یہاں کے لوگ گورے ہیں، ان کے کان چھدے ہوتے ہیں، ان میں حسن و جمال ہے، یہ لوگ میدانوں اور پہاڑوں میں رہتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہ ارکان یا برما کے آس پاس کا علاقہ ہو، ابن خرداذبہ نے راجہ جابہ کے بعد رہمی کا ملک بتایا ہے، اور اس کے بعد جزائر زابج کے راجہ مہراج کا ذکر کیا ہے،[3] اور سلیمان تاجر نے جنوبی ہند کے ساحلی شہر کلاہ بار کو مملکت زابج میں شمار کیا ہے، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، ابن الفقیہ ہمدانی نے بھی راجہ رہمی کے بعد مہراج کی مملکت بلاد زابج کا ذکر کیا ہے۔ یہ مہراج بحر گند کے بے شمار جزائر کا حکمراں تھا، اور اس کی مملکت میں دولت و ثروت کی بڑی فراوانی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی تحقیقات اور ان پر ہماری معروضات	محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب

[1] ہند و عرب کے تعلقات ص۲۸ [2] رحلۃ سلیمان التاجر [3] المسالک والممالک ص۶۰

(بیرس) نے کتاب الذخائر والتحف کی تحقیق وتعلیق کے سلسلے میں راجہ رہمی کے ذکر کے موقع پر یہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے:۔

واما دھمی (رھمی) ملك الھند فلم یتحقق الی الآن مسماہ، فیقال ھو ملك بنغال (شرقی پاکستان) اشار الیہ سلیمان التاجر والمسعودی وابن خرداذبہ وغیرھم۔	ہندوستان کے راجہ رہمی کے بارے میں اب تک اس کی شخصیت کی تحقیق نہیں ہو سکی، ایک قول کی رو سے وہ بنگال (مشرقی پاکستان) کا راجہ ہے، سلیمان تاجر، مسعودی اور ابن خرداذبہ وغیرہ نے اسی طرف اشارہ کیا۔

ان قدیم سیاحوں اور مورخوں کی تصریح کے ساتھ الذخائر والتحف میں راجہ رہمی نے اپنا لقب عظیم ارکان المشرق کے لقب سے کرایا ہے، اور خلیفہ مامون نے بھی جواب میں عظیم من تحت یدہ من اراکنۃ الھند وارکان المشرق سے خطاب کر کے اس کا اعتراف کیا ہے، یہ دلائل راجہ رہمی کی مملکت کی تعیین کے لیے کافی ہے۔

مگر ڈاکٹر صاحب نے یہ دیکھ کر کہ رہمی نے مامون کے پاس وادی مہراج کے سانپ کے چمڑے کا فرش ہدیہ میں بھیجا تو ان کو شبہ ہو گیا کہ وہ کہیں جزائر زانج کی مملکت کا راجہ نہ ہو، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

ویقال ھو ملك سماترا (اندونیسیا) ویوئیدہ ذکر حیۃ وادی المھراج۔	ایک قول ہے کہ وہ سماترا (انڈونیشیا) کا راجہ ہے، اس قول کی تائید وادی مہراج کے سانپ کے ذکر سے ہوتی ہے۔

حالانکہ مذکورہ بالا تصریحات کے بعد اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ راجہ رہمی نے جس عجیب وغریب فرش کو مامون کے پاس بھیجا تھا وہ اس کی مملکت سے متصل کسی بڑی مملکت کی پیداوار رہا ہو اور اسے وہاں کے راجہ مہراج سے حاصل کیا ہو۔

وفرشانی (من) جلد حیۃ تکون	اور ایسے سانپ کی کھال کا فرش جو وادی مہراج

فی وادی المهراج	میں ہوتا ہے۔

سے رہمی کا وادی مہراج کا راجہ ہونا ثابت نہیں ہوتا، پھر مہراج سماترا اور انڈونیشیا کا حکمراں نہیں تھا، بلکہ وہ بحر ہرکند (جنوبی ہند) میں بہت سے جزائر کا راجہ تھا، جس کی ایک سرحد جنوبی ہند کے ساحلی شہر کلاہ بار سے ملی ہوئی تھی، اور یہ شہر اس کی مملکت میں شامل تھا، جیسا کہ سلیمان تاجر کی تصریح اوپر گذر چکی ہے، نیز ڈاکٹر صاحب نے رہمی کے سندھ کا حکمراں ہونے کا بھی احتمال ظاہر فرمایا ہے، چنانچہ آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

ویقال هو ملك السند لانه اهدی جاریة سندیة والسند اقرب الی البصرة من بنغال وسماترا[1]	ایک قول ہے کہ یہ سندھ کا راجہ ہے، کیونکہ اس نے مامون کے پاس سندھی باندی بھیجی تھی اور سندھ بنگال اور سماٹرا کے مقابلہ میں بصرہ سے زیادہ قریب ہے۔

رہمی کے مشرقی ہندوستان کا حکمراں ہونے کی صاف و صریح دلائل کے باوجود ایک بہت ہی معمولی احتمال پر اسے سندھ کا راجہ بتانا اور محض سماٹرا کے مقابلہ میں بصرہ سے سندھ کی قربت کی بنا پر اس کو راجح قرار دینا عجیب سی بات ہے، جبکہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں چین تک سے تعلقات کی شہادتیں موجود ہیں، اور کتاب الذخائر والتحف میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے چین کے بادشاہ کی خط و کتابت کا ذکر موجود ہے[2] زیادہ سے زیادہ وادی مہراج کے سانپوں کی طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ رہمی نے عربوں کے جمالیاتی ذوق کا لحاظ کر کے مامون کے ہدایا میں ایک حسین و جمیل سندھی باندی بھیجی تھی، گو ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ جاریہ سندھی نہیں تھی، جس کی شہادت خود اس لونڈی کے اوصاف سے ملتی ہے۔ اور یہ بیان:

تسحب شعرها حسنة البشرة	یہ باندی اپنے بالوں کو گھسیٹتی ہوئی چلتی تھی۔

---

[1] حاشیہ کتاب الذخائر والتحف ص۲۱ [2] کتاب الذخائر والتحف ص۹

لها اربع ضفائر تعقد ضفیرتین علی راسها تاجا وضفیرتان تبلغان الارض من خلفها[1]	بڑی حسین تھی اس کے چار چوٹیاں تھیں، ان میں سے دو کو اپنے سر پر تاج کی طرح لپیٹ لیتی تھی اور دو اس کے پیچھے زمین تک لٹکتی تھیں،

زلف بنگال پر زیادہ صادق آتا ہے، سندھی عورتوں کے یہ اوصاف نہیں ہوتے، یہ ضرور ہے کہ عرب سندھی باندیوں اور عورتوں کی بڑی تعریف کرتے تھے، اور ان سے ان کو بڑی دلچسپی تھی،

جاحظ نے کتاب الحیوان میں سندھیوں کی خصوصیات بیان کر کے لکھا ہے:۔

وکذلک بنات السند	اسی طرح سندھ کی عورتیں بھی امتیازی اوصاف رکھتی ہیں۔

اسی طرح احمد امین نے ضحی الاسلام میں ہندوستانی عورتوں کی طرف عربوں کے میلان اور ان کی خصوصیت کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

واشتهرت السندیات بالخصر والشعر الطویل[2]	اور سندھی عورتیں نازک کمر اور لمبے بال میں مشہور ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ قاضی رشید بن زبیر نے عربوں کے عام ذوق و میلان کی مناسبت سے جاریہ سندیہ لکھ دیا ہے، یا اتفاقی طور سے یہ لفظ نکل گیا ہے جیسا کہ تاریخ و رجال کی کتابوں میں بعض جگہ ہندی کو سندھی اور سندھی کو ہندی لکھا ہوا ملتا ہے یا پھر کتابت کی غلطی ہے، نیز الذخائر والتحف سے ہم نے ایک اور ہدیہ کا ذکر کیا ہے جسے ہندوستان کے ایک راجہ نے کسریٰ کے پاس بھیجا تھا، اور اس میں بھی وہی تمام چیزیں اور باتیں ہیں جو راجہ رہمی کی طرف سے مامون کے ہدیہ میں ہیں، مگر اس میں صرف جاریہ کا لفظ ہے، اور سندیہ یا ہندیہ کی کوئی قید نہیں ہے، محترم ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلہ میں ابن خردادبہ، ابن الفقیہ، اور مستشرق مینو اسکی کا

---

[1] الذخائر والتحف ص ۲۵ [2] ضحی الاسلام ج ا ص ۸۶۔

نام بھی لیا ہے۔ اور مصری عالم مرحوم احمد تیمور پاشا کے ایک مقالہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں پاکستان کی ہسٹری کانفرنس میں ایک فاضل نے راجہ رہمی پر ایک مقالہ پڑھا تھا۔

ان میں ابن خرداذبہ اور ابن الفقیہ وغیرہ کی تصریحات ہمارے پیش نظر ہیں۔ البتہ دوسرے مقالات کی خبر نہیں کہ ان میں راجہ رہمی کے بارہ میں کیا تحقیق کی گئی ہے۔

مہراج جنوبی ہند کے جزائر کا راجہ | راجہ رہمی کے تذکرہ میں مہراج کا ذکر بار بار آیا ہے، جو مشرقی ہندوستان کا آخری سب سے بڑا راجہ تھا اور جس کا ذکر ہمارے مورخ و سیاح اور جغرافیہ نویس کرتے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تتمہ کے طور پر اس کا بھی کچھ حال بیان کر دیا جائے۔

راجہ رہمی کے بعد ہندوستان کے مشرقی سمندر میں واقع جزائر کے راجہ کا لقب مہراج ہوا کرتا تھا، جیسا کہ ابن خرداذبہ نے لکھا ہے:۔

ملك جزائر البحر المشرقي المهراج | بحر مشرقی کے جزائر کا راجہ مہراج ہے۔

اور اس کی مملکت کا نام زانج تھا[1] ابن خرداذبہ ہی کا بیان ہے۔

وملك الزابج يسمى المهراج | زانج کا راجہ مہراج کہلاتا ہے۔

اس کے زیر تصرف جزائر میں بڑے بڑے[2] عجائبات تھے، برطائیل نامی جزیرہ میں رات بھر گانے بجانے کی آواز سنائی دیتی تھی، اس مملکت میں سمندر سے ایسے گھوڑے نکلتے تھے جن کی ایال اتنی لمبی ہوتی تھی کہ اس کو زمین پر گھسیٹتے چلتے تھے، مہراج کی روزانہ کی آمدنی دو سو سیر سونا ہوتی تھی، جس کی اینٹیں بنا کر وہ سمندر میں ڈال دیتا اور کہتا تھا کہ یہی میرا بیت المال ہے، ایک جزیرہ میں گدھے کے برابر بندر ہوتے تھے، یہاں مرغ کی پالی سے اتنی جوئے بازی ہوتی تھی کہ صرف اس سے راجہ کی آمدنی میں پچاسوں سیر سونا آتا تھا[3]

سلیمان تاجر کا بیان اوپر گذر چکا ہے کہ چین کے بحری راستہ میں کلاہ بار دکلہ بار) آتا ہے

[1] المسالک والممالک ص۱۷ [2] المسالک والممالک ص۶۸ [3] المسالک والممالک ص۲۲

وهی مملكة الزابج متياسِنة عن بلاد الهند يجمعهم ملك

یہ زابج کی مملکت ہے جو ہندوستان کے دائیں جانب ہے، اس کے تمام جزائر پر ایک راجہ حکمراں ہے۔

یہاں کے لوگوں کا لباس تہبند (فوطہ) ہے، چھوٹے بڑے ہر طبقہ کے لوگ صرف ایک تہبند باندھتے ہیں، میٹھے کنوؤں سے پانی پیتے ہیں، چشمے اور برسات کے پانی پر کنوؤں کے پانی کو ترجیح دیتے ہیں۔

ومسافة بين كولم ملی وهی قريبة من هر كند الی كله بار شهر[1]۔

کولم ملی (ٹراونکور) جو کہ سمندر کے قریب ہے، اسکے اور کلہ بار کے درمیان ایک ماہ کی مسافت ہے۔

علامہ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے:۔

وملكهم متصل بملك الزابج وهی دار المملكة المهراج ملك الجزائر وهذه المملكة بين مملكة الهند والصين[2]۔

راجگان ہند کا ملک راجہ زابج سے ملا ہوا ہے۔ زابج مہراج کی مملکت کا دارالسلطنت ہے، یہ راجہ جزیروں کا حکمراں ہے اور مملکت زابج ہندوستان اور چین کے درمیان واقع ہے۔

کتاب التنبیہ والاشراف میں بحر خزر کی اندرونی پہاڑیوں اور ٹیلوں کے ذکر میں لکھا ہے:

وكالاطمة العظيمة التی فی مملكة المهراج ملك جزائر الزابج وغيرها فی البحر الصينی منها كلہ وسربزة[3]

اور جیسے وہ بڑے بڑے سمندری ٹیلے جو مہراج کی مملکت میں واقع ہیں، مہراج زابج کے جزیروں کا راجہ ہے، اور بحر چین میں ایسے ٹیلے ہیں اور کلہ اور سربزہ میں بھی۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ مہراج وہاں کے ہر راجہ کا علامتی نام ہے، اس کا ملک اتنا بڑا ہے کہ اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کی فوجوں کا شمار کیا جاسکتا ہے، اس کے تمام جزیرے

---

[1] رحلۃ سلیمان تاجر [2] مروج الذہب ج ۱ ص ۸۲ [3] التنبیہ والاشراف ص ۵۴